انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اهتدیتم
طلوع اسلام
طلوع اسلام
یادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا

ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

دورِ جدید

مرتّب
اخوند زادہ حسین امام

بدلِ اشتراک
پانچ روپیہ سالانہ
ششماہی تین روپے
فی پرچہ آٹھ آنے

جلد (۴) شمارہ (۳)

صفر المظفر ۱۳۶۰ھ مطابق مارچ ۱۹۴۱ء

فہرست مضامین

اسلام اور سائنس

(جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز کی ایک تقریر)

برادران عزیز! جیسا کہ آپ کو اس جلسہ کے پروگرام سے معلوم ہو گیا ہو گا۔ مجھے جس موضوع پر آپ کی خدمت میں کچھ عرض کرنا ہے۔ اس کا عنوان ہے "اسلام اور سائنس"۔ سائنس سے یہاں مراد علم کیمیا اور طبیعیات Chemistry & Physics ہی نہیں جن کی طرف اس لفظ کے اطلاق سے۔ بالعموم ذہن منتقل ہو جایا کرتا ہے۔ بلکہ یہ لفظ اپنی جامعیت کے اعتبار سے تمام ان علوم و فنون پر حاوی ہے جن کا تعلق مشاہدات حسی و عقلی سے ہے۔ خواہ وہ جمادیات سے متعلق ہوں یا نباتات سے، عالم حیوانات سے ان کا علاقہ ہو یا خود نفس انسانی سے۔ اس کرۂ عناصر کے خواص و طبائع کا تجزیہ کریں یا پھر کارزین رانکوساختہ اجرام فلکی کے متعلق معلومات بہم پہونچائیں، یہ علوم اور ان علوم کے تمام شعبے سائنس ہی کہلائیں گے۔ پھر اسلام اور علوم دنیوی کے عنوان پر عام طور پر جو کچھ کہا یا لکھا جاتا ہے اس سے مقصد صرف اس قدر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے درخشندہ عہد ترقی کے چند خوشگوار مناظر سامنے لاکر ینظر فریب اطمینان دلا دیا جائے کہ خیر اگر آج اور قومیں تحصیل علوم و فنون میں ترقی کر رہی ہیں تو کبھی تم بھی اس میدان کے مرد رہ چکے ہو۔ یہ داستان سنائی جائے اور اس کے خواب آور اثر سے قوم کو تھپک تھپک کر سلا دیا جائے۔ اگرچہ میں بھی کچھ ایسی ہی تفصیلات پیش کروں گا جو عام طور پر کہی جاتی ہیں۔ اور مجھے بھی کچھ ایسے ہی سحر کار مناظر سامنے لانے ہوں گے جو تاریخ کے اوراق پر درخشندہ موتیوں کی طرح بکھرے پڑے ہیں لیکن میں ان کیفیات و مناظر کو کسی اور زاویہ سے دکھانا چاہتا ہوں اور میرے نتائج مستخرجہ افسوں خواب آور ہونے کی بجائے اہل بصیرت کے لئے عبرت و موعظت کے ہزار سامان اپنے اندر رکھیں گے۔

وَمَا تَوْفِيقِيٓ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ

برادران! یوں تو دنیا کی جس چیز پر نگاہ ڈالیئے وہ تغیر و تبدل کے ایک لاتناہی سلسلہ کی جولانگاہ نظر آئے گی۔ سائنس کی تحقیقات اور اثری اکتشافات نے اب یہ حقیقت بے نقاب کر دی ہے کہ مہیب و عمیق سمندر کبھی فلک بوس پہاڑ تھے اور ہمالیہ کی تیغ بستہ چوٹیاں بحر اطلانطک کی سی گہرائیاں تھیں آبادی کی جگہ ویرانے اور ویرانوں کی جگہ آبادیاں تھیں۔ اور یہی سلسلہ غیر محسوس طور پر آج بھی جاری و ساری ہے۔ لیکن ان انقلابات ارضی و سماوی کا انسان کی عمرانی زندگی پر کچھ ایسا گہرا اثر نہیں پڑتا، جیسا ان تغیرات کا جو زمین کی بجائے خود اہل زمین کے اندر پیدا ہوتے ہیں اور جن سے سطح ارض کے نقشے بدلنے کی بجائے انسانی تہذیب و تمدن کے آثار بنتے اور بگڑتے ہیں۔ آج ایک قوم اپنی ترقی کی معراج کمال پر ہوتی ہے اور کل ہی آثار قدیمہ کے کھنڈرات اس کے اجڑے ہوئے کاشانوں اور لٹے ہوئے خزانوں کے مرثیہ خواں ہو جاتے ہیں۔ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ پھر مصیبت بالائے مصیبت یہ ہوتی ہے کہ دور ہوطاہیں گزر نے والی قوم اپنی دولت و ثروت ہی نہیں کھو بیٹھتی بلکہ اس کی ذہنیت بھی کچھ ایسی پستی کے گڑھے میں گرتی ہے کہ اسے اپنے ہاں کی ہر چیز معیوب نظر آتی ہے۔ اور رو بہ ترقی اقوام کی ہر ادا محبوب وہ سعادت و نجات کا راستہ ڈھونڈتی ہے تو انہی کے نقوش قدم میں اور اس کو فلاح و بہبود کی راہیں کھلی نظر آتی ہیں تو انہی کی کورانہ تقلید میں غرضیکہ وہ دیکھتی ہے تو انہی کی آنکھوں سے سنتی ہے تو انہی کے کانوں سے۔ اور سمجھتی ہے تو انہی کے دلوں سے اور خود اپنی حالت یہ ہوتی ہے کہ :۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا ۔ وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا ۔ وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ۝

ان کے دل ہوتے ہیں مگر ان سے سمجھتے نہیں آنکھیں ہوتی ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں۔ کان ہوتے ہیں مگر ان سے سنتے نہیں وہ ڈھور ڈنگر کی طرح سے ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گذرے یہی لوگ غفلت شعار ہیں۔

یہی حالت آج امت مسلمہ کی ہے جس کی طرف توجہ مبذول کرانا مقصود ہے۔

حضرات زمانہ ترقی کر رہا ہے اور نہایت برق رفتاری کے ساتھ زمانہ سے مراد آج اقوام یورپ ہی ہیں

کہ وہ ترقی کی لامحدود فضاؤں میں بجلیوں کی سی سرعت کے ساتھ اُڑتی چلی جارہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ پس ماندہ اقوام پران کی اس محیرالعقول ترقی کا جتنا بھی مرعوب کن اثر ہو کم ہے لیکن مسلمانوں کی ذہنیت پر اس کا خاص طور پر بڑا ہلاکت آفریں اثر پڑا ہے۔ اور اگر اس زہر کو، جو ملت اسلامیہ کی رگ و پے میں اس سرعت سے سرایت کرتا چلا جارہا ہے جلدی زائل نہ کیا جائے گا تو بعید نہیں کہ مسلمان اپنی ہستی کے جوہر خاص کو ہی کھو بیٹھیں۔ یورپ کو جب علمی ترقی کا خیال آیا تو مذہب ان کے راستے میں سب سے بڑا اروڑا اٹکا۔ مسیحیت نے علمی ترقیوں کی کس قدر مخالفت کی۔ اس کا اندازہ لگانا ہو تو یورپ میں علم و کلیسا کی جنگ کی داستانیں پڑھیئے معلوم ہو جائے گا کہ جناب مسیح علیہ السلام کی معصوم بھیڑوں نے ہر جویائے علم و حقیقت کے ساتھ (جو غیر نہیں بلکہ یگانے تھے) جس درندگی کا سلوک کیا ہے، قتل و خون ریزی کی بڑی سے بڑی خونچکاں داستانیں اس کے سامنے شرمندہ ہیں گلیلیو (Galileo) کا کیا قصور تھا؟ یہی ناکہ اس نے کہہ دیا کہ میری آنکھیں مجھے دکھا رہی ہیں کہ زمین ساکن نہیں متحرک ہے۔ اور اس نے دوربین کے ذریعے کوپرنکس (Copernicus) کے نظریہ کی تائید کر دی۔ رومن کلیسا اس کے خلاف جوش غیظ و غضب میں دیوانہ ہوگیا۔ مقدمہ چلایا گیا اور اس مجرم انکشاف حقیقت کے خلاف موت کا فتویٰ صادر کر دیا گیا۔ کہتے ہیں کہ جب اسے پیسا (Pisa) کے بلند مینار پر لے گئے کہ وہاں سے گرا کر اس ملحد کا خاتمہ کر دیا جائے تو ایک پادری بھی ساتھ گیا کہ مرنے والوں سے گناہوں کے اعتراف کی آخری رسم ادا کرائی جائے۔ اس نے وہاں پہنچکر کہا کہ اگر اب بھی کہہ دو کہ زمین ساکن ہے متحرک نہیں تو جان بخشی ہوسکتی ہے۔ لیکن اس پرستارِ صداقت نے وہاں بھی کہہ دیا کہ ؏

بردار ستواں گفت بہ منبر نتواں گفت

کہ مجھے تو اب بھی زمین متحرک ہی نظر آتی ہے۔ چنانچہ پیسا کا مینار آج تک اس کے خون ناحق کا شاہد ہے۔ یہاں پر واضح کر دینا بھی خلاف محل نہ ہوگا کہ مسیحیت کو کوپرنکس یا گلیلیو کے اس نظریہ کے خلاف کیوں کد تھی۔ فلکیات کے متعلق حکمت یونان میں ارسطو کا نظریہ نہایت معتبر سمجھا جاتا تھا جس کی رو سے زمین اس کائنات کی مرکز اور ساکن تصور کی گئی تھی اور جملہ اجرام سماوی اس کے گرد چکر لگاتے تھے۔ اگرچہ اس نظریہ کی فیثاغورث وغیرہ نے اسی زمانہ میں تردید کر دی تھی لیکن بایں ہمہ اسے خاص اہمیت حاصل رہی اور یہی نظام بطلیموسی نظام فلکی کے نام سے یورپ میں رائج ہوگیا۔ مسیحیت کے اعتقاد میں جملہ کائنات میں اس کرہ کو خاص اہمیت حاصل ہونی چاہیئے تھی جس

خود خدا یا خدا کے بیٹے کی قربانی ہوئی۔ چونکہ بطلیموسی نظام کی رو سے زمین کو عالم موجودات میں ایک مرکزی اور خصوصی حیثیت حاصل تھی، اس لئے مسیحیت نے اس نظام کو اپنے اعتقادات میں داخل کر لیا۔ ازاں بعد جب علم و تحقیق کی روشنی میں یہ معلوم ہوا کہ زمین بھی دیگر اجرام فلکی کی طرح متحرک ہے اور اسے کوئی خاص امتیازی شان حاصل نہیں تو اس سے چونکہ مسیحیت کے اولین اعتقاد پر زد پڑتی تھی، اس لئے کلیسا نے اس کی مخالفت کی۔ یورپ میں اس جدید نظام فلکی کو کوپرنیکس کا نظام کہتے ہیں۔ "گلیلیو" بیچارے نے چونکہ علیٰ وجہ البصیرت اس جدید نظام کی تائید کر دی اس لئے حوالۂ دار و رسن کر دیا گیا۔ علم و تحقیق کے خلاف یہ اندھیر صرف قدامت پسند کلیسا کی طرف سے ہی نہ تھا بلکہ ان کے روشن خیال اور تجدد پسند طبقہ پراٹسٹنٹ نے بھی اس کے خلاف کافی زہر اگلا ہے جس کے متعلق خود لوتھر (Luther) پولاک اور میلانختون (Melanchthon) وغیرہ کی تصنیفات بھری پڑی ہیں۔

یورپ اگر ایسے مذہب کو چھوڑتا نہ تو اور کیا کرتا۔

ادھر ہندوستان میں جب علمی ترقی کا خیال پیدا ہوا تو وہی مظاہر فطرت۔ جن سے کروڑوں کام لینے تھے دیوی اور دیوتاؤں کی شکل میں سامنے موجود تھے۔ اندر۔ اگنی اور وائیو (پانی۔ آگ اور ہوا) جن کو تابع فرمان بنا کر یورپ نے زمین و آسمان کو مسخر کر رکھا تھا۔ ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر ڈنڈوت بجا لانا پڑتا تھا جس آزادی پسند طبقہ نے علمی ترقیوں کو ضروری سمجھا وہ قدامت پسند طبقہ کے احتجاج کی کچھ پرواہ نہ کرتے ہوئے مستانہ وار آگے بڑھ گیا اور یہاں بھی قدیم مذہب تیاگ دیا گیا۔

مسلمانوں نے جب دیکھا کہ دنیا میں جس قوم کو علمی ترقی کا خیال آتا ہے اسے سب سے پہلے مذہب کو چھوڑنا پڑتا ہے تو انہوں نے بھی کہنا شروع کر دیا کہ "صاحب ہو نہ ہو ہمارے موجودہ نکبت و افلاس ہبوط و تنزل، پس روی و تہی دامنی کا واحد ذمہ دار ہمارا مذہب ہے۔ اور جب تک ہم اسلام کو نہیں چھوڑ دیتے دنیا میں کبھی ترقی نہیں کر سکتے"۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک حد تک اس مذہبی منافرت کے ذمہ دار وہ حضرات بھی ہیں جنہوں نے اسلام کا غلط مفہوم ان کے سامنے پیش کیا۔ لیکن اسلام کوئی ایسا مذہب تو نہیں کہ نہ اس کی اصلی تعلیم کے مآخذ مل سکتے ہوں اور نہ اس کی عملی تاریخ میسر آ سکے۔ انہیں چاہیئے تھا کہ یک طرفہ ڈگری

صادر کردینے سے پہلے اسلام کو موقع تو دیتے کہ اپنی صفائی پیش کر سکتا۔ وہ کتاب و سنت کو اٹھا کر دیکھتے۔ تاریخ امت کو ملاحظہ کرتے۔ اور پھر اس کے متعلق اپنی رائے قائم کرتے اور اس رائے کا اظہار بھی کرتے پھرتے۔ اگر اتنی تکلیف گوارا فرما لیتے تو یہ حقیقت ان پر واضح ہو جاتی کہ اور قوموں نے اگر مذہب کو چھوڑا ہے تو اس لئے کہ ان کا مذہب ان کی علمی ترقیوں کے راستے میں حائل ہو رہا تھا۔ برعکس اس کے ان کی علمی ترقیوں کا دور ہی وہ تھا جس میں مذہب اوج کمال پر تھا۔ اوروں کو اگر ترقی کرنے کے لئے مذہب چھوڑنا پڑا ہے تو یہ ترقی کر ہی نہیں سکیں گے جب تک کہ حقیقی مذہب اسلام کو اپنا رہبر و ہادی نہیں بنائیں گے۔ یہ تو محض ہماری خوش عقیدگی ہے اور نہ ہی صنمیات یونان کے افسانے۔ بلکہ یہ قرآن کریم کی صریح تعلیم ہے اور تاریخ کی ٹھوس حقیقتیں۔ جو کچھ میں آج عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہی ہے کہ سائنس کی ترقیوں کے باب میں اسلام کی تعلیم کیا ہے؟ اور جب ایک خدا پرست قوم نے اس تعلیم پر عمل کر کے دکھایا تو کیا کیا نتائج مرتب ہوئے۔ اور تاریخ کا یہ حصہ مسلمان نہیں بلکہ غیر مسلم مصنفین کی شہادات پر مبنی ہوگا کہ کسی جانبداری کا احتمال نہ ہو۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ انسان کو جس چیز نے "انسان" بنایا اور اسے اس قدر شرف اعتبار بخشا ہے وہ امتیازی خصوصیت کونسی ہے؟ قرآن کریم نے اس حقیقت کبریٰ کو اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں نہایت لطیف و حسین پیرائے میں بیان فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا کہ "میں دنیا میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں" فرشتوں کی معصوم نگاہوں نے جب اس پیکر کو دیکھا۔ انہوں نے اس کے آب و گل میں خون کے چھینٹے اور آگ کی چنگاریاں بھی دیکھیں۔ عرض کیا کہ بار الہا! کیا دنیا میں ایسا نائب بنایا جائے گا۔ جو وہاں فساد برپا کرے گا اور قتل خونریزی کا مرتکب ہوگا؟ حالانکہ ہم تیری تسبیح، تقدیس کرتے رہتے ہیں"۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم بہتر جانتے ہیں، جو تم نہیں جانتے لیکن اس کے ساتھ ہی اس موقع پر یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری سمجھا کہ وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر یہ پیکر خاکی خلافت ارضی کے قابل سمجھا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاۗءَ كُلَّهَا اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی میں حقائق اشیاء کا علم ودیعت کر کے رکھ دیا۔ اور اسی فضیلت کی بنا پر اسے مسجود ملائک قرار دیا۔ لہٰذا یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ وہ شرف و مجد جس کی بنا پر انسان خلیفۃ اللہ فی الارض بنا، علم حقائق اشیاء تھا یعنی وہ علم الاشیاء ہے جس کے ایک حصہ کو یورپ علم الفطرت Natural Science سے تعبیر

کرتا ہے اور اسے اپنے یہاں کی ایجاد بتاتا ہے حالانکہ اسلام نے صدیوں پیشتر اسے انسانیت کا امتیاز قرار دیا ہے

پھر علم کی فضیلت کے متعلق قرآن کریم نے ان الفاظ میں فرمایا کہ :-

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (۳۹:۹)

"کہو کہ جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں"

چنانچہ تحصیل علم کی تحریک و تحریص کے طور پر نبی اکرمؐ کی متعدد احادیث مروی ہیں حضورؐ نے فرمایا کہ

"جو شخص طلب علم کے لئے گھر سے نکلتا ہے اس کے ایک ایک قدم کے ساتھ دس دس نیکیاں شامل ہوتی ہیں"

کتاب و سنت کی ان تصریحات کے بعد اب ہمیں مسلمانوں کی علمی تاریخ کو دیکھنا ہے کہ وہ کس حد تک اس تعلیم پر کاربند ہوئی۔ اگرچہ علمی ترقیوں کی طرف رجحان تو بنی امیہ کے وقت سے ہی شروع ہو چکا تھا لیکن یہ ترقیاں اپنی معراج پر بغداد کی عباسی سلطنت اور اندلس کی اموی سلطنت میں پہنچیں اور قرطبہ و بغداد وہ مرکز تھے جہاں سے آفتاب علم و فضل اقصائے عالم میں ضیا پاشی کرتا تھا۔ اس عہد کی علمی تاریخ پر بالاستیعاب نگاہ ڈالنے کے لئے بہت بڑی فرصت درکار ہے اس لئے اس مختصر سی صحبت میں مختلف علوم و فنون کی چند ایک مثالوں پر اکتفا کیا جائے گا۔ یہاں اتنا ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ ہر زمانہ کی ترقی کا موازنہ اس زمانہ کی ہیئت مجموعی سے کرنا چاہیئے۔ آج دنیا من حیث الکل بہت ترقی کر چکی ہے اور ترقی کا معیار بھی اتنا ہی بلند ہو چکا ہے۔ میں عہد اسلامیہ کی جس ترقی کا ذکر کر رہا ہوں یہ وہ زمانہ تھا جس میں ابھی یورپ کا بیشتر حصہ تیوں اور کھالوں سے ستر ڈھانپا کرتا تھا۔

سب سے پہلے علم الارض کو لیجئے :-

(۱) زمین کی پیمائش اور طبقات الارض کی تقسیم کا کام سب سے پہلے مسلمانوں نے شروع کیا۔ خلیفہ مامون الرشید نے شام کے علاقہ سے مساحت شروع کرائی۔ محمد ابن موسےٰ اس (Survey Party) کے انچارج تھے نیز اس نے ستر، علماء (Scholars) کی مدد سے کرۂ ارض کا ایک نقشہ بنوایا۔ ان میں الخوارزمی بھی تھے جنھوں نے اپنی کتاب میں تمام روئے زمین کو سات مختلف طبقات میں تقسیم کیا ہے جس میں آج تک کوئی رد و بدل نہیں کیا جا سکا۔ اس سے قبل بطلیموسی جغرافیہ میں اس تقسیم کا کوئی وجود نہ تھا۔

(۲) مسعودی اس زمانہ کا جہاں گرد (Globe Trotter) تھا جس نے تمام آباد دنیا کا سفر پا پیادہ

کیا اور اپنے مشاہدات قلم بند کرتا چلا گیا۔

(۳) مشہور اندلسی حکیم ابو بکر نے تمام روئے زمین کی آبادی کے حالات متعدد ضخیم جلدوں میں لکھے ہیں۔

(۴) ادریسی بھی اس زمانہ کا مشہور جغرافیہ داں ہے جس کی علمی شہرت کا اندازہ اس سے لگایئے صقلیہ سسلی کے عیسائی بادشاہ راجر دوئم نے اسے اپنے دربار میں بلالیا وہاں اس نے بادشاہ کے لئے ایک چاندی کا کرہ تیار کیا جس پر تمام دنیا کا نقشہ کندہ کرایا گیا تھا۔

(۵) اسی زمانہ میں حکیم ناصر خسرو۔ ابن بطوطہ اور ابن جبیر جیسے سیاح پیدا ہوئے جن کی علمی کاوشیں آج تک اہل علم و تحقیق کے لئے مایۂ ناز ہیں۔

(۶) مقدسی نے جغرافیہ پر ایک دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) لکھا جو تین حصوں پر مشتمل ہے پہلا اپنے مشاہدات۔ دوسرا ثقہ روایات اور تیسرا حصہ مطالعہ پر مبنی ہے۔

(۷) الخوارزمی نے اس زمانہ میں جبکہ امریکہ کا خیال تک بھی کسی کو نہ تھا۔ ایک نظریہ ایجاد کیا جسے یورپ میں نظریہ (ARIM) کہتے ہیں جس کی رو سے اس نے ایک نئی دنیا کے وجود کے امکان کا پتہ دیا مشہور فلاسفر بیکن نے اس نظریہ سے استفادہ کیا اور اسی کی روشنی میں کولمبس نے نئی دنیا کو دریافت کیا۔

(۲) جغرافیہ کے ساتھ ہی جہازرانی منسلک ہے۔

(۱) دسویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے جہاز چین کے شہر کانٹن تک جا پہنچے تھے اور وہیں سے کچھ مسلمان تاجر جاپان اور کوریا تک بھی گئے۔ ان علاقوں میں اسلام زیادہ تر انہی تجار کی بدولت پھیلا کیونکہ اس زمانہ میں تبلیغ کا کام کسی خاص طبقہ سے مختص نہیں کر دیا گیا تھا بلکہ ہر مسلمان کا پیشہ جداگانہ اور فریضہ تبلیغ ہوتا تھا۔

(۲) واسکوڈے گاما جس زمانہ میں افریقہ کا چکر کاٹ رہا تھا کہ اسے کسی طرح ہندوستان کا راستہ مل جائے تو جس شخص نے اس راہ گم کردہ منزل کو ٹھکانے لگا دیا وہ ایک عرب جہازراں احمد ابن مجید تھا۔

(۳) نہر سویز کھودنے کا خیال حضرت عمرؓ ابن العاص (عہد فاروقی) کے مجلّہ دماغ کا رہین منت ہے۔

(۴) یورپ کی عام منڈیوں میں عرب تجار جس کثرت سے پھیل چکے تھے اس کا خفیف سا اندازہ

اس بات سے لگائیے کہ عربوں کی تجارتی اور علمی اصطلاحات آج تک یورپ میں رائج ہیں مثلاً (Traffic) وہی لفظ ہے جو عربوں کے یہاں طریق (یعنی راستہ) تھا (Tariff) ان کے رسم الطریف سے نکلا ہے۔ (Magazine) عربوں کا مخزن (یعنی اسٹور) ہے (Cheque) جس پر آج تمام کاروباری دنیا کا انحصار ہے۔ صک کا تعریب ہے۔ اسی طرح (Cotton) ان کے یہاں کی قطن (کپاس) ہے۔ (Orange) وہاں کا نارنج (Lemon) لیموں اور (Saffaron) ان کے یہاں کا زعفران ہے۔ وقس علیٰ ہذا چنانچہ مشہور عیسائی جغرافیہ داں سیٹر سلطروں لکھتا ہے کہ کولمبس سے پہلے عرب کی جماعتیں بحر اطلانٹک میں مختلف مقامات اور زمینوں کی تلاش کرتی پھرتی تھیں۔

(۳) زمین کے بعد اہل زمین کے حالات یعنی علم تاریخ کو دیکھئے۔ امام طبری کی تاریخ بارہ مجلدات میں ہے۔ ابن خلدون کا مقدمہ تاریخ۔ فن تاریخ میں (جسے Froude نے تاریخ کی سائنس کہا ہے) آخری تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ اور جسے آج تک یورپ عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتا ہے۔ حاجی خلیفہ نے خاص عہد عباسیہ کی تاریخ میں قریب چودہ سو تصانیف شمار کی ہیں۔ مسعودی نے تاریخ کا انسائیکلوپیڈیا لکھا ہے جس طرح مقدسی نے جغرافیہ لکھا تھا۔

(۴) اب فلسفہ اور لٹریچر کو لیجئے جو ایک مہذب قوم کے نظام حیات میں بمنزلہ روح کے ہیں۔ الفریڈ گیلام مشہور مستشرق لکھتا ہے کہ یورپ میں جس قدر یونانی فلسفہ کی ترویج و اشاعت ہوئی مسلمانوں کے تراجم کی رہین منت ہے۔ فارابی۔ ابن سینا۔ ابن رشد وغیرہم حکمائے اسلام نے یونانی فیلسوفوں کی تصانیف یورپ کے سامنے کھول کر رکھدیں حتیٰ کہ لاطینی زبان، جو یورپ کے جملہ علوم و فنون کی سرچشمہ سمجھی جاتی تھی اس میں بھی جس قدر فلسفہ منتقل ہوا سب اندلس کے مسلمانوں کی تصانیف کے راستہ سے آیا۔ شاہنشاہ الفانسو (Alfonso the wise) نے مشہور فلاسفر ابو بکر کو اپنے دربار میں دعوت دی کہ وہ یہودی اور عیسائی فلاسفہ کو درس دیا کریں۔ پروفیسر گب کا بیان ہے کہ جس طرح یورپ مذہب کے معاملہ میں یہودیت کا شرمندہ احسان ہے اسی طرح فلسفہ اور رومان کے مسئلہ میں عربوں کا زیر

(Lewes) لکھے ہیں۔ مسٹر ہنیڈ نے ہسٹری اوف دی ورلڈ میں ہسٹورینس ہسٹری اوف دی ورلڈ میں الفاظ قریب قریب یہی ہے۔ ہسٹری اوف فلاسفی میں لکھتا ہے کہ اگر ڈیکارٹ کے زمانہ میں احیاء العلوم امام غزالیؒ کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں ہوگیا ہوتا تو لوگ ڈیکارٹ پر ادبی سرقہ کا الزام لگا دیتے۔

(۵) اب طب اور طبیعیات کو لیجئے۔ سر تھامس آرنلڈ کا بیان ہے کہ انکشافات طبعی کے متعلق ابھی مسلمانوں کی تصانیف بہ تمام و کمال یورپ کے سامنے نہیں آئیں۔ ایک قسطنطنیہ ہی کی قریب قریب ستر لائبریریوں میں اس موضوع پر ایسی نادر تصانیف دھری رکھی ہیں جن سے یورپ آشنا نہیں ہوا۔ پھر یہ تصانیف کس کد و کاوش سے بہم پہنچائی گئیں۔ اور کس تفحص و تجسس سے لکھی گئی تھیں۔ اس کا اندازہ مامون الرشید کے عہد کے مشہور سائنسدان حنین بن اسحٰق کے اس بیان سے کیا جاسکتا ہے کہ اس نے جالینوس کی ایک کتاب کی تصحیح کے لئے عراق، شام، فلسطین اور مصر کا پیادہ سفر کیا۔ اسی طرح فارابی نے ارسطو کی ایک کتاب پر تنقید لکھنے کے لئے اسے دو سو مرتبہ پڑھا۔

علم طب اور طبیعیات میں الکندی کی قریب ۲۶۵ تصانیف گنائی جاتی ہیں جن میں اکثر جرثقیل، مدوجزر، روشنی، آب و ہوا۔ فلکیات۔ معدنیات اور نباتیات پر ہیں۔

الرازی کی کتاب الحاوی ایک مدت تک یورپ کی طبی درسگاہوں میں داخل نصاب رہی ہے۔ الرازی نے سب سے پہلے چیچک کو متعدی مرض ثابت کیا۔ چنانچہ اس موضوع پر اس کا مقالہ یورپ میں عام مقبولیت حاصل کرچکا ہے۔

ابن سینا کے قانون کی شہرت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ تیس برس کے عرصہ میں صرف ایک لاطینی زبان میں اس کے پندرہ ایڈیشن چھپ گئے تھے۔ ابن سینا نے پہاڑوں کی تخلیق جامیات کی تحقیق زلزلوں کے اسباب اصول آلات۔ ٹمپریچر (مقیاس الحرارت) اور دیگر عناصر طبعی کے خواص پر بھی متعدد کتابیں لکھی ہیں جو یورپ کے سامنے موجود ہیں۔

اخوان الصفا نے چودھویں صدی میں ایک خفیہ انجمن تحقیقات علمی کے لئے قائم ہوئی تھی ایک سائنس کا انسائیکلوپیڈیا لکھا ہے جو ۵۲ مقالات پر مشتمل ہے اور جن میں سے ۱۷ مقالات علم الفطرت

(Natural Science) کے متعلق ہیں ۔

ابن خطیب اندلسی نے طاعون کے اسباب دریافت کئے اور تعدیہ کے لئے حفظ ما تقدم کے اصول متعین کئے ۔

ابن زہر اندلسی کی کتاب التاثیر۔ خواص الادویہ اور طریق علاج میں لاطینی میں سند مانی جاتی ہے اسی طرح زہراوی اندلسی کی جراحت پر کتاب علم تشریح الابدان کی بنیادی تصانیف میں سے ہے ۔

علمی میکانکس (علم الحیل) کے متعلق حکیم جزری نے تیرہویں صدی میں ایک تحقیقی مقالہ لکھا اور ڈاکٹر لیبان نے لکھا ہے کہ عربوں نے علمی میکانکس کے آلات ایجاد کر کے یورپ کو ان کا استعمال سکھایا ۔ کاغذ آٹھویں صدی میں اسلامی ممالک میں رائج ہو چکا تھا ۔ پانی کی گھڑیاں خلفائے عباسیہ کے وقت استعمال میں آتی تھیں چنانچہ ہارون الرشید نے ایک عجیب و غریب گھڑی تحفۃً شاہ شارلمین کو بھیجی تھی ۔

مشہور مورخ گبن لکھتا ہے کہ الکیمیا (Chemistry) اپنی اصل کے اعتبار سے عربوں کی ایجاد ہے انہوں نے ہی سب سے پہلے آتشیں مرکبات ایجاد کئے ۔ تیزاب مثل نائٹرک ایسڈ، ہائیڈرو کلورک ایسڈ، پوٹاس ۔ امونیا ۔ کلورائیڈ اوف مرکری ۔ وغیرہ کیمیاوی مادے نکالے ۔ زہروں کو دوائیوں میں تبدیل کیا ۔ اور (Gasses) کی خصوصیات دریافت کیں (ملاحظہ ہو Intellectual Development of Eur) اب فلکیات کو دیکھئے ۔ خلیفہ مامون الرشید کے عہد میں بغداد کے شمسیہ دروازے کے باہر ایک عظیم الشان رصدگاہ (Observatory) قائم ہوئی تھی جہاں اجرام سماوی کی گردش کے متعلق تحقیقات بہم پہونچائی جاتی تھیں یحییٰ بن منصور اس رصدگاہ کے انچارج تھے ۔ ان کی کتاب الاعمال، علم ہیئت پر ایک مستند تصنیف سمجھی جاتی ہے یورپ ابھی کل تک بطلیموسی نظام کا قائل تھا جس کی رو سے زمین ساکن بتائی جاتی تھی لیکن فارابی نے بہت عرصہ پیشتر اس نظریہ کی سوفیانہ توجیہات کی دھجیاں اڑائیں، اور اس کی جگہ اس نظام فلکی کی بنیاد ڈالی، جو یورپ میں کوپرنیکس کے نظام کے نام سے مشہور ہے ۔ اور جس پر آج یورپ کی تمام فلکی تحقیقات کی بنیاد قائم ہے ۔

علامہ تبیین مختلف علوم وفنون کے متعلق مسٹر ٹی۔ایں۔ وسوانی۔ ایم۔اے لکھتے ہیں کہ یورپ جس زمانے میں جہالت کی عمیق گہرائیوں میں پڑا ہوا تھا اسپین کے حکماء اسلام سائنس اور ادب کی شمعیں لے کر آگے بڑھے اور یورپ کو طب، ریاضی، فلسفہ اور دیگر علوم میں درس دینے لگے۔ وہ لوگ جہاز رانی، ساخت۔ باغوں کی پرورش پھولوں کے تحفظ۔ لوہے اور پیتل کے ظروف۔ روئی اور ریشم کے کپڑے۔ طباعت و مرصع کاری وغیرہ صنعتوں میں بھی بہت ماہر تھے۔

لیکن یہ سب علمی تحقیقات اور سائنس کے انکشافات ان علماء اسلام کی ذہنی افتاد یا طبعی رجحان کا نتیجہ نہ تھے بلکہ ایک خاص جذبہ تھا جس کے ماتحت یہ امور سرانجام پاتے تھے۔ وہ جذبہ کیا تھا؟ وہ کونسی قوت تھی جو انہیں علمی کاوشوں پر آمادہ کر دیتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب ایک اور صرف ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ مخصوص جذبہ، وہ قوت محرکہ ان کے مذہب کی تعلیم تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب مسلمانوں کے نظام حیات میں ہمیشہ بمنزلہ دماغ کے رہا ہے۔ جب تک دماغ روبہ اصلاح اور قوی ہوتا ہے تمام اعضاء و جوارح اپنی اپنی جگہ بحسن و خوبی کام کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب اس سرچشمۂ قوت و اصلاح میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے تو اعضاء و جوارح اگرچہ بظاہر صحیح و سالم نظر آتے ہیں لیکن ان کی قوت عمل سلب ہو جاتی ہے۔ اس زمانہ میں چونکہ حرارت دینی نظام حیات میں فی الجملہ موجود تھی، اس لئے ہر شعبۂ زندگی اپنی اپنی جگہ نشو و ارتقاء کے منازل طے کرتا چلا جاتا تھا۔ یہی مذہبی ولولہ اور جوش ہی تھا کہ وہ اتنی مصیبتیں جھیلتے تھے مگر علمی تحقیقات میں ان کا قدم پیچھے نہ ہٹتا تھا۔ اس لئے کہ وہ اسے بھی ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر انجام دیتے تھے۔ پھر وہ زمانہ کچھ آج کا نہ تھا کہ علمی ریسرچ کے لئے اس قدر آسانیاں موجود ہوتیں۔ آج کسی سکالر کے دل میں کسی علمی تحقیق کا خیال پیدا ہو۔ فوراً بڑی بڑی سوسائٹیاں اس کی مدد کے لئے تیار ہو جاتی ہیں۔ فنڈ جمع کئے جاتے ہیں۔ رفقائے کار سر بکف پا بہ رکاب ہوتے ہیں۔ وہ اگر افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں اپنا کیمپ نصب کریں تب بھی ہالینڈ کا مکھن، لندن کے بسکٹ، کشمیر کے سیب اور کینیڈا کی روٹی غرض سب کچھ وہیں ان کو پہونچتا رہتا ہے لیکن وہ زمانہ ایسا تھا کہ امام ابن جریر فرماتے ہیں کہ جب میں تحصیل علم

کے لئے گھر سے نکلا تو والدہ نے دو سو کلچے چادر میں باندھ دیئے تھے ۔ معمول یہ تھا کہ ہر روز ایک کلچہ دھنوکے پانی میں بھگو کر کھا لیتا ۔ چنانچہ جب یہ کلچے ختم ہو گئے تو دارالعلوم کا دروازہ چھوڑنا پڑا اور جب تک پھر روٹی کا انتظام نہ ہوا تحصیل علم کا سلسلہ جاری نہ ہو سکا ۔ ابن حاتم رازی نے لکھا ہے کہ انہوں نے تحصیل علم کے لئے نو ہزار میل پیادہ سفر کیا ۔ حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ایک ایک حدیث کی تحقیق کے لئے اکثر اوقات چالیس چالیس دن کا سفر کرنا پڑا ۔ ضیاء الدین ابن عاصم نے خاص نباتات کی تحقیق کے لئے روم، یونان اور اسپین کے ممالک کا سفر کیا اور اکثر ان حالات میں کہ نہ کھانے کو روٹی ملتی نہ سونے کو چھت میسر آتی ۔ غرضیکہ حالت یہ تھی کہ پاؤں میں چھالے پڑے ہوئے ہیں ۔ پنڈلیاں گرد و غبار سے اٹ رہی ہیں ۔ لباس چیتھڑے ہو رہا ہے چہرے پر ضعف و نقاہت سے مردنی چھا رہی ہے لیکن سر میں ایک سودا ہے کہ ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں پیدا ہونے دیتا اور ان کی یہ ہیئت زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ ؎

بے دست و پائیم کہ ہنوز از وفورِ عشق !
سودا ست در سرم کہ بہ ساماں برابر است

تہذیب اخلاق و تزکیۂ نفس ہو یا تدبیر مملکت و تنظیم جیوش، علوم و فنون کی تحقیق ہو یا تمدن و تہذیب کی کاوش سب منزلیں اسی جوش مذہبی کے جذبہ میں طے ہو جاتیں ۔ ان کے نزدیک ؎

ولایت، پادشاہی، علم اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا تھیں ؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

اس لئے کہ قرآن کریم گوناگوں طریقوں سے تدبر و تفکر کی تاکید کر رہا ہے ۔ کہیں حکم ہے کہیں ترغیب و ترہیب کہیں عدم تفکر پہ مذمت ۔ وہ لوگ اس کتاب کو ہماری طرح محض ثواب کی غرض سے نہ پڑھتے تھے بلکہ ان کے نزدیک یہ دنیا میں زندگی بسر کرنے کا ایک مکمل دستور و ضابطہ تھا اور منازل حیات کے ایک ایک قدم پہ وہ اس سے استشارہ کرتے تھے ۔ ہم میں سے کون ہے جس نے اس آیت کو نہیں پڑھا ۔

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ (۴۰:۹)

"کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ جو قومیں ان سے پہلے گذر چکی ہیں۔ ان کا کیا انجام ہوا؟"

ہم اس آیت مقدسہ کو پڑھتے ہیں اور پڑھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں لیکن وہ دور عمل تھا جس کے متعلق حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے فرمایا :-

"ہم میں سے جب کوئی قرآن کی دس آیتیں بھی سیکھ لیتا تو جب تک ان کی حقیقت سے آگاہ نہ ہو جاتا۔ اور ان پر عمل نہ کر لیتا آگے نہ بڑھتا" (تفسیر ابن جریر)

انہوں نے اس آیت کے رموز و معارف پر غور کیا سیروا فی الارض سے سیاحت کا نکتہ پایا اور اس سیاحت اور نظائر ارضی سے علم جغرافیہ کی بنا پڑی۔ اقوام گذشتہ کے انجام و عواقب پر نگاہ ڈالی تو علم تاریخ مرتب ہو گیا اور ان کے اجڑے ہوئے کاشانوں کو چشم عبرت سے دیکھا تو آثار قدیمہ کا علم وجود میں آ گیا۔ غرضیکہ ایک ہی آیت قرآنی پر تدبر و تفکر اور عمل سے علم کے تین مختلف شعبوں کا قیام عمل میں آیا۔

انہوں نے اس آیت کو دیکھا۔

اَلَمْ یَرَوْا اِلَی الطَّیْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِیْ جَوِّ السَّمَآءِ مَا یُمْسِکُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (۱۶ : ۷۹)

"کیا انہوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا کہ جو سما میں مسخر کئے گئے ہیں۔ اور ان کو اللہ کے سوا کوئی نہیں سنبھالتا۔ اس میں ایمان والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔"

اس میں غور کیا کہ ایمان والوں کے لئے جو اس میں نشانیاں بتائی گئی ہیں۔ وہ کیا ہیں اب ایمان کا تقاضا تھا کہ وہ اس کی کنہ و حقیقت تک پہنچتے۔ انہوں نے کوشش کی اور جر ثقیل۔ مرکز ثقل۔ کشش ارضی کے سے نظریئے دریافت کئے۔ چنانچہ پروفیسر Deitrioi نے جو لکھا ہے کہ "نیوٹن کے نظریہ کشش ثقل کے آثار مسلمانوں کی تصانیف میں ملتے ہیں" تو وہ انہی آیات پر تدبر کا نتیجہ تھا۔ اور یہی وہ نظریئے ہیں جن کی ارتقائی شکل آج طیاروں (ہوائی جہازوں) کی متعدد

میں آپ کے سامنے ہے۔

انھوں نے رتق و فتق کی آیت پر غور کیا تو یہ حقیقت ان کے سامنے بے نقاب ہو گئی کہ آسمانوں کے تمام کرّے آغاز پیدائش میں ایک ہیولی سے مرکب تھے پھر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر الگ الگ کرّے بن گئے۔

اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا
وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ ؕ اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ (۲۱: ۳۰)

"کیا ان لوگوں نے جو آیات الٰہی کا انکار کرتے ہیں یہ نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین پہلے آپس میں ملے ہوئے تھے۔ پھر ہم نے ان کو الگ الگ کر دیا اور ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی سے بنایا۔ کیا پھر بھی یہ ایمان نہیں لاتے ؟"

آیت کے آخری ٹکڑے سے ان کی توجہ اس طرف بھی گئی کہ تمام ذی حیات اشیاء کا قوام اولین پانی سے ہوا۔ کیا رتق و فتق اور پانی کا مبدا حیات ہونا آج سائنس کے آخری انکشافات نہیں ہیں۔ نظریہ ارتقا Evolution Theory آج سائنس کی تحقیقات کا معرکتہ الآرا کارنامہ سمجھا جاتا ہے لیکن اہل علم حضرات سے پوشیدہ نہیں کہ اس کی ابتدا بھی مسلم ائمہ علم و حکمت کی ذہنی کاوشوں کی رہین کرم ہے۔ فارابی ابن سینا ابن مسکویہ اور ابن باجہ نے اپنی تصانیف میں اس نظریے پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ یورپ کے ارتقائیوں نے ابتداء میں ضرور ان حکماء اسلام کے اشارات سے استفادہ حاصل کیا ہوگا مگر فرق یہ ہے کہ حکمائے اسلام کے نظریے کے مطابق تمام سلسلہ نشو و ارتقا مشیت و ارادہ باری تعالےٰ کے ماتحت عمل میں آتا ہے اور مغرب کے سائنسدانوں کی تعلیم کی رو سے خدا کی ہستی کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی یہی اساسی فرق ہے اسلام اور مغربی سائنس میں۔

انھوں نے تکویر لیل و نہار اور تسخیر شمس و قمر پر غور کیا تو فلکیات کے راز ان پر منکشف ہو گئے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ یُکَوِّرُ الَّیْلَ عَلَی النَّهَارِ وَیُکَوِّرُ النَّهَارَ
عَلَی الَّیْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی (۳۹: ۵)

اس نے زمین و آسمان کو حکمت سے پیدا کیا۔ وہ رات (کی تاریکی) پر دن (کی روشنی) اور دن (کی روشنی) پر رات (کی تاریکی) چادر لپیٹ دیتا ہے اس نے سورج اور چاند کو مسخر

کر رکھا ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک ایک وقت معین تک چلے جا رہا ہے"

جس نظامِ شمسی کی بنیاد انھوں نے قرآن کریم کی ان آیات کی روشنی میں قائم کی وہ آج سائنس کی تحقیقات کی آخری سرحد ہے۔ چنانچہ کُلٌّ فِی فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ (ہر ایک کرہ اپنے اپنے دائرہ میں تیرتا پھرتا ہے) نے بطلیموسی نظام کی تغلیط کر کے علم ہئیت کی صحیح عمل کی طرف فارابی کی رہنمائی کی۔ فلکیات کے متعلق ہرشل نے اپنی مدت العمر کے تجارب کے بعد جس نظریے کا اضافہ کیا ہے وہ یہی ہے کہ سورج مع اپنے نظام کے ایک اور ستارے کی طرف دوڑ رہا ہے جو اس کا مستقر ہے۔ اس ستارے کو ویگو کہتے ہیں لیکن ہرشل سے تیرہ سو سال پیشتر قرآن کریم کی اس آیت نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا تھا۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ (۳۶/۳۸)

"اور سورج اپنے مستقر کی طرف چلا جا رہا ہے یہ اندازہ باندھا ہوا ہے اُس خدا کا جو زبردست علم والا ہے"

غرض کہ ان اہلِ نظر مسلمانوں کے نزدیک دنیا کی ہر چیز میں ایک آیت الٰہی ایک خدا اوندی نشان۔ ایک راز فطرت مضمر ہوتا تھا سو وہ ہر ایک چیز کو تجسس کی نگاہ سے دیکھتے اور نقاب برافگندہ عروس حقیقت کو علمی تحقیقات اور عملی تجارب سے جنت نگاہ بنا لیتے۔ صبح کی سپیدی میں رات کی سیاہی میں شفق کی رنگینی میں، قوس قزح کی بہجت آفرینی میں، پہاڑوں کی بلندیوں میں سمندروں کی گہرائیوں میں بادلوں کی روانیوں میں، نسیم سحر کی عنبر فشانیوں میں، سورج کے جلال میں، چاند کے جمال میں انھیں صحیفہ فطرت کے اوراق کھلے ہوئے ملتے جو انہیں دعوت علم و عمل دیتے، کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے :-

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (۲/۱۶۴)

"بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں۔ اور رات دن کے آنے جانے میں۔ اور جہازوں میں جو کہ لوگوں کے فائدہ کی چیزیں سمندروں میں لے کر چلتے ہیں۔ اور (بارش کے) پانی میں جسے اللہ نے آسمان سے برسایا پھر اس سے زمین کو بعد مردہ ہو جانے کے بعد زندگی بخشی، اور اس میں ہر قسم کے حیوانات پھیلا دیئے، اور ہواؤں کے (رخ) بدلنے میں، اور بادلوں میں جو زمین و آسمان کے درمیان مقید و معلق رہتے ہیں سمجھ رکھنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں"

ایک مسلمان کے لئے جہاں یہ ضروری ہے کہ ان آیات اللہ پر ایک محکم یقین رکھے وہاں یہ بھی لازمی ہے کہ قرآن کریم کی ان

شہادات کو دنیا کے سامنے سچا ثابت کرے۔ اور یہ اسی طرح سے ہو سکتا ہے کہ فطرت کے ایک ایک نقش و نگار کو دیکھے اور پیہم تجربات اور مسلسل مشاہدات سے ان کی حقیقتیں دنیا کے سامنے کھول کر رکھے اس لئے کہ قرآن کریم کے نزدیک تو مومن کی صفت ہی یہی ہے کہ اٹھتے، بیٹھتے چلتے پھرتے سارا گرہ ہستی پر غور کرے اور اس کی نگاہ دقیقہ رس، پھول اور کانٹے کے نظر فریب امتیازات سے گزر کر شاخ گل کی ان گہرائیوں تک جا پہونچے جہاں ایک ہی قسم کے توام سے پھول کو شام جانفزا اور کانٹے کو نوک خلش زا عطا ہوتی ہے۔ وہ چلا ہو تو گل بوٹے کی شادابی و شگفتگی اسے دعوتِ نظارہ دے، بیٹھے تو ریت کے ایک ایک ذرے میں ہزار ہا آفتاب درخشاں نظر آئیں اور لیٹے تو آسمان کی جڑاؤ چھت ایک مرصع کار کی تحسین و تزئین کی داد مانگ رہی ہو۔ غرضیکہ اس کا اٹھنا بیکار ہو نہ اس کا بیٹھنا خالی از مصلحت

بیٹھے تو عجز نقش کف پا لئے ہوئے　　　اٹھے تو درد دل کا بہانہ لئے ہوئے

اس لئے کہ اس کے خضرِ راہ کا ارشاد ہے:۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (۲:۳)

"بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں، اور رات دن کے آگے جانے میں۔ اہلِ عقل کے لئے نشانیاں ہیں وہ لوگ جن کی یہ حالت ہے، کہ کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی ساخت میں غور کرتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ) اے ہمارے پروردگار تو نے اس (موجودات) کو لایعنی پیدا نہیں کیا"

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا کا دعویٰ ہم اس وقت کر سکتے ہیں جبکہ فی الحقیقت ہم دنیا کی ہر ایک چیز کو سودمند ثابت کر دکھائیں۔ اور یہ "علم حقائق اشیاء" اور "علم منافع اشیاء" کے بغیر کیسے ممکن ہے؟

برادرانِ سائنس کا سب سے بڑا احسان یہ بتایا جاتا ہے کہ اس نے ہر ایک چیز کی کنہ و حقیقت کو آشکارا کر کے دنیا میں عجائب پسندی اور توہم پرستی کے امکانات کو کم کر دیا ہے۔ یہ بالکل درست ہے لیکن دیکھئے تو سہی کہ توہم پرستی کا استیصال سب سے پہلے اسلام نے کیا ہے یا موجودہ سائنس کے انکشافات نے۔ مذاہب کی دنیا میں یہ شرف صرف اسلام کو حاصل ہے۔ کہ اس نے اپنے ہر ایک دعوے کی بنیاد دلیل و برہان پر رکھی ہے۔ دین اور عقل میں شروع سے ایک جنگ چلی آتی تھی لیکن اسلام نے اپنی بصیرت افروز تعلیم سے دین اور عقل کو ایک کر دکھایا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ۔

أَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ۔ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (۱۲ : ۱۲)

"(اے رسول کہہ دیجئے) کہ میں اور میرے متبعین جو خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں تو علیٰ وجہ البصیرت دیتے ہیں"

"اسلام اور عقل" ایک مستقل عنوان ہے جس کے متعلق ضمناً شرح وبسط سے کچھ عرض نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کسی اور فرصت میں گزارش کروں گا البتہ اس وقت توہم پرستی کے متعلق ایک واقعہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ نبی اکرمؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کا انتقال ہوا تو اس دن سورج کو گہن لگ گیا۔ عرب کا سا توہم پرست ملک، لوگ فوراً حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا حضورؐ کی صداقت کا کتنا زبردست ثبوت ہے کہ آپ کے غم میں اجرام فلکی نے بھی ماتمی لباس پہن لیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ "بھائیو۔ چاند اور سورج کا گہن قوانین قدرت کے مطابق عمل میں آتا ہے اس کا کسی کی موت یا پیدائش سے کچھ تعلق نہیں" کیا توہم پرستی کی جڑ پر اس سے بھی زیادہ شدید کوئی ضرب لگائی جاسکتی ہے؟ اور یہ اس "روشنی" کے زمانہ سے تیرہ سو برس پیشتر کا واقعہ ہے۔

حضرات! اس دھندلے سے خاکہ سے آپ کو کچھ اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اسلام علمی تحقیقات اور سائنس کی ترقیوں کا کس درجہ حامی و مؤید ہے مسلمانوں کے دورِ عروج میں سائنس کی ترقیاں کس بلندی پر پہونچ گئی تھیں پھر یورپ کے محققین اور حکمائے اسلام میں ایک بہت بڑا اصولی فرق بھی ہے۔ یورپ اپنے محققین کے صرف علمی کارنامے پیش کرتا ہے ان کے ذاتی کیرکٹر سے کسی کو کچھ سروکار نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے اسلام سب سے پہلے کیرکٹر کو پرکھتا ہے۔ اس کے نزدیک ایمان اور تقوےٰ کی فضیلت سب سے مقدم ہے۔ یورپ میں بیکن کو علمی تحقیقات میں جو مرتبہ حاصل ہے ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن اسی بیکن کی اخلاقی لغزشوں کی یہ حالت ہے کہ یورپ اس کے متعلق لکھتا ہے کہ۔

"نوعِ انسانی کا شریف ترین اور ذلیل ترین فرد"

لیکن مسلمانوں میں اگر امام غزالی۔ ابن تیمیہ۔ ابن مسکویہ وغیرہم کا نام جو آج تک سلام ورحمت سے لیا جاتا ہے تو محض اس لئے کہ علمی کارناموں کے ساتھ ساتھ ان کی اخلاقی بلندیوں کی مثال بھی کم ہی نظر آئے گی

پھر انفرادیت کو چھوڑ کر اگر اجتماعی حالت پر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اقوام مغرب اگر سائنس کے ایجادات میں اس درجہ منہمک ہیں تو محض اس لئے کہ ایک قوم کی قوت قاہرہ دوسری قوم سے کم نہ ہو جائے اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میدان حرب میں سائنس کی کرشمہ سازیاں اقوام مقابل کو بالادست نہ کردیں۔ یہ حقیقت ہے کہ سائنس کی ترقیاں گزشتہ جنگ عظیم سے جو اس قدر برق رفتار ہوئی ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ اقوام عالم میں باہمی اعتماد اٹھ چکا ہے اور ہر قوم دوسری قوم سے خائف ہے۔ اور اسی لئے سائنس کی ایجادات میں ایک دوسرے پر سابقت کی فکر دامنگیر ہے[1]۔ ظاہر ہے کہ جس علمی اور عملی انہماک کا محرک یہ جذبہ ہو اس سے اہل عالم کے امن و سکون اور اطمینان قلبی میں کس قدر اضافہ ہوگا؟ برعکس اس کے کہ مسلمانوں کی ترقیوں کا مطمح نظر کیا تھا اور خدا کی زمین پر بسنے والوں پر ان کا کیا اثر پڑا؟ اس کے متعلق اگر ہم کچھ کہیں گے تو شاید جانبداری پر محمول کیا جائے گا اس لئے ایک غیر مسلم کی رائے اس باب میں زیادہ موثق سمجھی جائے گی۔ مسز سروجنی نیڈو فرماتی ہیں:۔

> «عرب فوجیں یلغار کرتی ہوئی فرانس کے دروازے پر پہنچی تھیں تو کیوں؟ فتح و ظفر و دولت کے لئے نہیں۔ ملک گیری اسلام کا اصل مقصد نہ تھا اس کا مقصد حریت و آزادی کی اشاعت عمومی اور غلامی کا استیصال تھا۔ آج کل ہم ملکی طاقت کے لئے مرتے ہیں اور علاقوں کا رونا روتے ہیں مگر اسلام کا مطمح نظر کوئی ملک یا صوبہ یا خطہ نہ تھا بلکہ اس کا مقصد ساری دنیا کی نجات تھا اور مسلم داعی یہی دھن لے کر ملکوں ملکوں مارے مارے پھرتے تھے۔ عربوں نے صرف ملک کی زمینیں فتح نہیں کیں بلکہ دل اور دماغ فتح کئے۔ انہوں نے قوموں کے لٹریچر اور خیالات کو متاثر کیا۔ ہمارے (اہل ہنود کے) وہم و خیال کو حقیقت کا جامہ مسلمانوں نے پہنایا ہمارے افکار و تخیلات میں حرکت اور جان انہوں نے ڈالی۔ مسلمانوں نے دنیا میں علوم و فنون کی بے شمار خدمات انجام دی ہیں۔ اخلاق۔ فیاضی اور مردانگی ہمیشہ ان کی قومی خصوصیات رہی ہیں۔ انہوں نے ہندوؤں کی طرح اشاعت علوم میں کبھی بخل نہیں رکھا۔ یہ ہمیشہ بنی نوع انسان

---

[1] یہ تقریر موجودہ جنگ یورپ سے بہت پہلے کی ہے۔ پرویز

کی تعلیم و تربیت کی فکر میں رہے ہیں "

(وکیل مورخہ ۲۰ جنوری ۱۹۱۸ء)

یہ سب اس لئے تھا کہ انہوں نے علم کو ہمیشہ دین کے تابع رکھا۔ اور اس سے احکام خداوندی کے مطابق کام لیا۔

برادران! میں یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ نہایت ضروری سمجھتا ہوں جس کی طرف میں نے شروع میں اشارہ کیا تھا۔ ہمارے ہاں ایک تجدد پسند' روشن خیال' طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جس کے نزدیک کسی شے کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار محض حکمار یورپ کی رائے ہے حتیٰ کہ وہ قرآن کریم کے حقائق و معارف بلکہ اوامر و نواہی تک کو بھی اسی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ اگر قرآن حکیم کا کوئی ارشاد کسی یورپین محقق کے قول یا نظریہ سے مطابقت پا جاتا ہے تو وہ اسے قرآن حکیم کی صداقت کا ایک معجزہ سمجھ کر ساری دنیا میں اس کا چرچا کرتے ہیں۔ اور اگر قرآنی تعلیم اور یورپ کے کسی نظریہ میں کہیں تضاد و تخالف واقع ہوتا ہے تو ان کی انتہائی کوشش اس امر میں صرف ہو جاتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان۔ موڑ توڑ کر۔ قرآن کو یورپ کی ذہنی افتاد کے مطابق ثابت کر دیا جائے اور پھر اس "جہاد عظیم" کی دھن میں وہ قرآنی آیات کی ایسی مضحکہ خیز تاویلیں کرتے ہیں کہ غیر تو غیر خود اپنوں کی ہنسی بھی تھامے نہ تھم سکے۔ یہ مرعوب ذہنیت کی خود فریبی اور اصول قرآن فہمی کی بنیادی غلطی ہے۔ اس چیز کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ علمی تحقیقات اور سائنس کے انکشافات' خواہ کسی ملک میں ہوں یا کسی زمانہ میں' جب بھی وہ یقینیات کے درجہ کو پہنچ جائیں گے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ ارشادات قرآنی کے خلاف ہو سکیں۔ اس لئے کہ سائنس کے انکشافات بالآخر ہیں کیا؟ یہی نا کہ فطرت کی چھپی ہوئی حقیقتوں پر سے پردہ اٹھا دیا جائے تو کیا یہ ممکن ہے کہ فطرت کی کوئی حقیقت بے نقاب ہو اور وہ صحیفۂ فطرت کے مصنف حقیقی کے کسی ارشاد کے خلاف نکلے؟

"ایں خیال است و محال است و جنوں"

لیکن علمی تحقیقات کی یہ حالت ہے کہ ایک نظریئے کو یقین کے درجہ تک پہنچنے کے لئے ہزاروں

قیاسات کی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے کبھی تو ایک موجد کی زندگی میں ہی اس کا قیاس غلط ثابت ہوجاتا ہے اور کبھی آنے والی نسلیں اس کی دھجیاں بکھیر دیتی ہیں۔ لہذا جو نظریہ آج قرآن کریم کے کسی ارشاد سے مطابقت نہیں پاتا اس کی کیا دلیل ہے کہ وہ نظریہ محکم اور یقینی ہے۔ قیاسی اور ظنی نہیں؟ مشاہدات اور قیاسات میں ایک بین فرق ہے جسے کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ قرآن کریم کا کوئی اشارہ بھی آج تک کسی مشاہدہ کے خلاف ثابت نہیں ہوسکا۔ لیکن اس کی تعلیم کو قیاسات کے مطابق ثابت کرنے میں عجلت نہیں کرنی چاہیئے یہی غلطی ہم اس سے پہلے بھی ایک دفعہ کرچکے ہیں جبکہ بعض حکمائے اسلام نے قرآن حکیم کو فلسفۂ یونان کے مطابق ثابت کرنے میں اس قدر دماغ سوزی سے کام لیا۔ حالانکہ فلسفہ کے اصول ہمیشہ قیاسات پر مبنی ہوتے ہیں نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ آج اس فلسفہ قدیم کی بنیادیں منہدم ہونے کے ساتھ ہی ان علماء کی تمام کاوشیں بھی اکارت گئیں۔ نہیں بلکہ جن لوگوں نے قرآن کریم کو انہی علماء کی وساطت سے سمجھا تھا اور ان کی توضیحات کو اصل قرآن خیال کرتے تھے، ان کے دلوں میں خود قرآن کے متعلق طرح طرح کے شکوک و شبہات سے ارتیابی کیفیتیں پیدا ہوگئیں۔ ان آیات قرآنی کو جن کی تصدیق کسی زمانہ کے قیاسی نظریوں سے نہ ہوسکے، متشابہات کے تحت رکھنا چاہیئے۔ اور ان کے متعلق یہ ایمان ہونا چاہیئے۔ کہ ان کی حقیقتیں بلاشک و شبہ صحیح و درست ہیں اور زمانہ کی ترقی سے ایک وقت آئے گا کہ شاہدات ان کی تصدیق کرکے انہیں محکمات کے زمرے میں داخل کردیں گے۔

آخر میں ایک مختصر سی گذارش حضرات علماء کی خدمت میں بھی کرنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے لیکن بات چونکہ قرآن کی ہے اس لئے اس کے عرض کرنے میں کوئی باک نہیں سمجھتا۔ قرآن کریم نے جو علم کی اس درجہ تاکید فرمائی ہے اس علم کی تعریف کیا ہے۔ قرآن حکیم میں آیا ہے۔

لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا (۱۷: ۳۶)

"جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت چلو (یاد رکھو) کان، آنکھ اور دل۔ ان سب سے باز پرس ہوگی"۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک علم وہ ہے جس کی شہادت سمع ۔ بصر اور قلب سلیم دیں ۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ظن اور قیاس ہے ۔ علم کے یقینی مرتبہ تک نہیں پہونچتا ۔ ہمارے مذہبی مکاتب میں جو نصاب تعلیم مقرر ہے اس میں غور فرمائیے کہ کتنا حصہ ظن و قیاس کا ہے اور کس قدر علم و یقین کا فلسفہ یونان منطق ۔ علم الکلام (جسے فی الحقیقت فلسفہ یونان کی ہی ایک شاخ کہنا چاہیئے) تمام ظنی اور قیاسی ہیں ۔ وہ بھی ایسی کہ خود موجودہ ظنیات میں بھی انھیں کوئی نہیں قبول کرتا ۔ یورپ ایک عرصہ تک انہی قیاسات کی نکتہ آفرینیوں میں الجھا رہا مسئلہ پیش ہو جاتا کہ "مرغی کے منہ میں دانت ہو سکتے ہیں یا نہیں" اب فلاسفرز کی ایک جماعت اثبات کی طرف اور دوسری نفی کی طرف ہو جاتی ہے ۔ دلائل پہ دلائل لائے جاتے ہیں منطقی توجیہات پیش کی جاتی ہیں صغریٰ اور کبریٰ ملائے جاتے ہیں ۔ لیکن کوئی یہ نہیں کہتا کہ مرغی کا منہ کھول کر دیکھ لو کہ اس میں دانت ہیں یا نہیں ۔ حتیٰ کہ ان میں بیکن پیدا ہوا ۔ اس نے سب سے پہلے یورپ میں علم کی وہ تعریف کی جو قرآن کریم کی مصرفہ صدر آیت میں تیرہ سو سال پیشتر دنیا کے سامنے آ چکی تھی اور اس نے مرغی کا منہ کھول کر دکھا دیا ۔ آپ حیران ہوں گے کہ علم کی اس تعریف کے بدل جانے سے اس قوم کی ذہنیت بدل گئی ۔ اور آج جس قدر علمی تحقیقات اور سائنس کی ترقیاں ہو رہی ہیں سب علم کی اسی تعریف پر مبنی ہیں ۔ لیکن ایک ہم ہیں کہ :-

ہوئی لاکھ دنیا اِدھر کی اُدھر ہے

وہی سنگ در ہے وہی اپنا سر ہے

ضرورت ہے کہ ہم بھی اپنے زاویۂ نگاہ کو قرآن کریم کی روشنی میں بدلیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ جسے "علم دین" کہا جاتا ہے ۔ اس سے مقصد یہی ہے کہ ہم زندگی کے تمام مراحل میں اسے شمع ہدایت بنا سکیں اور اس کی روشنی میں منزل مقصود تک پہنچیں ۔ لیکن اگر اس شمع کو ہم اپنی کوٹھڑیوں کی زینت بنا کر بیٹھ جائیں تو ہر چند شمع کے نورانی ہونے میں شبہ نہ ہوگا ۔ لیکن منزل مقصود تک تو ہم نہیں پہنچ سکتے ۔ وہاں تو وہی پہونچے گا جو مسافت قطع کر رہا ہوگا ۔ اور علم دین امور دنیاوی میں اسی صورت میں کام آسکتا ہے جبکہ وہ اس قسم کا علم ہو جس کی تعریف قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے ۔ اور یہی علم کا وہ حصہ ہے جسے علم فطرت کہا جاتا ہے ۔ سو جب تک اس حصۂ علم کی تکمیل نہ ہو اسلام کا کوئی عالم مکمل عالم نہیں بن سکتا ۔ اسلام کے دور ترقی میں عالم کے لفظ سے کسی

زاہد گوشہ نشین کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوا کرتا تھا۔ بلکہ عالم اور حکیم سے مراد اس وقت وہی ہوتی تھی جو آج کل ریسرچ سکالر یا ڈاکٹر سے ہوتی ہے۔ چنانچہ نظامیہ میں ایک طرف اگر امام غزالی دینیات کا درس دیا کرتے تھے تو دوسری طرف علامہ بہاؤالدین ریاضی اور تاریخ پر لکچر دیتے تھے۔ خود مساجد میں اس قسم کے درس و تدریس کے سلسلے جاری تھے مصر کے خلیفہ العزیز کے زمانہ میں جامع الازہر میں لٹریچر اور طبعیات پر لیکچر دئے جاتے تھے۔ اور اسی مکمل تعلیم کا اثر تھا کہ جس نے وہ قوم پیدا کر دی جس کے علمی احسانات سے تمام مہذب دنیا کی گردن جھک رہی ہے، اور جن کے علمی کارنامے سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (جو کچھ زمین اور آسمانوں میں ہے سب تمہارے تابع فرمان کر دیا) کی زندہ تفسیر ہے۔ یقین مانئے اگر ہم بھی اپنے نظریئے کو بدل لیں اور علم کی صحیح تعریف کو اپنے پیش نظر رکھیں تو یہ زمین بدل جائے گی۔ یہ آسمان بدل جائے گا اور ایک دن ہم پھر یہ کہنے کے قابل ہو سکیں گے کہ ؎

زمیں از گردش تقدیر اگر دوں شود روزے

فروغ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ

زمزمۂ بقا

ہر خاک تغیر کے سوا بادِ فنا میں؟ | پانی جو سمندر سے اُڑا، ہے وہ گھٹا میں
دُنیا ہے تماشا گہِ نیرنگِ تغیر | طوفانِ فنا موج ہے دریائے بقا میں
قانونِ فنا ڈھالتا رہتا ہے ہمیشہ | قوت کو حرارت میں، حرارت کو ضیا میں
اے دوست! بظاہر جو فنا ہو گئی جل کر | موجود ہیں اس شمع کے ذرات ہوا میں
سورج نہیں معدوم اگر ڈوب چکا ہے | اسوقت بھی ہے نصف جہاں اسکی ضیا میں
شبنم کے وہ قطرے جو اُڑے دامنِ گُل سے | رُوپوش ہوئے پردۂ آغوشِ صبا میں
اشعار جو نکلے کسی شاعر کی زباں سے | محفوظ ہوئے سینۂ اربابِ صفا میں
ضایع نہ گئی قوتِ انگشتِ مُغنی | تبدیل ہوئی جنبشِ مضراب صدا میں
خامی ہے سماعت کی جو ہم سُن نہیں سکتے | پھرتا ہے ابھی نغمۂ داؤد ہوا میں
طے کرتے ہوئے عرصۂ ہستی کے منازل | ہم چھوڑتے جاتے ہیں نقوش اپنے فضا میں

اِک بار پھر اِس زیست کی تصویرِ مکمل
آئے گی نظر آئینۂ روزِ جزا میں

اسد ملتانی

طلوعِ اسلام

کے

شائع کردہ پمفلٹوں کا سٹ

گزشتہ دو سال میں سیاست ہندیہ میں مسلمانوں سے متعلق کون کون سے اہم مسائل پیدا ہوئے اور اہل الرائے حضرات نے انہیں کتاب و سنت کی روشنی میں کس طرح دیکھا؟

اگر

آپ اپنے طور پر معلوم کرنا چاہیں تو آپ کو دقت ہوگی

لیکن

اگر آپ ہم سے دریافت کریں تو ہم بڑی آسانی سے آپ کو بتا سکیں گے۔ اس لئے کہ یہ سب کچھ ان پمفلٹوں میں موجود ہے جو اس دوران میں طلوع اسلام کی طرف سے شائع کئے جاتے رہے ہیں اور جو ہزاروں کی تعداد میں ملک میں تقسیم ہو چکے ہیں یہ پمفلٹس نہ صرف سیاست بلکہ دین کے اور شعبوں سے متعلق اہم مسائل پر بھی معلومات کا عمدہ ذخیرہ اپنے اندر رکھتے ہیں۔

سٹ میں حسبِ ذیل پمفلٹ موجود ہیں

(۱) واردھا اسکیم اور مسلمان — ۴۴ صفحات ۲ر
(۲) سوراجی مسلمان — ۳۲ صفحات ۲ر
(۳) زبان کا مسئلہ — ۲۶ صفحات ۲ر
(۴) خدا کی بادشاہت — ۲۸ صفحات ۲ر

(۵) اسلام اور مذہبی رواداری — ۴۲ صفحات ۲ر
(۶) متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد مدنی — ۶۲ صفحات ۲ر
(۵) عرض داشت بخدمت علمائے کرام — ۳۳ صفحات ۱ر

(۸) اشتراکیت اور اسلام — ۸۰ صفحات ۳ر
(۹) مسلمان کی زندگی — ۲۲ صفحات ۱ر
(۱۰) کانگریس بے نقاب — ۲۶ صفحات ۲ر
(۱۱) راشٹرپتی مولانا ابوالکلام آزاد — ۳۶ صفحات ۲ر

(۱۲) شخصیت پرستی — ۵۲ صفحات ۲ر
(۱۳) علم حدیث — ۴۴ صفحات ۲ر
(۱۴) جہانِ نو — ۸۰ صفحات ۴ر
(۱۳) اسلامی معاشرت — ۵۶ صفحات ۳ر

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ شمیم منزل شیدی پورہ - دہلی

اسلامی عمل یا اسلامی خدمت قطعاً مراد اور مقصود نہیں ہے کیونکہ قرآن کریم میں غور اور تدبر کرنے، اور اسوہ حسنہ کی اتباع اور تقلید کرنے، صحابہؓ اور ائمہ دینؒ کی طرح حق کی راہ میں جہاد کرنے، اور حق کی راہ میں کٹ مرنے اور اعمال صالح پیدا کرنے کی بجائے۔

خودغرضی خودغرضیوں اور برائیوں، نہیں نہیں قوم کے اندر گندگی اور سنڈاس کے گھورے بنانے میں اس قدر منہمک ہوگئے ہیں کہ غیر تو غیر خود اپنوں کو بھی ان قومی رہبروں میں کوئی شہید (لتکونوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ-الآية) حق کی شہادت دینے والا، حق پر کٹ کر اپنے خون سے حق کی صداقت ثابت کرنے والا نظر نہیں آتا۔ ہر جگہ عیاری اور مکاری کا بازار گرم نظر آتا ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ مرحوم (ذرا ترمیم کے ساتھ) ؎

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ ملائی بھی عیاری ہے درویشی بھی عیاری!

غلامی خودغرضی اور غلامی لازم و ملزوم ہیں۔ صدیوں کی غلامی نے ہماری رہی سہی عقل پر بھی پردہ ڈال دیا ہے۔ حق و باطل کی تمیز، سچ جھوٹ میں فرق، درستی نادرستی میں امتیاز کی قوت مفقود ہوچکی ہے۔ حکومت اپنی نہیں کہ مسلمان سے اس کا بھاؤ پوچھے۔ بلکہ اس بے راہ روی میں حکومت اپنا فائدہ سمجھتی ہے۔ غلام جتنا بے راہ رو ہے آقا کی مسرت اور خوشی کا اس میں اتنا ہی سامان پوشیدہ ہے۔ غلاموں میں رہ سہ کر صرف غریبوں کا طبقہ ہے جو کچھ احساس رکھتا ہے مگر بوجہ غریبی و مفلسی ان کی سنتا کون ہے۔ عربی میں ایک شعر ہے کہ:۔

ان الفقیر اذا تکلم صادقاً قالوا کذبت وابطلوا ما قالا

فقیر اور مفلس جب سچی باتیں کہتا ہے تو اسے کہتے ہیں کہ "تو جھوٹا ہے" اور اس کی سچی باتوں کو باطل قرار دے دیا جاتا ہے۔ اور غلام زردار طبقہ (سرمایہ پرست خواہ امیر ہے خواہ ملا خواہ پیر) غریبوں کی گھات میں رہ کر ان کا شکار کرتا ہے۔ ان کو اپنے مفلس اور تنگدست (مظلوم) بھائیوں کی کیا پڑی کہ ان کو شاہبازی کی تعلیم دیں وہ (سرمایہ دار) ان کو ضعیف تر کرنے میں کوشاں رہتے اور اس ابلہ فریبی کو مکارانہ دلائل سے مضبوط کر کے اپنی من مانی مرادیں پوری کرتے رہتے ہیں۔ اور بظاہر دو سو سال کے رسوم و رواجات کو مذہب کی شکل دے کر غریب کو

نکلتے ہیں۔

گناہ اور بدعملی

اس ایک مقصد گناہ اور بدعملی کو پانی دینے کے لئے سب نادار مسلمان (مزدور) اور صیاد مسلمان (سرمایہ دار) ظالم اور مظلوم دونو ایک مشترک راہ پر جمع ہو جاتے ہیں۔ اور اسی راہ کو جس میں مظلوم کو خاموش کر دیا جاتا ہے اور ظالم کے ظلم کی تمنا اور مضبوط ہو جاتی ہے۔ مذہب کے نام سے مشہور کیا جاتا ہے اور اسی پر نجات ہے۔ اور یہی مذہب ہے جس پر حاکم اور مولوی۔ پیر، اور امیر کی زندگی کا مدار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک آیتہ کریمہ میں ان سب کی یوں خبر لی ہے:۔ (اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ) بہت سے مولویوں اور تارک الدنیا گوشہ نشینوں میں سے ایسے ہیں کہ (لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ) کھاتے ہیں لوگوں کے مال باطل اور ناحق سے (وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ) اور روکتے ہیں لوگوں کو اللہ کی راہ سے (وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ) اور وہ (زردار) لوگ جو جمع رکھتے اور دفن کرتے ہیں سونا اور چاندی اور پھر ان کو خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں (فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ) پس ان سب لوگوں (حکام، علماء، تارک الدنیا درویشوں یا پیروں اور امراء) کو المناک عذاب کی بشارت دے دو۔

گناہ کے ساتھ دعویٰ اصلاح

چونکہ ہر گروہ میں سے اکثریت گناہوں اور برائیوں کے سایہ میں پل اور پل کر جوان ہوئی اس لئے گناہ اب مسلمانوں کی جائداد بن گیا ہے۔ ہر وقت اپنے کو صاحب جائداد قرار دینے کے لئے گناہگار کے لفظ سے اس کا اظہار کر دیا جاتا ہے۔ اور پھر اس گناہگار کے لفظ سے اپنی عاجزی کا تصور بھی مطلوب ہوتا ہے۔ حالانکہ گناہ ایک فساد ہے "اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ" جب ان سے کہا جاتا ہے کہ مت فساد پھیلاؤ زمین میں۔ یعنی گناہ نہ کرو اور گناہگار نہ ہو بلکہ نیکی کرو اور نیکی پھیلاؤ۔ اور گناہ کو روکو۔ قَالُوْا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ "تو کہتے کہ ہم ہی تو مصلح ہیں، گویا اس گناہ کی اشاعت یا گناہگاری کے اظہار میں ہی اصلاح سمجھی جاتی ہے مگر ارشادِ خداوندی اَلَا اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ) سنو سنو کہ یہی مفسد ہیں وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ) لیکن انہیں شعور ہی نہیں یعنی ایسے بے شعور واقع ہوئے ہیں کہ کوئی شعور کی بات ان میں نظر نہیں آتی۔

گناہ کا پروگرام گناہ اور بدعملی کے جامد بن جانے کے بعد ضرورت معلوم کی گئی کہ اس کا کوئی منظم پروگرام بھی قوم کے سامنے پیش کیا جائے جس سے تمام قوم انہوں خوردہ ہو جائے اور ان کی خودغرضیاں پوری ہو جائیں۔ (وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ الاية)

تقدیر اس لئے کہیں تو یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ جو کچھ کوئی عملی طور پر کرتا ہے یا کہتا ہے وہ اس کی تقدیر کا لکھا ہے جو امٹ ہے اور جُفَّ القلم (قلم خشک ہو گیا ہے) زیادہ اور کم اسے کچھ اختیار ہی نہیں، اس لئے بڑے آدمی کا اچھا بننا یا اچھے کا برا بننا یا کسی تبدیلی کی کوشش کرنا تقدیر سے مقابلہ کرنا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ ؎

رباعی

اے بعلمِ ازل مرا دیدی | دیدی انگہ بعیب بخریدی
تو بعلمِ ازل و من بعیب جہاں | او مکن آنچہ خود پسندیدی

یہی رباعی لکھ کر پنجاب کے مغربی اضلاع میں ملا صاحب (میّت غسّال) مردہ کے بائیں ہاتھ میں دے چھوڑتے ہیں گویا مردوں کے عیب تو مصدقہ ہیں۔ مگر خدائے تعالےٰ کے اپنے منظور اور پسندیدہ ہیں۔ کیونکہ خدائے تعالیٰ کو ازلی علم تھا کہ فلاں شخص میں فلاں عیب ہیں اس لئے بندے کو اب تبدیل کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ اور ملّا صاحب مُردے کے دائیں ہاتھ میں یہ رباعی لکھ کر دیتے ہیں:-

وفدت علی الکریم بغیر زاد | من الحسنات والقلب السلیم
فحمل الزاد اقبح کل شیءٍ | اذا کان الوفود علی الکریم

(ترجمہ) میں کریم کے دربار میں حاضر ہو گیا مگر بغیر سامان سفر کے جو بھلائیوں اور قلب سلیم کی شکل میں چاہئے تھا پس سامان کا اٹھانا تمام چیزوں سے زیادہ قبیح ہے جب کہ کریم کے دربار میں حاضری مطلوب ہو اگرچہ قرآن کریم عمل عمل اور تزود بالتقوی کی جبراً و علانیۃً تلقین کرتا ہے) اس تقدیر کو ماننے کی وجہ سے لوگوں کا ایمان بالغیب منسلط ہو گیا۔

رسالت اگر انسانی مساعی پیغمبر علیہم السلام کی بعثت اور الہامی کتابوں کو سامنے رکھ کر تپایا جائے کہ تقدیر انسانوں کو برائیوں پر مجبور نہیں کرتی (اور تقدیر کا مفہوم لوگوں نے غلط سمجھ لیا ہے) اور انسان اپنے اعمال میں مختار ہو کر جزا و سزا کا مستحق ہوتا ہے تو ایک اور تجویز نکالی گئی کہ مسلمانوں کو گناہوں سے

کوئی خوف نہیں ہے کیونکہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم خود گناہوں کے شفیع ہیں یعنی شفاعت کے غلط مفہوم کی آڑ میں گناہوں کی حمایت کیجاتی ہے۔ اور اسے ایمان بالرسالت سمجھا ہوتا ہے۔

ضرورت پیر

اور پھر شفاعت چونکہ آخرت میں ہوگی اور گناہگار کا ایمان متزلزل ہوتا ہے۔ منہ سے ہر چند شفاعت کا دم بھرتا ہے۔ بلکہ اسی کی آس اور امید میں گناہوں میں اور دلیر ہو گیا ہے۔ مگر دل میں غیر مطمئن بھی ہے۔ اسی لئے اُسے دنیا میں بھی ایک ضامن اور کفیل کی ضرورت پڑتی ہے۔ جس کی تلاش اور انتخاب اس کی اپنی غلط اور کمزور نگاہ پر موقوف ہے۔ جس کو چاہے پیر بنا لے۔ غرض پیری و مریدی کی ضرورت ہندی مسلمان کو صرف اپنی کمزوری کو تقویت اور گناہوں کے لئے سہارا کی غرض سے پیدا ہوئی ہے مرید اپنے پیر جیسا کسی دوسرے کو نہیں سمجھتا۔ زندہ ہے تو مرید کی ہر مشکل کا حل کرنے والا ہے۔ اور مردہ ہے تو قبر میں بھی مرید کی حاجت روائی کے لئے تیار ہے۔ اور ہر جگہ سے مریدوں کی درخواستوں کو سنتا اور دیکھتا ہے۔ برزخی زندگی میں (اگر کوئی ہے تو) اسے دنیاوی زندگی سے کامل تر اور ہوشیار سمجھا جاتا ہے۔ اور اس خیال کو سمع موتیٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ مسئلہ مسلمانوں میں بہت اہمیت حاصل کر گیا ہے کہ مُردہ کو بعد موت بھی سمع بصر وغیرہ دنیاوی حواس اسی طرح میسر رہتے ہیں (صوفیوں کا کشف قبور بھی سمع موتیٰ کی فرع اور نتیجہ ہے)

ازالہ غلطی

بعض لوگ پیری مریدی کے سلسلے سے نیکی یا عبادت کی اشاعت چاہتے ہیں۔ مرید نیکی کا متلاشی ہے تو پیر نیکی کا مبلغ۔ مگر یہ نیکی مجرد اور لازم نیکی ہے، متعدی نہیں۔ یعنی تمام عمر اپنے نفس کی اصلاح میں گذر جاتی ہے تسبیح اور چلوں سے فراغت ہی نہیں ہوتی۔ اور ان تسبیحوں اور چلوں کو جہاد اکبر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ نہ نفس سے فراغت ہوگی نہ خدا تعالے کی راہ میں اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر جہاد کرنے کی ضرورت ہوگی۔

پیر کا اپنا عمل

پیر چونکہ بنتا نہیں بنایا جاتا ہے اس لئے اسے خود عمل کی ضرورت نہیں۔ پیر گھرانے میں پیدا ہونا ہی کافی ہے۔ اور اگر یہ گھرانے میں پیدا نہیں ہوا تو اس کے لئے صرف تعویذ گنڈوں اور جھاڑ پھونک کا پیشہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ جس پر نہ ہینگ لگتی ہے نہ پھٹکری اور

رنگ چوکھا آتا ہے۔ ہر صورت میں پیر چلتی پھرتی کونین ہے یا شربت بنفشہ اور عرق سونف کا مرتبان ہے یا ویزلین اور مرہم کا بہت بڑا چلنے پھرنے والا ڈبہ ہے کہ مریدوں کی بیماریوں کو اپنے تھوک سے، پھونک سے اور ہاتھ سے شفا بخشتا ہے۔ اور بعد مرگ بھی اس کی قبر دار الشفا ہے، حقیقتِ منتظر لباس مجاز اختیار کئے ہوئے ہے جس پر جبین ہائے نیاز میں ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں۔

عمل کی تعریف یہی جھاڑ پھونک، تعویذ گنڈا "عمل" بنا ہوا ہے اور یہ یہی عمل کرنے والا عامل ہے۔ اور عامل صاحب یا اس کے معمول (مرید) کے نزدیک یہی صالح عمل یا عمل بالقرآن ہے۔ سورۃ لٰیسین کو کئی دفعہ قبرستان میں بیٹھے بیٹھے پڑھنا۔ سورۃ کی زکوٰۃ نکالنا اور اس سے اپنی منشا کے مطابق کام لینا سورۃ کا عمل ہے۔ ع

وائے گر از پسِ امروز بود فردا ئے

پیر کے اس عمل سے صحیح عمل کی جڑ پر کلہاڑا چل گیا ہے اور مسلمان کی زندگی میں گناہ کا زہر سرایت کر رہا ہے

عقیدہ اور عمل ایک اور چیز بھی مسلمان کو گناہ پر دلیر کئے ہوئے ہے وہ یہ کہ منہ سے کہتا ہے خدا ایک ہے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں تمام رسول سچے ہیں، اللہ تعالیٰ کی کتابیں سچی ہیں، قرآن خدا کا کلام ہے، نیکی کے فرضی تصور کے لئے پیروں اور عالموں کا قائل بھی ہے بس ان مذکورہ باتوں کو ماننا گویا عقیدہ پختہ کر لیا ہے جس کے نتیجے میں اسے جنت ملے گی۔ رہا عمل (یعنی اللہ تعالیٰ، رسولؐ، کتاب الٰہی کے احکام کی تعمیل کرنا) سو وہ الگ شے ہے۔ ایمان کے لئے عمل ضروری نہیں ہے عمل نہ کرنے اور گناہ کے ارتکاب سے ایمان میں فرق نہیں آتا۔

نتیجہ یہی وجہ ہے کہ مولوی ہو یا پیر، امیر ہو یا فقیر، تعلیم یافتہ ہو یا جاہل، دن دہاڑے اپنے کو گنہگار کہتے اور پھر گناہ کرنے میں عار نہیں سمجھتا۔

تزکیہ جس قدر انبیاء علیہم السلام تشریف لائے سب کا نصب العین تزکیہ نفوس انسانی رہا ہے۔ وَيُزَكِّيهِمْ گناہوں، منکرات اور فواحش سے لوگوں کو بچاتے رہے ہیں۔ یہی ان کا مقصد تھا کسی پیغمبر نے کسی قوم کو یہ تعلیم نہیں دی کہ وہ گناہ کریں۔ اور پیغمبر علیہم السلام اس کا بیڑا پار کر دیں گے۔ بلکہ

پیغمبر کی اولاد اگر تابع فرمان اور مطیع نہیں ہے تو لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ کی ضرب سے اہل نبوت سے نکال دی جاتی ہے اگر بیوی خیانت کرتی ہے تو اس کے لئے نجات نہیں نوحؑ اور لوطؑ کی بیویوں کے لئے قرآن کریم میں ارشاد ہوا ہے فَخَانَتَاهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللهِ شَيْئًا ۰ یعنی پیغمبر خاوند بھی ہوں تو خائن بیویوں کے کام نہیں آسکتے۔ اگر چچا پیغمبرؑ کا مطیع نہیں ہے تو رشتہ نبوت اس کے لئے کوئی نجات کا باعث نہیں ہے اور تبت یدا ابی لہب کے ارشاد خداوندی کی زد میں سے ابولہب بن عبدالمطلب (عم النبی صلی اللہ) تباہ اور برباد ہو جاتا ہے۔

مذہب اور سیاست

ہندی مسلمان، مذہب کو سیاست سے الگ سمجھ کر۔ سیاست کو تو زبردست طاقت (یعنی حاکم وقت) کے حوالہ کر دیتا ہے۔ وہ طاقت اپنی مرضی سے دیوانی اور فوجداری کے دو صیغے قائم کر کے آئے دن نئے نئے قوانین تجویز کرتی ہے اور مسلمان اس سے تعلق نہیں رکھتا۔ اس کی بلا سے تمام قرآن بغیر عمل رہ جائے پوست بے مغز بن جائے۔ وہ صرف الفاظ میں برکت سمجھتا ہے اور ان کی تلاوت کرتا ہے۔ اور اس سے بھی مختصر مذہب کا دائرہ بہت محدود کر دیتا ہے۔ مثلاً پیدا ہوتے ہی ملّا نے کان میں اذان کہہ دی۔ زندگی میں کسی ملّا کی اذان پر کلمہ پڑھ لیا، اور مرنے کے بعد پھر ملّا نے قبر پر اذان کہہ ڈالی (جیسا کہ پنجاب کے مغربی اضلاع میں دستور ہے) بس اسلام کی حدیں پوری ہو گئیں۔ اول آخر اذان اور درمیان میں بھی اذان۔

اب گناہ کو مذہب تو روکتا نہیں کیونکہ اس کی حکومت نہیں، اس کا اثر نہیں، پڑھتے ہیں اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا الایۃ مگر چوری بھی کرتے ہیں۔ کیونکہ چوری کی سزا میں قطع ید (ہاتھ کاٹنا) فوجداری قوانین سے خود مقطوع ہو گئی ہے۔ ثبوت ہونے پر خوبصورت جیلوں میں چند دن رہنا ہے اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (الایۃ) کی جھوم جھوم کر تلاوت ہو رہی ہے۔ پڑھنے میں کوئی خوف یا رعب طاری نہیں ہوتا۔ نہ بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے کیونکہ مائۃ جلدۃ (...درّے) کا عمل نہیں ہے۔ بلکہ چکلوں کے لائسنس جاری ہیں۔ اور ان کو تہذیب میں داخل سمجھا جاتا ہے۔

علاج ان تمام تباہیوں اور بربادیوں کا علاج ایک اور صرف ایک ہی ہے کہ مسلمانوں کا ایک مرکز ہو جو تمام مسلمانوں کو ایک مسلک اور لڑی میں منسلک کر کے ان کی حرکت اور سکون کی نگرانی کرے۔ اور قرآن کریم ان کی زندگی کی کتاب ہو، فوجداری اور دیوانی کے دفعات قرآن کریم سے ڈھونڈے جائیں۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مقدسہ مسلمانوں کے لئے اسوہ حسنہ ہو۔ ان کے خلاف ہر عمل کی نگرانی اور کڑی نگرانی کی جائے، تعزیرات اور سزائیں ہوں تو قرآن کریم کی ہدایت کے مطابق سرکاری احکام ہوں تو قرآن کریم اور اسوہ رسول صلی اللہ کی روشنی میں۔

پھر مسلمان از سر نو مسلمان بن سکتا ہے مسلمانوں کا کلچر، تمدن اور معاشرت قرون اولیٰ کے رنگ میں رنگا جا سکتا ہے

خلاصہ خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان کا ہر قدم چونکہ اسلام کے خلاف پڑ رہا ہے۔ اس لئے اسے قرآنی ہدایت کے مطابق اپنا قدم سیدھا کر کے حسب ذیل صفات کو از سر نو پیدا کرنا چاہیئے۔

"مُسلِم :۔ سلامتی کا ذمہ دار، دنیا کو سلامت رکھنے والا، عیوب اور برائیوں سے بچانے والا"

"مُؤمِن :۔ امن اور امان کا ذمہ دار، دنیا کو امن میں رکھنے والا۔ بدامنی سے بچانے والا"

"مُصلِح :۔ صالح بنانے والا، اصلاح کرنے والا، فساد کو دور کرنے والا۔ بدامنی سے بچانے والا"

جب خود سالم نہ ہو، آمن نہ ہو، اور صالح نہ ہو، بلکہ سلامتی کا دشمن، امن کو توڑنے والا اور صالح کی بجائے حاسد اور غلام ہو، تو وہ مسلم، مومن، اور مصلح کے اوصاف کا کس طرح حقدار ہو سکتا ہے؟۔

فَاعْتَبِرُوْا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ ؕ

تنقید و تبصرہ

ہم نے ایک مرتبہ پہلے بھی لکھا تھا کہ ہندوستان میں ایک ایسے ادارہ کی بڑی ضرورت ہے جو انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں اعلیٰ قسم کا اسلامی لٹریچر شائع کرے۔ اس باب میں ہم نے لاہور کے ناشر کتب شیخ محمد اشرف صاحب کا بھی ذکر کیا تھا۔ جنھوں نے اس قسم کے ادارہ کی بنیاد رکھی ہے۔ ہمیں خوشی ہوئی کہ اس تھوڑے سے وقت میں اس ادارہ نے انگریزی زبان میں کئی ایک کتابیں شایع کی ہیں۔ ان کتابوں کی طباعت۔ ٹائپ۔ کاغذ۔ جلد۔ گردپوش۔ غرضکہ پورا (GETUP) نہایت دیدہ زیب ہے۔ اور معنوی اعتبار سے بھی فی الجملہ عام سطح سے بلند ہیں۔ وہ ہمیشہ اچھی کتابوں کی تلاش میں رہتے ہیں اور اس غرض کیلئے ارباب قلم سے ملتے بھی رہتے ہیں۔ ہم اہلِ قلم حضرات سے درخواست کریں گے کہ وہ ایسی کتابیں لکھنے کی طرف توجہ فرمائیں جن کے ذریعے سے صحیح اسلامی رُوح نوجوانوں کے سامنے آجائے ارباب ذوق سے گذارش کرینگے کہ وہ اس قسم کے اداروں کی حوصلہ افزائی کیا کریں۔ اور ناشرین حضرات کی خدمت میں عرض کریں گے کہ وہ تجارت کے ساتھ اسلامی جذبہ کو بھی ہمکنار رکھیں اور کوشش کریں کہ کتابیں واجبی منافع پر فروخت ہوا کریں۔ اس دور میں جتنی کتابیں مسلمانوں کی طرف سے شائع ہورہی ہیں۔ ان کی قیمتیں بالعموم زیادہ ہوتی ہیں اس کے برعکس ہندو اپنے لٹریچر کو بڑے سستے داموں پر عام کر رہا ہے۔ اسکی وجوہات گوناگوں ہیں لیکن جہاںتک ناشرین حضرات کا تعلق ہے ہم اُن سے درخواست کریں گے کہ وہ "تھوڑے منافع اور زیادہ بکری" کے پرانے اُصول کو ضرور پیش نظر رکھا کریں۔

ذیل کی کتابیں شیخ محمد اشرف صاحب کشمیری بازار لاہور کی طرف سے شائع ہوئی ہیں

مجدد سرہندی کا تصور توحید (انگریزی) اسلام ایک پیام حیات بخش ہے۔ جسمیں زندگی عبارت

ہے مسلسل جہاد۔ پیہم تگ و دو اور غیر منقطع سعی و عمل سے۔ اس میں جو لمحہ جمود و تعطل کا گذرے۔ غیر فطری ہی۔ اس زندہ اسلام کی درخشندہ تفسیر تھا۔ وہ عہد سعادتِ مہد جسمیں مجاہدین کی برگزیدہ جماعت نے اپنے یقینِ محکم اور عمل پیہم سے خدا کی حکومت کا تختِ جلال اس زمین پر بچھایا اور انسانیت کو ان تمام طوقِ و سلاسل سے آزاد کر دیا۔ جن میں وہ صدیوں سے جکڑی چلی آرہی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ خدا نے حکم دیا۔ اس کے رسولؐ نے تعمیل اول کا نمونہ پیش کیا اور قدوسیوں کی اس جماعت نے اُسے کرکے دکھا دیا۔ کام کرنے والی قوم کو کبھی فرصت ہی نہیں ہوتی۔ کہ وہ نظری مسائل میں اُلجھے چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اس دور میں نظری مسائل پر بحث و تمحیص کا کہیں ذکر تک نہیں ملتا ایک تابناک نصب العینِ حیات اُن کے سامنے تھا اور اس نصب العین تک پہنچنے کی دُھن اُن کا سرمایۂ زندگی۔ اُنھیں فرصت کہاں کہ لفظی گورکھ دھندوں میں اُلجھ کر وقت ضائع کریں۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد زباغباں　　　بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

لیکن یہ دورِ سعی و عمل جلد گذر گیا۔ خلافت ملوکیت میں بدل گئی اور اس کے ساتھ ہی ملوکیت کی تمام لعنتیں ایک ایک کرکے قوم پر مسلط ہوتی گئیں۔ دربار پر ملوکانہ تکلفات چھاگئے۔ قلب و نظر پر عجمی تصورات غالب آگئے۔ فرصت کا زمانہ۔ فارغ البالی کے دن۔ کھانے پینے کے لئے فراواں، نہ فکرِ فردا۔ نہ غمِ دوش۔ زندگی کا نصب العین ابیقوریت (EPICURIANISM) اربابِ علم و فضل بالعموم اپنی اپنی مسندوں پر بیٹھے منطقیانہ موشگافیوں اور فلسفیانہ نکات آفرینیوں میں "مصروفِ عمل" ہوگئے۔ پہلے یہ تھا کہ اُدھر سے ارشاد ہوا کہ "قال اللہ تعالیٰ" اور ادھر سے اُنھوں نے اپنے عمل سے اس قال کو حال کر دکھایا۔ اب یہ مسئلہ پیدا ہو گیا کہ جب اللہ کے متعلق لفظ قال (اُسنے کہا) کا استعمال ہو تو اس قول کی ماہیئت کیا ہوتی ہی؟ جو فرشتے اس "قولِ خداوندی" کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کی نوعیت کیا ہوتی ہی؟ ملکۂ نبوت کسے کہتے ہیں؟ وحی کی کیفیت کیا ہی؟ وغیرذالک ان "لفظی مجاہدات" کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف قوم سینکڑوں فرقوں میں بٹ گئی۔ اور دوسری طرف ان سے سعی و عمل کی صحیح اسلامی روح مفقود ہو گئی۔ اُنھوں نے سمجھ لیا کہ کسی مسئلہ کا

حل دریافت کرلینا۔ سب سے بڑا جہاد ہے۔ کسی مناظرہ کے میدان میں فریقِ مخالف کو منطقی دلائل سے خاموش کر دینا سب سے گراں قدر عملِ حسنہ ہے۔ جبر و قدر کے مسائل۔ تجسیم و تنزیہ کے مسائل۔ حدوث و قدمِ مادہ کے مسائل۔ قرآنِ کریم کے مخلوق و قدیم ہونے کے مسائل۔ ذات و صفاتِ باری تعالیٰ۔ نبوت۔ وحی۔ الہام۔ معجزات۔ ملائکہ۔ جنت۔ دوزخ۔ برزخ۔ حشر نشر غرضکہ ایمان کے ایک ایک شعبہ اور عقائد کے ایک ایک گوشہ کے متعلق لفظی مباحث و جدل کا ایسا لا متناہی سلسلہ چھڑا کہ کثرتِ تعبیر سے خواب پریشان ہو گیا اور یوں

حقیقت خرافات میں کھو گئی

ایک طرف اربابِ علم و فضل کا یہ حال تھا (الا ماشاءاللہ) دوسری طرف "اہلِ نظر و سلوک" ان سے بھی آگے بڑھے ہوئے تھے۔ علمی میدانوں میں۔ الفاظ سے ہی بحث سہی۔ کسی سند و دلیل کی تو ضرورت تھی۔ لیکن اس وادی میں ان تمام "ظواہر" سے بے نیازی ہو گئی۔ ان کا ذاتی کشف سب سے بڑی سند۔ اور سینہ بہ سینہ رموز سب سے بڑی دلیل تھی۔ اسلام کے زندہ دور میں میدانِ جہاد میں شمشیر بکف نکل کھڑے ہونا۔ بلند ترین عملِ صالح تھا۔ لیکن اب زاویہ کے گوشۂ خمول میں نفس کشی سب سے بڑا جہاد تھا۔ پہلے سیر و افی الارض مسلمان کے لئے ایک اہم وظیفہ تھا۔ لیکن اب یہ تمام مراحل اپنے حجرہ میں۔ بیٹھے مراقبہ کے ذریعے طے ہو جاتے تھے۔

یہ تمام منازل ایسے تھے جن میں قوم کی فعّال قوتیں ایک ایک کر کے سپردِ خاک ہو گئیں اور وہی جماعت جس کی ضربِ کلیمی سے ایک دنیا کانپتی تھی۔ دنیا میں سب سے زیادہ ناکارہ بن کے رہ گئی۔ اس عجمی تصوف کے مختلف شعبوں میں وہ بنیادی مسئلہ جس نے پوری کی پوری قوم پر عملاً موت طاری کر دی۔ وحدت الوجود کا عقیدہ تھا۔ تفصیل اس اجمال کی طول و طویل ہے۔ چند الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اس عقیدہ کی رُو سے وجودِ حقیقی صرف ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ اور کائنات کی ہر شے جس میں عالمِ طبیعی اور انسان سب شامل ہیں موہوم وجود رکھتے ہیں۔ لہذا۔ یہ دنیا سراب ہے، دھوکا ہے "مایا کا کھیل" کائنات موہوم ہے۔ نفسِ انسانی بے حقیقت ہے۔ زندگی

بے ثبات۔ لہٰذا سعی و عمل لاحاصل ہیں۔ دُنیا کی تمام تکالیف آرزو سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے ترک آرزو اور ترکِ علائق میں ہی حقیقی اطمینانِ قلب ہے۔ یہ تھا وہ فلسفۂ حیات جس نے ایک جیتی جاگتی قوم کو مردوں کی بستی بنادیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں ہر دیکھنے والی آنکھ نے دیکھ لیا کہ اب

مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے۔

اس وحدتِ وجود کے عقیدہ کے سب سے بڑے علمبردار شیخ اکبر ابن عربی ہیں۔ اسوقت اس عقیدہ کی جزئیات پر بحث نہیں کی جاسکتی۔ اس کے لئے فرصت درکار ہے۔

سردست انکی اشارات پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔ اس عقیدہ کی تردید میں اکثر ائمہ علوم نے بہت کچھ لکھا۔ لیکن جنھوں نے بڑی شد و مد سے اس کی مخالفت کی وہ امام سرہندی۔ شیخ احمدؒ ہیں۔ جنھیں عام طور پر "مجدد الفِ ثانی" کہا جاتا ہے۔ ان کے مکتوبات۔ ایک تو فارسی زبان میں ہونے کی وجہ سے۔ اور دوسرے اس لئے کہ وہ بڑے دقیق مسائل پر مشتمل ہیں۔ آج بالعموم نگاہوں سے اوجھل ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اور بالخصوص ہمارا نوجوان طبقہ تو ان سے قطعاً ناآشنا ہے۔ ڈاکٹر برہان احمد صاحب فاروقی نے زیرِ نظر کتاب میں شیخ اکبرؒ۔ اور امام سرہندیؒ کے نظریوں کا موازنہ کرکے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ حضرت امامؒ نے اس عقیدہ کا کس طرح ابطال کیا ہے ان کی یہ کوشش (بالخصوص انگریزی زبان میں) یقیناً قابلِ قدر ہے۔

ہر چند کتاب مختصر سی ہے اور اس میں تفصیلی مباحث کے بجائے محض اشارات ہی تک اکتفا کیا گیا ہے۔ لیکن "پہلی کوشش" ہونیکی جہت سے۔ بہرحال غنیمت ہے۔ ضرورت تھی۔ کہ اس عقیدہ کا عملی پہلو زیادہ نمایاں کیا جاتا اور تاریخی پس منظر کے ساتھ دکھایا جاتا کہ اس نے مسلمان کے قوائے عملیہ پر کیا اثر کیا۔ اور جناب امام سرہندیؒ کی اصلاح نے کیا نتیجہ پیدا کیا۔ یہی وہ کمی ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب نظری سا مقالہ بن کے رہ گئی ہے۔ اور اس میں وہ رُوح نظر نہیں آتی جو برقِ تپاں بنکر اس کے رگ و پے میں دوڑنی چاہئے تھی۔ مبتدیوں کے لئے یہ کتاب مفید ہوگی۔ اور (جرأت عرض معاف کی جائے تو) ہمارا خالص انگریزی داں طبقہ ان امور میں مبتدیوں سے زیادہ حیثیت بھی کیا رکھتا ہے۔ دو ایک مقام وضاحت طلب بھی ہیں۔ صفحہ ۹ پر تحریر ہے۔

"(حضرت) شیخ احمدؒ کی مسئلہ وحدتِ وجود کی مخالفت فلسفیانہ دلائل یا

دینیاتی عقائد پر مبنی نہیں ہیں۔ بلکہ یہ کشف یا براہِ راست مذہبی تجربہ پر مبنی ہے۔"

اس کی تفصیل صفحات ۸۳-۸۴ پر بھی ملتی ہے۔ جہاں یہ لکھا ہے کہ انھوں نے اس عقیدہ کا ابطال تصوف ہی کے تجارب کی بناء پر کیا ہے۔ انھوں نے اپنے کشف سے محسوس کیا کہ وحدتِ وجود بہت نچلی منزل ہے اور وہ خود ایک بلند مقام پر پہنچ گئے ہیں جسے ظلّیت کہا جاتا ہے۔ لیکن ص۱۱۱ پر ہمیں یہ عبارت ملتی ہے۔

"حضرت مجددؒ نے توحید کا جو تصور پیش کیا وہ یہ ہے کہ ہم خدا کو کشف وشہود کی رو سے نہیں پہچان سکتے۔ اس لئے ہمیں وحی اور علمائے ظاہر کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ کیونکہ ان کا تصور براہِ راست وحی سے ماخوذ ہے۔ اس لئے حضرت مجددؒ ذات وصفات سے متعلقہ مسائل پر علمائے دین کے اصولوں پر بحث کرتے ہیں۔ اور اس باب میں وہ اشعری فریقِ فکر کی پیروی نہیں کرتے۔ بلکہ ماتریدی کی تقلید کرتے ہیں۔"

ان دونوں چیزوں میں توافق نظر نہیں آتا۔ حضرت مجددؒ کی وحدتِ وجود کی مخالفت یا تو کشف وشہود پر مبنی ہو سکتی ہے یا دلائل و براہین پر۔ دونوں چیزیں ایک جگہ کیسے جمع ہو سکتی ہیں اگر ان کی تردید کشف پر ہی مبنی ہے۔ تو جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے یہ نہ تو فریقِ مخالف کے لئے حجت ہو سکتا ہے نہ متلاشیانِ حقیقت کیلئے سند۔ دلیل وحجت تو وہی چیز ہو سکتی ہے جس کی سند قرآنِ کریم سے لائی جائے۔ مثلاً خواجہ میر ناصرؒ کے طریقۂ محمدی کے متعلق اس کتاب میں تحریر ہے

"خواجہ میر ناصرؒ۔ جو تصوف میں سلسلۂ مجددیہ سے متعلق ہیں ایک مرتبہ ایک ہفتہ تک عالمِ سکر میں رہے۔ اس دوران میں امام حسنؓ بذاتِ خود ان کے حجرہ میں تشریف لائے اور انھیں تصوف کے ایک نئے طریق کی تلقین کی اور ارشاد فرمایا کہ اس کا نام طریقۂ محمدی رکھا جائے۔ کیونکہ وہی طریقۂ جنابِ رسولِ خداؐ کا سچا طریقہ تھا۔"

ظاہر ہے کہ یہ چیزیں بطورِ سند وحجت کے تو پیش نہیں کی جا سکتیں۔ اگرچہ تصوف کی تمام عمارت ہی ان ہی چیزوں پر قائم ہے۔ کہ

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی۔

ایک جگہ عبد اور معبود کا ترجمہ (Worshipper and worshipped) کیا گیا ہے۔
اگرچہ ان الفاظ کا ترجمہ بالعموم یہی کیا جاتا ہے۔ یعنی عبد۔ پرستش کرنیوالا۔ معبود۔ جسکی پرستش
کی جائے۔ لیکن "پرستش" سے عبودیت کا قرآنی مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ عبودیت کے صحیح معنی
اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو تسلیم کرنا ہے (اور عبادت اسی تسلیم حاکمیت کا عملی مظاہرہ ہے) اس لئے
عبد و عابد کے معنی محکوم، اور معبود کے معنی حاکم مطلق۔ قرآنی مفہوم کو زیادہ واضح کرتے ہیں۔ اسطرح
اِیَّاکَ نَعْبُدُ کے معنی ہونگے۔" ہم تیرے سوا کسی اور کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتے"

کتاب شیخ محمد اشرف صاحب نے شایع کی ہے۔ حجم ۱۹۲ صفحات۔ عام کتابی تقطیع۔
مجلد کی قیمت تین روپیہ فی نسخہ۔

۲۔ انگریزی ترجمہ اسرارِ خودی

حضرت علامہؒ کی شہرۂ آفاق کتاب۔ اسرارِ خودی۔ کا انگریزی میں ترجمہ ۱۹۲۰ء میں پروفیسر نکلسن نے کیا تھا
جسے مغرب میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ پروفیسر نکلسن نے خود حضرت علامہ سے دریافت
فرمایا تھا کہ ان کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ اور تفصیلی نظام کیا ہے۔ کیونکہ انھیں اعتراف تھا کہ

" مغربی قارئین۔ اسرارِ خودی کے مطالعہ سے بعض مقامات میں اُلجھ کر رہ جاتے ہیں
اور کوئی ترجمہ ان مقامات کا صحیح حل پیش نہیں کرسکتا۔"

حضرت علامہ نے پروفیسر نکلسن کے استفسارات کا تفصیلی جواب تحریر فرمایا تھا۔ یہ دونوں
چیزیں ۱۹۲۰ء کے ترجمہ کے شروع میں شایع ہوئی تھیں۔ اس کوشش کے باوجود اس
ترجمہ میں بہت سی غلطیاں رہ گئی تھیں۔ اور اکثر مقامات پر ان کی نوعیت ایسی تھی کہ اصل مطلب
بالکل سمجھ میں نہیں آسکتا تھا۔ شیخ محمد اشرف صاحب ناشر اسلامی لٹریچر لاہور نے اس کتاب کا
جدید ایڈیشن شایع کیا ہے۔ جسمیں ایسی ادبی غلطیوں کی تصحیح کردی ہے۔ جو پہلے ایڈیشن میں
مختلف مقامات پر نظر آتی تھیں۔ پہلا ایڈیشن قریب قریب نایاب تھا۔ اس جدید ایڈیشن
سے یہ کتاب پھر اربابِ ذوق کے لئے سہل الحصول ہوگئی۔ اس میں شبہہ نہیں کہ جیسا کہ پروفیسر
نکلسن کو خود اعتراف ہے۔ حضرت علامہ کے پیغام کی روح کو اہل مغرب بمشکل سمجھ سکتے ہیں۔

اس لئے ترجمہ میں اصل کی خوبی کہاں آسکتی ہے۔ لیکن انگریزی داں طبقہ کے لئے یہ ترجمہ مغتنمات میں سے ہے۔ جدید ایڈیشن کی طباعت۔ ٹایپ۔ کاغذ۔ جلد۔ نہایت عمدہ ہے۔ قیمت فی نسخہ تین روپیہ

۳۔ جدید جغرافیہ پنجاب

طنزیہ تنقید نگاری، فنِ صحافت کی نازک ترین صنف ہے۔ اس لئے مشکل ترین بھی۔ اور ابھی اس اسلوب تنقید سے قریب قریب ناآشنا ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں مزاح اور تمسخر میں تفریق ہی بمشکل کی جاتی ہے۔ زیرِ نظر کتاب اس باب میں شاید اولیں کوشش ہے۔ جسے بڑی حد تک کامیاب کہا جاسکتا ہے۔ شیرازہ کے مُدیر احسان کے سابقہ مطایبات نگار "سندباد جہازی" نے پنجاب کی سیاست کو جغرافیہ میں اور جغرافیہ کو ظرافت میں کچھ اس خوبی سے سمویا ہے کہ ہنستے ہنساتے تنقید کے گہرے نشتر ٹھیک نشانہ پر لگتے چلے جاتے ہیں۔ سیاست اور پھر پنجاب کی پُر پیچ و خم سیاست کو جغرافیہ کے خشک و محدود موضوع میں پیش کرنا بہت مشکل تھا۔ لیکن "جہازی" صاحب نے اس موضوع کو نہایت خوبی سے نبھایا ہے اور صرف الفاظ کی خوبی ہی نہیں، بلکہ اس نقاب پوش سیاست کو بڑی جرأت اور آزادی سے بے نقاب کیا ہے۔ البتہ "سکندر مونٹ" کے مرکزی سلسلہ کی حقیقت ابھر کر سطح پر نہیں آسکی۔ غالباً یہ اس لئے کہ یہ جغرافیہ اس کہسار کے دامن میں بیٹھ کر لکھا گیا ہے۔ اگر اٹک کے پار یا جمنا سے ادھر بیٹھ کر لکھا جاتا تو شاید اس سلسلہ کی طلسماتی وادیاں اور بھیانک غاریں زیادہ وضاحت سے سامنے آجاتیں۔ بہرحال کتاب بڑی دلچسپ اور مفید ہے۔ چونکہ سیاسی جغرافیہ جلد جلد بدل جانے والی چیز ہے۔ اس لئے اس میں ہر سال ترمیم و تنسیخ کی ضرورت لاحق ہوگی۔ اور ہمارا خیال ہے۔ کہ ہر سال اس کا جدید ایڈیشن چھپنا ضروری ہوگا۔ دو ایک جگہ پہ عُریانیت غالب آگئی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ کتاب اردو اکیڈیمی لوہاری گیٹ۔ لاہور کی طرف سے شایع ہوئی ہے چھوٹی تقطیع کے ۱۴۳ صفحات قیمت مجلد ایک روپیہ فی نسخہ

۴۔ گلبانگ حیات

یہ کتاب بھی اُردو اکیڈیمی۔ لاہور نے شایع کی ہے۔ سیالکوٹ کے ایک صاحب خان بہادر خواجہ محمد مسیح پال ہیں جو ایس حزیں تخلص فرماتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب انھی کے منظومات کا مجموعہ ہے۔ انھیں

حضرت علامہ اقبالؒ سے ہم وطن اور ہم استاد ہونے کی نسبت حاصل ہے۔ اور غالباً
اس جہت سے انھوں نے تصور کر لیا کہ وہ حضرتِ علامہؒ کے رنگ میں خوب لکھ سکتے ہیں۔
جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی چال بھی بھول گئے۔ چنانچہ یہ کتاب حضرت علامہؒ کی کتابوں کی
تقطیع اور انداز پر شائع ہوئی ہے۔ عنوانات بھی ان سے ملتے جلتے ہیں۔ مثلاً افکار۔ مقامات
شعور و وجدان۔ رہے نام اللہ کا۔ جہانِ خویش۔ ستارۂ صبح۔ واردات۔ آرزو۔ مقام محمود۔
لاالہ الا اللہ۔ نکات۔ معارف۔ تقدیر۔ قوانینِ خودی۔ شانِ انسان۔ رازِ کائنات۔ مکالمۂ شیطانؒ
باری تعالیٰ۔ مقامِ مردِ مومن وغیرہ۔ لیکن عنوانات کے لفظی اشتراک کے علاوہ حضرت علامہؒ
اور جناب امین حزیں کے کلام میں کوئی چیز بھی مشترک نہیں۔ اشتراک تو ایک طرف ان میں
کسی قسم کی باہمی نسبت ہی نہیں۔ جناب امین حزیں نے جو کچھ اور جتنا لکھا ہے۔ اسے تو چھوڑیئے
حضرت علامہ کی ایک مشہور غزل کا منظوم مفہوم بھی گلبانگِ حیات میں شامل ہے اس سے
اندازہ ہو جائے گا کہ ان ہر دو حضرات کے کلام میں کیا نسبت ہے۔ چند ایک اشعار
ملاحظہ ہوں۔

حضرت علامہ — بادمے نرسیدی۔ خدا چہ می جوئی — زخود گریختۂ۔ آشنا چہ می جوئی
امین حزیں — آدمی بن آدمی پہلے خدا مل جائیگا — آپ اپنا آشنا ہو۔ آشنا مل جائیگا
حضرت علامہ — دو قطرہ خونِ دل است انچہ مشک می نامند — تو اے غزالِ حرم در خطا چہ می جوئی
امین حزیں — خون دل ہی کے دو قطرے ہیں جنھیں کہتے ہیں مشک — تجھ کو اے آہوِ حرم ہی میں خطا مل جائیگا
حضرت علامہ — نظر ز صحبتِ روشن دلان بیفزاید — ز دردِ کم بصری توتیا چہ می جوئی
امین حزیں — عقل کے اندھے کہیں سے ڈھونڈھ روشن دل کوئی — اس کے ہاں سے تجھ کو تیرا مدعا مل جائیگا
حضرت علامہ — قلندریم و کراماتِ ما جہاں بینی است — ز ما نگاہ طلب۔ کیمیا چہ می جوئی
امین حزیں — میں قلندر ہوں جہاں بینی کرامت ہے مری — جز نگہ تجھ کو ہوس مجھ سے کیا مل جائیگا

یا مثلاً حضرت علامہ کا مشہور شعر ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

جناب آمین حزیں۔ تقدیر کے عنوان کے ماتحت ایک قطعہ میں فرماتے ہیں

فلک کو کوستے ہیں نالۂ شبگیر کرتے ہیں — جو پاداشِ عمل پر شکوۂ تقدیر کرتے ہیں
مکافاتِ عمل کا مسئلہ مشکل نہیں اتنا — یہ جنت ہو کہ دوزخ ہو ہمیں تعمیر کرتے ہیں

جناب امین حزیں تو اس کتاب کی اشاعت میں حق بجانب ہیں۔ کیونکہ انسان کے لئے اپنا آپ نقاد ہونا بہت مشکل ہی اور ایک شاعر کے نزدیک اپنا کلام "الہام" کی حیثیت رکھتا ہی۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کتاب کے مقدمہ نگار۔ جناب سر عبد القادر صاحب پر۔ جنھوں نے جناب امین حزیں کو ان کے کلام کی معنوی حیثیت سے آگاہ نہ کیا۔ اُنھیں چاہیئے تھا کہ جناب امین حزیں کو بتاتے کہ اقبال کا رنگ اس چیز کا نام نہیں کہ جو الفاظ اُنھوں نے استعمال فرمائے ہیں۔ اُنھیں اُلٹ پھیر کر اکٹھا کر دیا جائے بلکہ اقبال کی "شاعری" ہماری شاعری سے بالکل جداگانہ چیز ہے اور اُن کا رنگ اُنھی کے مقام پر پہنچ کر حاصل ہو سکتا ہی اور یہ آسان بات نہیں۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہی چمن میں دیدہ ور پیدا

کتاب بڑی عمدہ چھپی ہی۔ بڑی خوبصورت جلد۔ جسپر طلائی حروف میں نام بھی لکھا ہی جلد کی حفاظت کے لئے باریک گرد پوش بھی ہی۔ قیمت دو روپیہ فی نسخہ ہے۔

۵۔ قولِ احسن چالیس صفحہ کا ایک چھوٹا سا پمفلٹ۔ جس میں قرآن کریم کی روشنی میں بتایا گیا ہی کہ ہماری فرقہ بندی کس قدر غیر اسلامی ہی۔ مضمون غازی رحمت اللہ صاحب جالندھری کا لکھا ہوا ہی۔ جس کے آخر میں محمد اقبال سلمانی صاحب نے چار صفحہ کے تتمہ کا اضافہ کیا ہی۔ ۲ر میں دفتر اُمتِ مسلمہ۔ امرتسر (پنجاب) سے مل سکتا ہی۔

۶۔ علم حدیث حدیث کے متعلق علامہ اسلم صاحب جیراجپوری کا مضمون جو طلوعِ اسلام میں چھپ چکا ہے اور جس کا الگ پمفلٹ بھی شایع کیا گیا ہی۔ اُمتِ مسلمہ امرتسر نے پمفلٹ کی شکل میں شایع کیا ہی۔ قیمت درج نہیں ہی۔

۷۔ اسلامی انسائیکلوپیڈیا انسائیکلوپیڈیا۔ یا دائرۃ المعارف۔ ایک ایسی جامع کتاب کو کہتے ہیں جسمیں علوم و فنون کے متعلق معلومات ایک خاص ترتیب کے ساتھ جمع ہوں۔ اگرچہ اس قسم کی کتابوں کی ابتدا بھی مسلمانوں کی

لیکن آج ہماری یہ حالت ہوگئی ہے کہ اسلام کے متعلق دائرۃ المعارف کسی اسلامی ملک مسلمانوں کی جماعت کی طرف سے شایع نہ ہوا۔ بلکہ یورپ کے مستشرقین کی ایک جماعت نے برسوں کی محنت کے بعد "انسائیکلو پیڈیا اوف اسلام" شایع کیا۔ یہ انسائیکلو پیڈیا بالاقساط شایع ہوتا رہا اور ایک عرصہ کے بعد تکمیل کو پہونچا۔ اور اس میں شبہہ نہیں کہ اپنی جامعیت کے اعتبار سے دورِ حاضرہ میں یہ اپنی قسم کی ایک ہی کتاب ہے۔ اگرچہ جیسے کہ ظاہر ہے مستشرقین مغرب کی لکھی ہوئی ہے جو کتنے ہی بالغ نظر اور وسیع الظرف ہونیکے مدعی ہوں۔ اسلام کے متعلق ان کی تحریروں میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی کانٹا ضرور ہوگا۔ اور اگر کہیں ایسا نہ بھی ہو۔ تو بھی ان کی تحریریں اسلام کی صحیح رُوح سے عاری ضرور ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے انسائیکلو پیڈیا اوف اسلام پر اعتماد کلی تو نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن بایں ہمہ۔ اس میں معلومات کا ایک بحرِ بیکراں موجود ہے۔ ہماری نگاہیں مصر کے اربابِ علم و فضل پر تھیں کہ وہ اپنے طور پر اسلامی دائرۃ المعارف لکھیں گے۔ لیکن معلوم ہوا کہ انھوں نے اسی دائرۃ المعارف کے ترجمہ پر اکتفا کر لیا ہے۔ اور کہیں کہیں حواشی کا اضافہ کر دیا ہے۔ جب مصر والوں کی یہ حالت ہے کہ انھیں از خود دائرۃ المعارف لکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ تو ہندوستان میں اس کی کیا توقع کی جاسکتی تھی۔ یہاں تو اتنی بھی اُمید نہ تھی کہ اس کا ترجمہ ہی ہوجائے لیکن ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ جناب محمد عبدالمغیث صاحب نیموی نے اس کی ہمت کی اور اس ضخیم کتاب کا مسلسل ترجمہ شروع کر دیا ہے۔ تجویز یہ ہے کہ شروع میں ہر دو ماہ کے بعد سو صفحہ کا ایک حصّہ شایع کر دیا جائے۔ بعد میں اُسے ماہانہ بھی کر دیا جاسکتا ہے۔ حصّہ اول ہمارے سامنے ہے۔ انسائیکلو پیڈیا کا ترجمہ۔ مصر کے حواشی۔ اور بعض مقامات پر مزید اضافے اسمیں شامل ہیں۔ ہم جناب نیموی صاحب سے درخواست کریں گے کہ وہ دو تین اُمور کو ضرور پیش نظر رکھیں (۱) ترجمہ کرتے وقت عربی ترجمہ کے علاوہ اصل انگریزی بھی سامنے رہے۔ اور اصل کتاب میں جہاں جہاں جو چیز کھٹکتی نظر آئے وہاں وضاحت سے اس کی تردید کی جائے۔ اور اگر ضرورت ہو تو اس کے متعلق دیگر اربابِ علم و فضل سے بھی استصواب کر لیا جائے (۲) کاغذ ذرا مضبوط لگایا جائے اور متنِ کتاب میں

کوئی اشتہار نہ دیا جائے۔ کیونکہ یہ ماہانہ رسالہ نہیں۔ بلکہ ایک مستقل کتاب ہے
(۴) کتابت اور صاف ہونی چاہئے اور ترتیب میں وضاحت۔

ارباب ذوق سے درخواست ہے کہ وہ اس اقدام کا خیر مقدم کریں اور اس کی اشاعت میں مقدور بھر کوشش کریں تاکہ یہ عظیم الشان کام اختتام تک پہنچ جائے ہمارے سامنے اس کا پہلا حصّہ ہے جو جولائی ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا تھا۔ قاعدہ کے مطابق اس وقت تک اس کے بعد تین حصّے اور شائع ہو جانے چاہئے تھے۔ معلوم نہیں وہ شائع ہی نہیں ہوئے یا ہم تک نہیں پہونچے۔ قیمت فی حصّہ ۸ر سالانہ چندہ تین روپیہ۔ ناشر۔ جدید پریس۔ بیگم پور۔ پٹنہ سٹی۔

۸۔ دانائے راز

جذباتِ عقیدت جو جناب آغا نیر احمد خاں خاموش نے حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کی یاد میں صفحۂ قرطاس پر جمع کئے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس قسم کے محبت کے آنسوؤں کا صحیح مقام گوشہ تنہائی ہے۔ نمناک آنکھوں کو سرِ محفل لانا۔ ضبطِ محبت کی آبرو پر حرف لے آتا ہے۔

غم دل نگفتہ بہتر ہمہ کس جگر نہ دارد

دوسروں کے لئے وہی چیز وجہ دلکشی ہو سکتی ہے جسمیں ان کے لئے افادیت کا کوئی پہلو نمایاں ہو۔ ۵۶ صفحہ کی کتاب (بلا جلد) ۱۲ر میں دائرۃ الادب اُردو لودیانہ (پنجاب) سے مل سکتی ہے۔ جناب مصنف ارباب عقیدت میں تحفۃً پیش کرتے تو زیادہ اچھا تھا۔

۹۔ تعلیمات اقبال

حضرت علامہؒ کے وفات کے بعد ان کے کلام اور سیرت کے متعلق بے شمار کتابیں شایع ہو چکی ہیں۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج تک کوئی معیاری کتاب سامنے نہیں آئی۔ زیر نظر کتاب سے توقع تھی کہ شاید اس کمی کو پورا کر دے۔ لیکن اس سے بھی صرف اتنا ہی ہو سکے گا کہ جن لوگوں نے کلام اقبال کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا۔ ان کے لئے ابتدائی تعارف کا کام دے۔ اصل کتاب سے زیادہ اچھا وہ مختصر سا چھ صفحہ کا پیش لفظ ہے جو جناب عبد المجید صاحب سالک نے سپرد قلم فرمایا ہے۔ مولف کتاب۔ پروفیسر محمد یوسف سلیم چشتی۔ نے دیباچہ میں لکھا ہے

کہ ان کا ارادہ ہی کہ اس قسم کی دس ایک کتابیں اور بھی لکھیں گے۔ ہم جناب سالک کیساتھ اس دعا میں شریک ہیں کہ "اللہ تعالیٰ پروفیسر صاحب کے سینہ کو فہم حقائق کے لئے کھول دے"

ہم نے نقد و نظر کے شروع میں لکھا ہی کہ مسلمانان ناشرین کی طرف سے جو کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ ان کی قیمت بالعموم بہت زیادہ رکھی جاتی ہی۔ زیر نظر کتاب اسکی زندہ مثال ہی۔ عام سائز کے ۱۳۵ صفحہ کی کتاب اور بلا جلد قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ اگر حضرت علامہؒ کے نام کو بیچنا نہیں تو اور کیا ہی۔ حضرت علامہ پرانے زمانے میں ہوتے تو لوگ قبر کے مجاور بنتے۔ اس روشنی کے زمانہ میں مجاوری کی یہ جدید شکل پیدا ہو گئی ہی۔

نئے جال لائے پرانے شکاری

کتاب اقبال اکیڈیمی۔ ظفر منزل۔ تاج پورہ۔ لاہور سے مل سکتی ہی۔

رسید کتب

مطالعۂ حدیث۔ تنقید صحیح کی روشنی میں۔ از سید مقبول احمد صاحب بی۔ اے۔ شائع کردہ "امت مسلمہ امرتسر"۔ قیمت عہ

رسائل

سیاست:۔ ہمارے ہاں ایسے رسائل کی بہت کمی ہی۔ جن میں اعلیٰ پایہ کے تحقیقاتی مضامین شائع ہوں۔ زیر نظر رسالہ اس کمی کو بڑی حد تک پورا کرے گا۔ سہ ماہی رسالہ ڈاکٹر یوسف حسین خانصاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ۔ حیدرآباد کی زیر ادارت شائع ہوتا ہی۔ جو اسے نہایت سلیقہ سے ترتیب دیتے ہیں۔ اور کوشش کرتے ہیں۔ کہ اعلیٰ پایہ کے مضامین شائع ہوں۔ لیکن ہمارے ہاں چونکہ ابھی اچھا لکھنے والوں کی کمی ہی۔ اس لئے ہر مضمون ایک ہی پایہ کا نہیں مل سکتا۔ بایں ہمہ جو اہلِ ذوقِ علمی۔ تحقیقاتی مضامین سے دلچسپی رکھتے ہوں ان کے لئے یہ رسالہ قابل قدر ہی۔ اس ضمن میں ہم رسالہ کے ارباب حل و عقد سے ایک درخواست ضروری سمجھتے ہیں اور وہ یہ کہ تحقیقات کے میدان میں "فی کل وادی یہیمون" کے بجائے ایک خاص نصب العین کے ماتحت تحقیقاتی مضامین شائع

کئے جائیں۔ اور یہ ظاہر ہی کہ ایک اسلامی رسالہ کے لئے قیامِ حکومتِ الٰہیہ سے بڑھکر اور کونسا نصب العین موزوں تر ہو سکتا ہی۔ ہم نے اس مشورہ کی جرأت اس لئے بھی کی ہے کہ اس باب میں جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کے خیالات نہایت پختہ نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ان کا مضمون۔ طلوعِ اسلام کی اشاعت رواں میں بھی شائع ہو رہا ہی۔ طباعت۔ کتابت۔ کاغذ عمدہ۔ ناشرین۔ سید عبدالقادر اینڈ سنز۔ چارمینار حیدرآباد (دکن) سے بہ قیمت ۸؍ فی پرچہ اور پانچ روپیہ سالانہ مل سکتا ہی۔
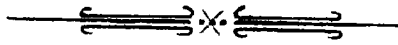
لمعات

اشاعتِ زیرِ نظر میں "حقائق و عبر" بھی شامل نہ ہو سکے۔ اور "لمعات" کے تحت بھی اعتدال سے زیادہ کچھ نہیں لکھا جا رہا۔
ملکی کوتاہیں افسوس ہے۔ لیکن اس ماہ کچھ ایسے معاملات سامنے آگئے کہ ہم ان عنوانوں کی طرف توجہ نہیں دے
۔ اپریل میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوگا۔ اس سلسلہ میں ان ہر دو عنوانوں پر تفصیلاً لکھا جائے گا۔
ناءاللہ العزیز۔ اور یوں اشاعتِ رواں کی کمی آئندہ پرچہ میں پوری ہو جائے گی۔

فروری کی اشاعت میں "قیاس کن تو کجائی و من کجا واعظ" کے عنوان سے جو مضمون شائع ہوا۔ اسے
ص طور پر قبولیت حاصل ہوئی۔ بعض احباب نے لکھا ہے کہ اس کا کوئی مختصر سا عنوان تجویز کرکے اسے الگ
فلٹ کی شکل میں شائع کیا جائے۔ سردست اس فرمائش کی تعمیل مشکل ہے۔ البتہ جو احباب اس کی اشاعت
ہتے ہوں۔ وہ فروری کا پرچہ طلب فرما دیں جو نصف قیمت (۴) میں بھیج دیا جائے گا۔ حوالہ کے لئے
واجی حکومت لکھ دینا کافی ہوگا۔

معارف القرآن کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں اکثر احباب نے مختلف تجاویز ارسال فرمائی ہیں جن
کے لئے ہم ان کے بصمیمِ قلب سپاس گزار ہیں۔ کتاب کی اشاعت کے وقت
شاءاللہ ان تجاویز کو زیرِ نظر رکھا جائے گا۔

ہفتہ میں دو بار
جدت مراد آباد
ہندوستان کا بہترین سستا اور کثیر الاشاعت اخبار ہے
اسکی خریداری کیلئے مسٹر محمد علی جناح، مسٹر فضل الحق وزیر اعظم بنگال. آنریبل سر سکندر حیات خان وزیر اعظم پنجاب. راجہ صاحب محمود آباد و دیگر لیڈران مسلم لیگ نے زبردست اپلیں شائع کی ہین
جدت دلکش نظموں بہترین جنگی تبصروں بلند پایہ افسانون کا مجموعہ
اعلی سیاسی مضامین کا گنجینہ اور جنگ کی تازہ ترین خبرون کا خزینہ ہے!
یہ اخبار پہلے ہفتہ وار تھا۔ یہ اخبار نیا نہین ہے بلکہ پرانا ہے اسکی تیرھوین جلد ہے اس اخبار کی
اڈیٹری کیلئے ملک کے ایک ایسے مایہ ناز اہل قلم و انشاپرداز گریجوٹ کی خدمات
حاصل کی گئی ہین جو کئی روزانہ اخبارات کو ایڈٹ کر چکے ہین۔
جدت کی قیمت ہم نے باوجود گرانی کاغذ وغیرہ کے بجائے چھ روپیہ کے صرف پانچ روپیہ سالانہ اور ۱۲/۔ ششماہی اور عہ سہ ماہی مقرر کی ہے۔ شائقین اصحاب فوراً قیمت روانہ فرماکر جاری کرین ایجنٹ صاحبان کو پچیس فیصدی کمیشن دیا جاویگا۔ چونکہ یہ اخبار بوجہ علمبرداری لیگ کے کثیر الاشاعت ہے اسلئے مشتہرین کیلئے بہت منفعت بخش ہے
منیجر
اخبار جدت مراد آباد پرنس روڈ

مضامین و خطوط محمد علیؒ

قوم زندہ ہوتی تو محمد علی اسوقت پج رہے ہوتے۔ اُن کی تحریر کا ایک ایک لفظ محفوظ اور ملّت کے نوکِ زبان ہوتا۔ اب تو سرور صاحب کا یہی احسان بہت ہی کہ انھوں نے زحمت گوارا کر کے ہمدرد کے فائلوں کو پڑھا اور محنت کر کے ان میں سے انتخابات کئے پھر اُنھیں خوش سلیقگی کے ساتھ مرتب کر کے شائع کر دیا۔

مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی،

یہ کتاب اس مجسمہ کرم، اسلام کے عاشق، ملک و قوم کے شیدا۔ سیاست کے ماہر، علوم مشرقی و مغربی کے فاضل اور نڈر مجتہد کے لاجواب مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس کے مرتب پروفیسر محمد سرور صاحب ہیں۔

جناب رازق الخیری صاحب

پروفیسر محمد سرور صاحب نے یہ ایک بڑی خدمت انجام دی ہی کہ مولانا محمد علی مرحوم کے مضامین مرتب کئے۔ ابوالکلام اور اقبال اس دور کے دماغ تھے۔ مگر محمد علی اس کا دل تھا اور بڑا ہی متحرک۔ ہم اسکی تحریروں میں اسکی شخصیت کو بالکل بے پردہ دیکھ سکتے ہیں

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

مضامین محمد علی۔ حصّہ اول۔ قیمت عہ

〃 〃 حصّہ دوم 〃 عہ

خطوط محمد علی . . . . عہ

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ، دہلی

مقدمۂ زندگانیٔ محمدؐ

عہدِ حاضر کی ایک بے مثال کتاب

"زندگانیٔ محمدؐ" علامہ محمد حسین ہیکل وزیر تعلیم مصر کی ایک لاجواب تالیف ہے۔ اس کتاب کی قدر و عظمت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے پہلے ایڈیشن کی تین ہزار جلدیں پریس ہی میں فروخت ہوگئی تھیں اور باقی سات ہزار جلدیں صرف تین ماہ کے اندر اندر ختم ہوگئیں۔ پھر ایران میں اس کا فارسی ترجمہ ہوا اور وہاں بھی ہزارہا کی تعداد میں شائع ہوئی۔ اب دفتر اُمّتِ مسلمہ امرت سر نے مقدمۂ "زندگانیٔ محمدؐ" کا اُردو ترجمہ شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں قرآن مجید کی ترتیب اور پیغمبر اسلام کی مقدس زندگی پر اہلِ مغرب کے تمام اعتراضات کے نہایت مدلّل اور معقول جواب دیے گئے ہیں۔ اس کے متعلق مشاہیر و جرائد کے چند تبصروں کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:

۱۔ زندگانیٔ محمدؐ ایک قابلِ قدر تالیف ہے۔ (اعلیٰ حضرت فرماں روائے مانگرول)

۲۔ زندگانیٔ محمدؐ کا مقدمہ عالمانہ معلومات سے پُر ہے۔ میں نے اس کتاب کو دیکھتے ہی شوق سے پڑھا اور دلچسپ پایا۔ (سر عبدالقادر)

۳۔ بہت اچھی کتاب ہے اور بہت اچھا ترجمہ۔ (ڈاکٹر ذاکر حسین پرنسپل جامعہ ملیہ، دہلی)

۴۔ جہاں تک مغرب زدہ گروہ کی پریشان خیالیوں کا تعلق ہے، مصنف کی کوششیں مستحق اجر و قابلِ داد ہیں۔ (مولانا عبدالماجد دریابادی)

۵۔ اس کتاب میں کلام اللہ کی صحت کے اہتمام، اس کی تدوین کی تاریخ اور مستشرقین کی تحقیقات کے بارے میں مفید معلومات ہیں۔ (معارف)

۶۔ علامہ محمد حسین ہیکل کی کتاب (زندگانیٔ محمدؐ) یقیناً ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ (طلوعِ اسلام)

۷۔ کتاب کا اصل مقصد سیرتِ نبویؐ سے مستشرقین کے بعض الزامات کو رفع کرنا ہے اور اس مقصد میں مصنف کو خاصی کامیابی ہوئی ہے۔ (صدق)

۸۔ کتاب بڑی تحقیق اور کاوش سے لکھی گئی ہے۔ مسلمانوں کو اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ (شاعر)

۹۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے اس کا مطالعہ ازبس مفید ہے۔ (جامعہ)

۱۰۔ جو نوجوان اسلام اور پیغمبر اسلام کو اہلِ مغرب کی نظر سے دیکھتے ہیں، اُن کے لیے اس پاکیزہ کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ (حمایتِ اسلام)

لکھائی، چھپائی اور کاغذ ستھرا۔ ضخامت ۱۲۸ صفحے۔ ۱۳ ار ٹکٹوں کی صورت میں یا بذریعہ منی آرڈر بھیج کر ایک نسخہ طلب کیجیے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا

ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

دورِ جدید

مرتب	بدل اشتراک	
اخوندزادہ حسین امام	ششماہی	پانچ روپیہ (سالانہ)
جلد (۴) شمارہ (۱۱)	فی پرچہ	تین روپے
		آٹھ آنے

شوال المکرم ۱۳۶۰ھ مطابق نومبر ۱۹۴۱ء

فہرست مضامین

طلوعِ اسلام

لمعات

رمضان المقدس

رمضان المقدس کا مہینہ اپنی تمام عظمتوں اور برکتوں کو ساتھ لے کر آیا اور چلا گیا۔ اس گئے گذرے زمانہ میں بھی جس پابندی، اہتمام اور حسنِ عقیدت سے مسلمان اس کٹھن منزل کو کشادہ پیشانی سے طے کرتے ہیں دنیا کی کسی دوسری قوم میں اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ غور فرمایئے۔ سال بھر تک کھانے پینے کا ایک خاص نظام متعین ہوتا ہے لیکن ایک شام جب نیا چاند رمضان کی آمد کی اطلاع دیتا ہے تو یکلخت یہ پورے کا پورا نظام بدل دیا جاتا ہے اور یوں یہ ملتِ حنیفہ ساری دنیا سے متمیز ہو کر الگ نظر آنے لگ جاتی ہے۔ پورا مہینہ دن بھر کی بھوک اور پیاس اور شب بھر کی تسبیح و تہلیل میں گذار دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد لیکن نتائجِ عظیم پر یہ انقلاب آفریں مرحلہ ختم ہو جاتا ہے۔

دنیا کی ہر قوم کے لئے سال بھر میں ایسے دن آتے ہیں جنہیں وہ قوم اپنے قومی تیوہار سمجھ کر مناتی ہے۔ ان تیوہاروں کی تقاریب اور ان کے منانے کے انداز و طریق کو سامنے رکھئے اور اس کے بعد ان کا اس اسلامی تیوہار کے ساتھ مقابلہ کیجئے تو بادنیٰ تدبر یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ اسلام اور دیگر ادیانِ عالم میں کیا فرق ہے؟ غور فرمایئے کہ یہ تیوہار کس تقریب کی یاد میں منایا جاتا ہے؟ کسی انسان کی یادگار نہیں۔ موسموں کے تغیر و تبدل کی خوشی میں نہیں۔ دیوی دیوتاؤں کے افسانوی قصوں کی یاد میں نہیں۔ بلکہ تقریب یہ ہے کہ اس مہینے میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رشد و ہدایت کے لئے وہ ضابطۂ قوانین مرحمت فرمایا جو ان کے لئے دنیا اور آخرت کی سرفرازیوں اور سربلندیوں کا ذریعہ اور نظامِ زندگی کا محور قرار دیا گیا ہے۔ کیا دنیا کی کسی دوسری قوم میں اس کی نظیر مل سکتی ہے کہ اس قسم کی تقریب کی یادگار میں تیوہار منایا جاتا ہے۔ اس کے بعد تیوہار منانے کے انداز پر غور کیجئے تو وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ روزے کے کیا فوائد ہیں۔ اس کا فلسفہ کیا ہے! اس کے متعلق آپ نے بہت کچھ پڑھا اور سنا ہوگا۔ لیکن ہم کہتے ہیں انسانوں کے بتلائے ہوئے فوائد اور مصالح

فلسفہ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ جس حکیم مطلق نے یہ فریضہ عائد کیا ہے خود اسی نے بتادیا ہے کہ ان کی علت کیا ہے اور ان سے مقصود کیا ؟ قرآن کریم کا اپنے احکام کے بارے میں ایک خاص انداز ہے۔ وہ ایک حکم دیتا ہے تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتادیتا ہے کہ اس حکم کی تعمیل سے کیا کیا نتائج مرتب ہونگے وہی نتائج اس حکم کی علت اور مقصود ہوتے ہیں۔ اس سے دو فائدے سامنے آجاتے ہیں۔ ایک تو یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ اس حکم کی غایت کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہم نے صحیح معنوں میں اس کی تعمیل بھی کی ہے یا نہیں ؟ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک طبیب آپ کے مرض کی تشخیص کرتا ہے اس کے بعد نسخہ تجویز کرتا ہے اور بتادیتا ہے کہ اس کے استعمال سے کیا نتائج مرتب ہونگے۔ اب اگر طبیب کی حذاقت پر ایمان ہو نسخہ کی صحت کا یقین ہو۔ دوائی بالکل صحیح ہو۔ استعمال ہدایت کے مطابق ہو۔ تو اس کا لازمی نتیجہ وہی ہونا چاہئے جو طبیب نے بتایا تھا۔ اگر یہ نتائج مرتب نہیں ہوتے تو آپ کو لامحالہ سوچنا ہوگا کہ کہاں نقص رہ گیا ہے ؟ کون سی کمی واقع ہوگئی ہے ؟ قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ نسخہ تجویز کرنے کے بعد واضح الفاظ میں بتادیتا ہے کہ اس کے استعمال کے بعد کس قسم کے نتائج مرتب ہونگے۔ اگر وہ نتائج ویسے ہی مرتب ہوئے ہیں تو سمجھ لیجئے کہ نسخہ کا استعمال صحیح ہو رہا ہے۔ لیکن اگر نتائج میں فرق ہے تو ہمیں یقیناً یہ ماننا پڑیگا کہ نسخہ صحیح طور پر استعمال نہیں ہو رہا۔ روزہ کے متعلق قرآن کریم نے واضح طور پر بتادیا کہ

(۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ ۲/۱۸۳

اے ایمان والو! تمہارے اوپر روزے فرض کئے گئے ہیں جیسے اُن لوگوں پر فرض کئے گئے تھے جو تم سے پہلے ہو گذرے ہیں۔ تاکہ تم تقویٰ شعار بنو

(۲) وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ۔

تاکہ جو کچھ تمہیں اللہ نے ہدایت کی ہے اس پر اس کی بڑائی کا اعلان کرو

(۳) وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ..... اور تاکہ تم شکر گذار بنو

یعنی روزے اس لئے فرض کئے گئے ہیں کہ (۱) تم تقویٰ شعار بنو (۲) شکر گذار بنو اور (۳) اللہ کے نام کی عظمت کو بلند کرو۔ اگر تمہارے روزوں سے یہ نتائج مرتب ہوتے ہیں تو سمجھ لو کہ روزے قرآنی منشاء کے مطابق

رکھے جاتے ہیں اور اگر یہ نتائج برآمد نہیں ہوتے تو ہمارے اس عمل میں کہیں نقص رہ جاتا ہے۔

تقویٰ، تشکر اور تکبیر (خدا کے نام کی بڑائی) بڑے جامع الفاظ ہیں۔ جن کی تشریح قرآن کریم کے مختلف مقامات پر ملے گی۔ ان کے متعلق استیعاباً لکھنے کی تو گنجائش نہیں۔ چند اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے جن سے ہم یہ دیکھ سکیں گے کہ ان خصوصیات کا مفہوم کیا ہے اور ان سے کس قسم کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

پہلے یہ دیکھئے کہ جب انسان میں تقویٰ پیدا ہو جاتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

(۱) اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ ۱۰/۶۲-۶۳

آگاہ رہو کہ یقیناً جو اللہ کے فرمانبردار ہیں ان کے لئے نہ کسی قسم کا خوف ہوتا ہے نہ غمگینی۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ ایمان لائے اور تقویٰ شعار رہے۔

یعنی تقویٰ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان کے دل میں کسی قسم کا خوف و حزن نہ رہے۔

(۲) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

اے ایمان والو! اگر تم خدا سے تقویٰ کی زندگی بسر کرو تو وہ تمھیں ایک امتیازی زندگی عطا کرے گا اور تم سے تمھاری برائیاں دور کر دے گا اور (تمھاری لغزشیں) معاف کر دیگا۔ اور اللہ تو بہت بڑا فضل کرنے والا ہے۔

یعنی تقویٰ کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ اس قوم کو ایک امتیازی زندگی عطا ہو یعنی ایسی زندگی جس میں تمکن فی الارض حاصل ہو۔

(۳) وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِى الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ؕ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ ۱۲/۵۶-۵۷

اور اس طرح ہم نے یوسف کو تمکن فی الارض عطا فرمایا کہ جس جگہ چاہے حسب مرضی کام میں لائے

ہم جسے چاہتے ہیں (اس طرح) اپنی رحمت سے نوازتے ہیں اور ہم نیک عملوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتے۔ اور جو لوگ ایمان لائے ہیں اور تقویٰ کی زندگی بسر کرتے ہیں ان کے لئے (اس کے علاوہ) آخرت کا اجر کہیں بہتر ہے۔

یعنی دنیا میں تمکن فی الارض اور آخرت میں جنت کی زندگی یہ ہے تقویٰ کا لازمی نتیجہ۔ اور چونکہ روزوں کا مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں میں تقویٰ پیدا ہو اس لئے روزے ذریعہ ہیں اس مقصد کے حصول کا کہ مسلمانوں کو ایک امتیازی زندگی حاصل ہو۔ ایسی زندگی جس میں کسی قسم کا خوف و حزن نہ ہو۔ دنیا میں حکومت و تمکن حاصل ہو اور آخرت میں سرفرازی و سعادت۔

روزوں کی دوسری غایت یہ بتائی گئی ہے کہ تم شکر گزار رہو۔ (لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ) شکر بھی ایک جامع اصطلاح ہے جس کا قرآنی مفہوم سمجھانے کے لئے فرصت درکار ہے۔ مجملاً یوں سمجھئے شکر سے مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ قوتوں اور نعمتوں کو اسی کے متعین فرمودہ مقاصد کے لئے صرف کرنا ان قوتوں اور نعمتوں کا شکر ہے۔ دنیا میں انسان کے لئے مال، اولاد اور جان عزیز ترین متاع ہیں۔ لیکن ایک عبد مومن ان میں سے کسی چیز کو بھی اپنی ملکیت نہیں سمجھتا۔ اس کا ایمان یہ ہے کہ یہ سب کچھ اللہ کی ملکیت ہے اور ایک وقت معینہ تک کیلئے اس کے پاس بطور امانت رکھا ہے۔ مالک کی طرف سے جب اشارہ پائے، وہ جہاں کہے انہیں لاکر حاضر کر دے۔ یہ ہے شکر۔ لیکن خدا کے ہاں داد و ستد کے تو انداز ہی نرالے ہیں۔ مال، اولاد، جان سب کچھ اسی کا عطا فرمودہ ہے۔ اس نے انہیں "اپنے لئے" لے کر کیا کرنا ہے۔ وہ ہم سے ہمارے ہی لئے لیتا ہے اور پھر انہیں دگنا، چوگنا، سات سو گنا کر کے ہمیں ہی واپس دے دیتا ہے۔ مال لیتا ہے کہ اسے صحیح طریق پر بڑھا جائے۔ اور جان لیتا ہے تو اس لئے کہ موت کے بدلے حیات عطا فرمائے۔ سورۂ بقرہ کے بتیسویں رکوع میں بنی اسرائیل کے تذکرے میں اسی حقیقت عظمیٰ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جب فرمایا:۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ۭ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۠ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ ۲ ۲۴۳-۲۴۵

کیا تم نے ان لوگوں کی سرگذشت پر غور نہیں کیا جو اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے تھے اور باوجودیکہ ہزاروں کی تعداد میں تھے مگر (دلوں کی بے طاقتی کا یہ حال تھا) کہ موت کے ڈر سے بھاگ گئے تھے۔ (جب ان بزدلوں نے یوں ہمت ہار دی) تو اللہ کا حکم ہوا کہ (تم موت کے ڈر سے بھاگ نکلے ہو تو دیکھو) اب تمہارے لئے موت ہی ہے (یعنی ان کی بزدلی کی وجہ سے دشمن ان پر غالب آگئے۔ اور وہ زندگی سے محروم ہو گئے) پھر اللہ نے انھیں زندہ کر دیا۔ (یعنی عزم و ثبات کی روح ان میں عود کر آئی۔ اور دشمنوں کے مقابلے کیلئے کھڑے ہو گئے اور فتحمند رہے) یقیناً اللہ انسان کے لئے بڑا ہی فضل رکھنے والا ہے۔ لیکن اکثر آدمی ایسے ہیں کہ وہ شکر گذار نہیں ہوتے۔ (شکر گذاری کا طریق یہ ہے کہ) اللہ کی راہ میں (جنگ پیش آجائے تو موت سے نہ ڈرو۔ بے خوف ہو کر) لڑو۔ اور یقین رکھو کہ اللہ سب کچھ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے (یہ جان کا شکر ہے اور مال کا شکر؟) کون ہے جو خدا کو خوش دلی کے ساتھ قرض دیتا ہے تاکہ خدا اس کا قرض دوگنا سوگنا زیادہ ادا کرے (یاد رکھو) تنگی اور کشایش اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور اُس کی طرف تم سب کو لوٹنا ہے۔

یہ تو بنی اسرائیل کے واقعہ کے ضمن میں فرمایا۔ خود مسلمانوں سے ارشاد ہوا کہ ذرا سوچو کہ مکی زندگی میں تمہاری کیا حالت تھی؛ پھر جب تم نے اللہ کا شکر ادا کیا یعنی اُس کی عطا فرمودہ قوتوں کو اس کی راہ میں صرف کرنے کے لئے بدر و حنین کے میدانوں میں لاکھڑا کیا تو اس کے بعد حالت کیا سے کیا ہو گئی۔ فرمایا

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ ۸/۲۶

اور وہ وقت یاد کرو جب (مکہ میں) تمھاری تعداد بہت کم تھی اور تم ملک میں کمزور سمجھے جاتے تھے۔ تم اس وقت ڈرتے تھے کہ کہیں لوگ تمھیں اچک کر نہ لے جائیں پھر اللہ نے تمھیں ٹھکانہ عطا فرمایا۔ اپنی نصرت سے قدرت بخشی اور اچھی چیزیں دے کر رزق کا سامان مہیا کر دیا۔ تاکہ تم شکر گذار رہو!

یعنی تقویٰ اور شکر گذاری ہی کا نتیجہ تھا کہ اس ضعف و ناتوانی کی زندگی کے بعد یہ شوکت وعظمت کی زندگی عطا فرمائی۔ اور اس شوکت وعظمت کو اس لیے عطا فرمایا گیا کہ ان قوتوں کو تم پھر اسی کی راہ میں صرف کرو۔ یعنی (اگلی آیت ہے)

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ ۸ - ۲۸

مسلمانو! ایسا نہ کرو کہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت کرو۔ اور اپنی امانات میں بھی خیانت نہ کرو (یعنی مال۔ اولاد۔ جان جو تمھارے پاس بطور امانت رکھے گئے ہیں انھیں خدا کی راہ میں لا کر حاضر کرو) اور تم اس بات سے ناواقف نہیں ہو۔

اور یاد رکھو! تمھارا مال اور تمھاری اولاد (تمھارے لئے) ایک آزمائش ہے۔ یہ نہ بھولو کہ اللہ ہی ہے جس کے پاس بہت بڑا اجر ہے۔

روزے اس لئے فرض کئے گئے ہیں کہ تم شکر گذار رہو اور شکر گذاری کا عملی ثبوت یہ ہے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ جب اس طرح شکر کیا جائے تو اس کے نتائج وہی ہونگے جن کی تفصیل اوپر کی آیاتِ مقدسہ نے بیان کی ہے۔ یعنی ضعف و ناتوانی کی جگہ قوت اور صحت اور بے سروسامانی کی جگہ تمکن و تسلط۔ روزے انہی مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔

لیکن یہ قوت و ثروت۔ جاہ و حشمت۔ تمکن و تسلط۔ مال و متاع اس لئے نہیں کہ تم دنیا میں فرعونیت

اختیار کر جاؤ اور دوسرے انسانوں کو اپنا غلام بناؤ۔ بلکہ اس لئے کہ دنیا میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا غلام نہ رہے اور پلیسیت اور فرعونیت کا خاتمہ ہو جائے۔ دنیا میں حکومت صرف اللہ کی قائم ہو۔ بڑائی صرف اسی ایک کے لئے رہ جائے اور کوئی بڑا نہ ہو۔ حکم اسی کا چلے۔ قانون اسی کا نافذ ہو۔ کبریائی اسی کے لئے وقف ہو جائے۔ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (تاکہ اللہ نے جو تمھیں ہدایت عطا فرمائی ہے تو تم اس پر اس کے نام کی بلندی قائم کرو)۔ یہ بڑائی کس طرح قائم ہوگی! اس کی تفصیل سورۂ حج میں ملاحظہ فرمائیے۔ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ کے بعد فرمایا۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ۟

جو لوگ ایمان لاتے ہیں یقیناً اللہ ان کی مدافعت (ومحافظت) کرتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ امانت میں خیانت کرنے والوں کو کہ وہ کفرانِ نعمت کر رہے ہیں کبھی پسند نہیں کرتا۔

خدا کے نام کو بلند کرنے والوں۔ اس کی حکومت کو دنیا میں قائم کرنے والوں کے متعلق خدا کا یہ وعدہ ہے کہ وہ ان کی مدافعت کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ وہ (۱) اپنی امانات میں خیانت نہ کریں اور (۲) شکر گذار رہیں۔ یعنی وہی حضرات جن کا ذکر سورۂ انفال کی مذکورہ صدر آیاتِ جلیلہ میں آچکا ہے۔

یہ مدافعت کے سامان کیسے ہوتے ہیں؟ اگلی آیت میں فرمایا

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ $\frac{22}{39-40}$

جن (مومنین) کے خلاف ظالموں نے جنگ کر رکھی ہے اب انھیں بھی جنگ کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ ان پر ظلم ہو رہا ہے اور اللہ ان کی مدد کرنے پر ضرور قادر ہے۔ یہ وہ مظلوم ہیں جو ناحق اپنے گھروں سے نکال دیے گئے صرف اس جرم کی پاداش میں کہ وہ کہتے تھے کہ اللہ ہمارا پروردگار ہے

اور دیکھو اگر اللہ بعض لوگوں کے ہاتھوں دوسروں کی مدافعت نہ کرتا رہتا تو کسی قوم کی عبادت گاہ زمین پر محفوظ نہ رہتی۔ خانقاہیں۔ گرجے۔ عبادت گاہیں مسجدیں جن میں کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے سب ڈھائے جا چکے ہوتے (یاد رکھو) جو کوئی اللہ (کے نظام) کی حمایت کرے گا ضروری ہے کہ اللہ بھی اس کی مدد فرمائے۔ کچھ شبہ نہیں یقیناً وہ قوت رکھنے والا سب پر غالب ہے۔

لیکن یہ اجازت فقط مدافعت کے لئے نہیں بلکہ تمکن کے لئے ہے۔ اس تمکن کے لئے جس کا لازمی نتیجہ مظلوموں کی حفاظت حقیقی مساوات و حریت اور خدا کی عظمت و کبریائی کا اعلان ہے۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ○ ۲۲/۴۱

یہ مسلمان وہ ہیں کہ اگر ہم نے دنیا میں انھیں صاحبِ اقتدار کر دیا تو وہ نماز (کا نظم) قائم کریں گے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی میں سرگرم رہیں گے۔ معروف (یعنی احکام الٰہیہ) کا حکم دیں گے اور منکر (یعنی نواہی) سے روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ پہلے پہل یہ اجازت کب ملی اور اس پر عمل کس وقت ہوا تھا؟ جب پہلی مرتبہ رمضان کے روزے فرض ہوئے ہیں تو اس رمضان کی سترہ تاریخ کو بدر کے میدان میں حق و باطل کا یہ معرکہ رزم آرا ہوا اور وہاں مومنین کی اس تقویٰ شعار اور شکر گزار مٹھی بھر جماعت نے بتا دیا کہ روزوں کا مفہوم کیا ہے اور کس طرح اللہ کے نام کی بلندی کا اعلان کیا جاتا ہے! اور اس اعلان کا نتیجہ؟ وہی جو تقویٰ اور شکر گزاری کا نتیجہ بتایا گیا ہے! نہیں! بلکہ وہی جو روزوں کا نتیجہ بتایا گیا ہے۔ یعنی ایسی زندگی جس میں کسی قسم کا خوف و حزن نہ ہو۔ وہ زندگی جس میں امتیاز و سرفرازی حاصل ہو۔ وہ زندگی جس میں تمکن فی الارض ہو۔ غلبہ و حکومت کی زندگی۔ جاہ و حشمت کی زندگی عزت و وقار کی زندگی۔ یعنی اس زمین پر خلافتِ الٰہیہ کی زندگی یعنی صحیح مومن کی زندگی۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ تمام مقاصدِ حیات اور ان کا حصول محض صدرِ اول کے مسلمانوں تک ہی محدود تھے؟ ایسا تو نہیں ہو سکتا۔ اگر یہی صورت ہوتی تو پھر نہ قرآن کریم کی قیامت تک کے لئے ضرورت تھی نہ اس کی حامل جماعت کی

جب زندگی اور اُس کے تمام مسائل۔ حق و باطل کی کش مکش۔ خیر و شر کی آویزش اس وقت تک باقی ہے جب تک دُنیا میں انسان موجود ہے تو پھر قرآن کریم کے ان احکامات سے آج بھی وہی مفہوم ہے جو آج سے چودہ سو سال پیشتر تھا۔ اس نسخۂ جلیلہ کے نتائج آج بھی وہی مرتب ہونے چاہئیں جو قرنِ اوّل میں ہوتے تھے۔ لیکن کیا آج ایسا ہو رہا ہے؟ اس کا جواب کسی اور سے نہیں خود اپنے آپ سے پوچھئے! تین سو تیرہ نفوس۔ انہی نماز اور روزوں کے ذریعے ساری دُنیا پر چھاگئے۔ لیکن آج چالیس کروڑ سے زائد مسلمان ساری دنیا میں پھیلے ہوئے۔ نماز بھی پڑھتے ہیں اور روزے بھی رکھتے ہیں۔ لیکن خدا کی یہ زمین اپنی تمام وسعتوں کے باوجود ان پر تنگ ہو رہی ہے! کیا نسخہ کے صحیح استعمال سے بیمار کی یہی حالت ہونی چاہئے تھی! لیکن مصیبت یہ ہے کہ مسلمان نے یہ سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے کہ قرآن کریم نے اعمال کے نتائج واضح اور غیر مبہم الفاظ میں بیان ہی اس لئے کئے تھے کہ ہر شخص ہر زمانہ میں خود پہچان سکے کہ اس کے اعمال قرآنی معیار میں بھی پورے اُتر رہے ہیں یا نہیں! مسلمان نے آج یہ سمجھ رکھا ہے کہ یہ اعمال جو کبھی درحقیقت زندگی کے سرچشمے تھے محض چند رسوم ہیں جن کی ادائیگی ضروری ہے۔ ورنہ ان کا زندگی اور اُس کے مسائل سے کوئی علاقہ نہیں۔ باقی رہے نتائج۔ سو وہ "خدا کے ہاں" مرتب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ہم سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔ وہ ان رسوم کی ادائیگی کے بعد سمجھ لیتے ہیں کہ خدا کی طرف سے ان پر جس قدر فرائض عائد کئے گئے تھے وہ ادا ہو چکے۔ اس سے بڑی فریب خوردگی اور کیا ہو سکتی ہے!

یاد رکھئے: جب تک اعمال کو ان نتائج سے نہیں پرکھیں گے یہ کبھی معلوم نہیں ہو سکیگا کہ اعمالِ قرآنی حکمتِ خداوندی کے مطابق ادا ہو رہے ہیں یا نہیں۔ یہ بھی یاد رکھئے کہ دین و دنیا کی کامیابی و کامرانی انہی اعمالِ حیات کے اندر پوشیدہ ہے جو قرآن کریم کے ضابطۂ خداوندی میں متعین کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن یہ اعمال محض چند رسوم نہیں ہیں زندگی کی ٹھوس حقیقتیں ہیں! رسمی طور پر قیامت تک ادا کرتے چلے جایئے۔ کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ نتیجہ اس وقت برآمد ہوگا جب یہ منشائے خداوندی کے مطابق ادا کئے جائینگے۔ جس کی عملی شکل محمد رسول اللہ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ کے نقوشِ قدم میں چمکتے ہوئے ستاروں کی طرح جگمگ کر رہی ہے۔ وَفِیْھَا بَصَائِرُ لِلنَّاس۔

---۲---

اکتوبر کی آخری تاریخوں (۲۶ء۷ء۲۸) میں دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ اور کونسل کے اجلاس منعقد ہوئے

انہی کی روئداد کے لئے ہم نے اشاعتِ حاضرہ میں کچھ تاخیر گوارا کرلی۔ کونسل کی کارروائی اور اس کی قراردادیں، اخبارات کے ذریعے آپ تک پہنچ چکی ہونگی۔ لیکن ان ملی اجتماعات کے موقع پر ہماری نگاہیں کسی اور چیز پر ہوتی ہیں۔ یہ بھانپنے رہتے ہیں کہ قوم میں صحیح جماعتی زندگی کی روح بھی سرگرم عمل ہے یا نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ روز بروز حالات بہتر ہوتے چلے جا رہے ہیں لیکن ہم ان میں سے نہیں ہیں جو اپنے آپ کو خواہ مخواہ فریب میں مبتلا رکھیں۔ اصل یہ ہے کہ ابھی من حیث الجماعت ہم حقیقی روح سے بہت دور ہیں۔ مسلم لیگ کی کونسل تمام مسلمانانِ ہند کے نمائندگان کی جماعت کا نام ہے اور اگر یہ قوم کی ذہنیت کا صحیح آئینہ قرار دی جا سکتی ہے تو معاف فرمایئے! ہم یہ عرض کرنے پر مجبور ہیں کہ ہماری ملی ذہنیت ہنوز بہت خام ہے۔ باستثنائے چند معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ کوئی مسائل زیرِ نظر کو زندگی اور موت کے مسائل سمجھ کر ان پر سنجیدگی سے غور و تدبر کی ضرورت سمجھتا ہے۔ سب سے زیادہ افسوسناک اور مایوس کن منظر گوشۂ پنجاب کا تھا۔ اور اگر کہیں زندگی کے آثار نظر آتے تھے تو وہ ان گوشوں میں جنھیں اقلیت کے صوبے کہا جاتا ہے۔

لیکن اس تمام مایوسی و پژمردگی کے اندر امید کی ایک زندہ کرن اور زندگی کی ایک درخشندہ جھلک بھی موجود تھی۔ یعنی جنابِ جناح کی ذاتِ گرامی۔ اللہ تعالیٰ کے انداز بالکل نرالے ہیں۔ وہ جب کسی سے کام لینا چاہتا ہے تو اس میں ایسی تبدیلی پیدا کر دیتا ہے جو کسی کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آسکتی۔ وہی جناح جس کی روح اور پیکر دونوں مغرب کے کارخانوں میں ڈھلے ہوئے نظر آتے تھے آج اس مقلب القلوب کے دستِ قدرت سے ایمان و امتیاز کے ایک نئے سانچے میں ڈھل چکا ہے۔ دماغ، آئین و دساتیر کی ان بلندیوں تک پہنچا ہوا کہ جس کی مثال روز ویلٹ اور چرچل میں بھی بمشکل مل سکے۔ اور اس کے ساتھ سینہ میں ایک ایسا نرم و گرم دل جو کیسر درد و ملت سے لبریز۔ مسئلۂ ایران و دیگر ممالکِ اسلامیہ پر جب تقریر کے لئے اٹھے ہیں تو معلوم ہوتا تھا کہ صحیح جذباتِ اسلامیہ کا ایک طوفان ہے جو امنڈا چلا آ رہا ہے۔ تدبر، جذبات اور کیریکٹر کا نتیجہ یہ کہ کسی کی کیا مجال کہ سامنے آنکھ بھی اٹھا سکے۔ مسئلہ ممالکِ اسلامیہ پر پنجاب کی طرف سے جس ذہنیت کا مظاہرہ ہوا وہ اخبارات میں آچکا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ مخالفت کا یہ طوفان سب کو اپنے ساتھ بہا کر لے جائے گا۔ لیکن جب جنابِ جناح نے اپنی مختصر لیکن جامع تقریر کے بعد آراء کیلئے کہا تو ایک آواز بھی مخالفت میں نہ اٹھ سکی۔ یہ کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ جناح کے پاس نہ توپ ہے نہ تفنگ۔ نہ فوج ہے نہ پولیس۔ پھر یہ کیوں ہے کہ اس کے سامنے کسی کی آواز نہیں اٹھ سکتی؟ سبب بالکل واضح ہے۔ یہ سب اس لئے ہے کہ

اس کی آواز حق کی آواز ہوتی ہے اور اس سینے سے نکلتی ہے جس میں اللہ کے سوا کسی اور کا ڈر نہیں۔ جناح کو نہ کوئی قوت مرعوب کر سکتی ہے نہ بڑے سے بڑا لالچ خرید سکتا ہے۔ یہ قوتِ ایمان ہے جس کے سامنے بڑی سے بڑی سرکش قوتیں ایک ثانیہ کے لئے بھی نہیں ٹھہر سکتیں۔ اے کاش! وہ پست ذہنیتیں جو اس کوشش میں رہتی ہیں کہ کسی طرح وہ جناح کی قوتوں کی مظہر بن جائیں اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ جناح کی قوت کا راز اس کے کیریکٹر کی بلندیوں میں ہے۔ حاشیہ نشینوں کی فریب دہ واہ واہ میں نہیں ہے۔

اس منظر کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو جناب فضل الحق کا مسئلہ تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ چونکہ فضل الحق صاحب اب کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لئے آگئے ہیں۔ اس لئے یہ مسئلہ آسانی سے سلجھ جائیگا۔ لیکن افسوس کہ آخری وقت پر آکر انھیں پھر غلط مشورہ دے دیا گیا۔ اور وہ دہلی سے باہر چار میل کے فاصلہ پر رک کر رہ گئے۔ اعصابی کمزوری والے انسان جب جذباتی طوفان میں گھر جاتے ہیں تو واقعی بیمار ہو جاتے ہیں۔ وہ جوں جوں دہلی کے قریب آتے جاتے تھے آنیوالے منظر کے تصور سے خون کی حرکت تیز ہوتی جاتی تھی۔ حتّٰی کہ دہلی پہنچکر تیزیِ حرکت حرارت میں تبدیل ہوگئی۔ لیکن یہ حرارت نہ تھی جو اجلاس میں آپ کی شرکت کی مانع ہوئی۔ بلکہ جیسا کہ انھوں نے خود دوسرے دن کہلا بھیجا۔ انھوں نے فیصلہ کیا تھا کہ اجلاس میں ان کے متعلق بحث وتمحیص ان کی غیر حاضری میں ہو۔ ہمیں رہ رہ کر افسوس آتا ہے کہ انھیں کوئی بہتر مشیر نہ مل سکا ورنہ وہ دنیا کے سامنے اس طرح مضحوکہ نہ بن جاتے۔ ذرا اندازہ فرمایئے۔ وہ مسٹر جناح سے خود مل کر جاتے ہیں۔ ٹیلیفون پر گفتگو بھی ہوتی ہے۔ لیکن جو چٹھی لکھتے ہیں وہ مسٹر جناح کے نام نہیں۔ سکریٹری مسلم لیگ کے نام نہیں۔ بلکہ اپنے میزبان۔ خواجہ حسن نظامی صاحب کے نام لکھتے ہیں۔ جو اُسے مسٹر جناح تک پہنچاتے ہیں۔ بالکل بچوں کی سی باتیں۔ بچوں کی سی نہیں۔ عورتوں کی سی باتیں! اور چٹھی میں لکھتے کیا ہیں؟ یہ کہ میں کونسل اور ورکنگ کمیٹی کے استعفیٰ کا خط واپس لیتا ہوں اور ان الزامات کو بھی واپس لینے کے لئے تیار ہوں جو غلط اور جگر خراش تھے۔ لیکن ابھی نہیں۔ ذرا اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرلوں اور اپنے رفقاء سے مشورہ بھی کرلوں۔ ملاحظہ فرمایئے! مہینہ بھر میں تو انھیں ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے لئے چند لمحات مل سکے اور نہ ہی اپنے رفقاء سے مشورہ کرنے کی فرصت۔ کلکتہ سے اپنے رفقاء سمیت دہلی آگئے۔ اور اس ایک مسئلہ کو سامنے رکھکر آئے۔ لیکن اس وقت تک سوچا ہی نہیں کہ

کو مجھے کیا کرنا ہے؟ کس قدر سوختہ بخت ہے وہ قوم جس کے ارباب حل و عقد کی دماغی اور قلبی کیفیت کا یہ انداز ہو
اس کے برعکس جناب جناح کی کشادہ ظرفی اور بلند نگہی ملاحظہ فرمایئے۔ فضل الحق صاحب ان کی ذات کے خلاف
الزامات لگاتے تھے۔ وہ جناح جو کسی بڑے سے بڑے کی طرف سے ایک حرف بھی اپنے خلاف سُننے کے لئے تیار نہیں
ہو سکتا۔ مفادِ ملی کی خاطر یہ سب کچھ سُنتا ہے اور ماتھے پر شکن بھی نہیں آنے دیتا۔ قریب چار گھنٹے تک مجلس عاملہ
کے سامنے یہ مسئلہ زیر بحث رہا۔ اور اس کے بعد خود مسٹر جناح نے اسے کونسل کے اجلاس میں پیش کیا۔ جس سکون و
اطمینان اور شگفتگی و خندہ پیشانی سے انھوں نے اسے پیش کیا تھا۔ وہ ان کی بلندیِ مقام کی آئینہ دار تھی۔
انھوں نے جماعت سے اپیل کی کہ وہ جناب فضل الحق صاحب کو ابھی اور مہلت دے کہ وہ ٹھنڈے دل سے
معاملہ کو سوچ لیں۔ چنانچہ انھیں دس دن کی مزید مہلت دی گئی۔

ہم اپنے اس عزیز بھائی سے ایک بار پھر درخواست کریں گے کہ وہ اپنے آپ پر قابو رکھنے کی صلاحیت اپنے
اندر پیدا کریں۔ اور خود اپنی خاطر اور ملتِ اسلامیہ کے مفادِ کلی کی خاطر جذبات کی رو میں بہ جانے کے مسلک
سے اجتناب کریں۔ ہمیں امید واثق ہے کہ اس مزید مہلت کے وقفہ میں جناب فضل الحق اپنی روش میں اصلاح
کرنے کے مسئلہ پر غور فرما کر اس فیصلہ پر پہنچ سکیں گے جو خود ان کے لئے اور تمام مسلمانوں کے لئے سلامتی اور سعادت
کی راہ کی طرف منجر ہوگا۔ اور اگر (خدانکردہ) وہ اپنی ضد پر اڑے رہے تو سوائے اس کے اور چارہ کار نہ
ہوگا کہ قوم اپنے آپ کو ان کی دیوانگی کے اثرات سے بچالے۔

---

(۳۰)

لکھنؤ سے ہمیں ادارۂ اقبال کے اغراض و مقاصد کی ایک مطبوعہ کاپی ملی ہے جو اس وقت
ہمارے سامنے ہے۔ یہ ادارہ حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمتہ کے عقیدتمند اور ہمارے جواں سال
جواں ہمت محترم عبدالوحید خان صاحب (مصنف جنگ آزادی اور مسلمانوں کا ایثار، و رکن کونسل
آل انڈیا مسلم لیگ) کی دیرینہ آرزوؤں کا عملی پیکر ہے۔ حضرت علامہ اقبال کے پیغام کی نشر و اشاعت
ادارہ کا مقصدِ اولین ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی ترقی و توسیع۔ عربی زبان کی ترویج

اور ہندوستان اور اسلامی ممالک کی تاریخ کی تحقیق و تدوین بھی ادارہ کے پیش نظر ہے۔ یہ مقاصد نہایت بلند اور پاکیزہ ہیں جن کی تکمیل کے لئے ادارہ کے سامنے پروگرام یہ ہے کہ ایک ماہ میں کم ازکم ایک پمفلٹ شائع کیا جائے۔ مختلف مقامات میں جلسے وغیرہ کرکے مشہور اہل علم حضرات سے تقریریں کرائی جائیں یا مقالہ جات پڑھوائے جائیں۔ ایک مرکزی لائبریری قائم کی جائے۔ مختلف مقامات پر دارالمطالع کھولے جائیں۔ دارالتصنیف و دارالترجمہ قائم کیا جائے۔ اور ایک پندرہ روزہ پرچہ شائع کیا جائے۔

ادارہ کے مقاصد یقیناً اس قابل ہیں کہ ان کی تکمیل کے لئے ادارہ کی مدد کی جائے۔ اس کے لئے تفصیلی حالات۔ ناظم صاحب ادارہ۔ نعمت اللہ روڈ۔ لکھنؤ سے دریافت کیجئے۔

---

(۴)

الحمد للہ علیٰ ذالک کہ ملک کے اطراف و اکناف سے معارف القرآن کا استقبال اس گرم جوشی اور حسن عقیدت سے ہوا۔ جس کی توقع تھی۔ جس جس نے دیکھا ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور پڑھنے کے بعد والہانہ انداز سے خراج تحسین ادا کیا۔ یوں تو قارئین معارف القرآن میں سے ہر ایک کی رائے اپنی اپنی جگہ ایک خاص وقعت رکھتی ہے۔ لیکن ان میں ایک آواز ایسی ہے جو ہمارے نزدیک اس باب میں حرف آخر اور سند کا حکم رکھتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ آج ہندوستان کی علمی دنیا میں دو ہستیاں ایسی ہیں جن سے بڑھ کر قرآنی تحقیق میں شاید ہی کسی کا پایہ ہو۔ ایک شمس العلماء سید محب الحق صاحب اور دوسرے علامہ حافظ محمد اسلم صاحب جے راج پوری (اللہ تعالےٰ ان کے فیوض و برکات کو تا دیر سلامت رکھے) ان میں سے حضرت علامہ اسلم صاحب نے تو خود معارف القرآن پر بسیط مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔ رہے جناب شمس العلماء صاحب۔ سو ان کا گرامی نامہ (اصل مع نقل) طلوع اسلام کے صفحات پر شائع کرنے کا فخر حاصل کیا جاتا ہے۔ اس سے آپ اندازہ فرما سکیں گے کہ معارف القرآن کیا ہے! ہم جناب مؤلف (حضرت پرویز) کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی محنت کو اس طرح شرف قبولیت عطا

فرمایا ہے کہ اللہ کے ہاں کی قبولیت اس کے مقبول بندوں کی آواز کے ذریعے ہی پہچانی جایا کرتی ہے۔ ہمارے لئے بھی موجبِ صد افتخار و اعزاز ہے کہ اس عظیم المرتبت کتاب کی اشاعت کی سعادت ہمارے حصہ میں آئی ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی لکھا ہے یہ کتاب اس قابل ہے کہ درساً درساً پڑھی اور پڑھائی جائے۔ اگر ہمارے "اسلامیہ" مدارس (یعنی کالج) اسے اپنے ہاں بطور نصاب مقرر کرلیں تو آپ دیکھیں گے کہ چند ہی سال کے عرصہ میں مسلمان طلباء کی ذہنیت میں کیا انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔ فی الحقیقت اس کتاب میں وہ سب کچھ ہے جس کی آج ہمارے نوجوانوں کے قلب و دماغ کو ضرورت ہے۔

لیتھو کی چھپائی میں کسی کتاب کا غلطیوں سے پاک وصاف رہ جانا ناممکنات میں سے ہے بظاہر یہ چیز کچھ تعجب انگیز سی نظر آتی ہے۔ لیکن جن احباب کو اس کا ذاتی تجربہ ہے وہ اس کی تصدیق کریں گے اور اس کی وجہ بھی بتا سکیں گے۔ چنانچہ معارف القرآن بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں رہ سکتی تھی۔ اس میں بعض غلطیاں تو ایسی ہیں جو سطح پر تیرتی ہوئی نظر آجاتی ہیں۔ لیکن کچھ ایسی بھی ہیں جو ذرا گہرائی میں پہنچکر دکھائی دیتی ہیں۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ان غلطیوں کی فہرست مرتب ہو جائے۔ اگر غلطیاں زیادہ ہوئیں اور مخش۔ تو اغلاط نامہ شائع کر دیا جائے گا۔ ورنہ قارئین کی صحتِ ذوق پر بھروسہ کرلیا جائے گا۔

---

(۵)

کاغذ کی گرانی کی وجہ سے ہم جن مشکل مراحل سے گذر رہے ہیں' اُن کا تذکرہ اس سے پیشتر آچکا ہے۔ لیکن ان مراحل کی سختی روز بروز بڑھتی چلی جارہی ہے۔ اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ بہرحال ہماری پوری کوشش ہوگی کہ ان مشکلات پر قابو پاتے چلے جائیں لیکن

مشیت کو کیا منظور ہے۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ خدا کرے کہ طلوعِ اسلام کی کشتی ناسازگار حالات کے اس گرداب سے صحیح و سلامت نکل جائے کہ طلوعِ اسلام کو اللہ کی ذات کے سوا کسی اور پر بھروسہ نہیں۔

اس چہار سالہ سفر میں ہمیں کس کس قسم کے تجارب حاصل ہوئے۔ اس وقت ہم ان کا تذکرہ قبل از وقت سمجھتے ہیں۔ شاید وقت آنے پر ان کا ذکر کر دیا جائے۔ تاکہ اس وادیِ جانگسل کے اور راہروان اس سے کچھ سیکھ لیں۔ البتہ ایک تلخ حقیقت کی طرف اشارہ ناگزیر ہو گیا ہے۔ یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ طلوعِ اسلام کس طرح جگر لخت لخت کو جمع کر کے دعوتِ مژگاں کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ اس کے مقاصد کی نشر و اشاعت کا مؤثر ذریعہ وہ پمفلٹس ہیں جو اس کی طرف سے وقتاً فوقتاً شائع کئے جاتے ہیں۔ صورت یہ ہوتی ہے کہ تھوڑا بہت اثاثہ جو موجود ہو اُسے پمفلٹس کی تیاری پر لگا دیا جاتا ہے۔ ان میں ہزارہا بلاقیمت تقسیم کئے جاتے ہیں اور باقی اتنی قیمت پر کہ جس سے اصل واپس آجائے۔ اس چکر سے نشر و اشاعت کا یہ سلسلہ قائم تھا۔ کچھ دنوں سے آپ نے دیکھا ہو گا کہ کوئی نیا پمفلٹ شائع نہیں کیا گیا۔ اس کی ایک وجہ تو کاغذ کی موجودہ ہولناک گرانی ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ افسوسناک سبب ایک اور ہے۔ اور وہ وہی جو ایک زمانہ سے بطور حقیقت ثابتہ چلا آتا ہے۔

کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد

یعنی ہمارے اکثر "بہی خواہ" ایسے ہیں جنھوں نے طلوعِ اسلام کا لٹریچر لیا کہ اُسے خدمتِ ملیٰ سمجھ کر فروخت کریں گے۔ "درد ملی" ایک ایسا حربہ ہے جس کا نشانہ خطا نہیں جاتا۔ اس لئے ہم بھی اس کی زد میں آگئے۔ اب حالت یہ ہے کہ جتنا کچھ تھوڑا بہت سرمایہ پاس تھا وہ ان پمفلٹس پر لگ گیا اور یہ پمفلٹس ان "خدامِ ملت" حضرات کے پاس جا پہنچے۔ وہاں سے نہ ان کی قیمت وصول ہوتی ہے نہ پمفلٹس ہی واپس آتے ہیں۔ تفصیل اس کی طویل ہے۔ مثال کے طور پر یہ ایک واقعہ کافی ہے۔

ان "خدام الملت" حضرات میں سے ایک صاحب پچاس روپے کا لٹریچر پروپیگنڈا کے لئے بلا قیمت لے گئے۔ اور اس کے ساتھ قریب ڈیڑھ سو روپیہ کے پمفلٹ قیمتاً فروخت کرنے کے لئے سال بھر سے اوپر ہوئے کو آیا۔ آج تک نہ ایک پائی لفت دصول ہو سکی۔ نہ ایک پمفلٹ واپس ملا۔ خط پر خط لکھے جاتے ہیں۔ پیغامات پہنچائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ "خادم ملت والدین" دردِ دل میں کچھ اس طرح نڈھال ہیں کہ کسی طرف توجہ دینے کا ہوش ہی نہیں۔ نتیجہ یہ کہ یہاں نشر و اشاعت کا سارا سلسلہ رک گیا۔ اور وہ نہایت معتبر بے آرام سے بیٹھے ہیں۔ یہ ایک واقعہ عرض کیا گیا ہے۔ اگر اس قسم کے تمام واقعات درج کئے جائیں تو آپ نقش بدیوار ہو جائیں۔ اب آپ سمجھ گئے قوم کی نیا ڈوب کیوں رہی ہے؟ طلوعِ اسلام صرف ایک کاغذ کی گرانی کے ہاتھوں ہی نالاں نہیں۔

بسیار شیوہا است بتاں راکہ نام نیست

معذرت

ہمارا اندازہ تھا کہ اس دفعہ رسالہ دو تین دن کی تاخیر سے شائع ہو گا۔ لیکن افسوس ہے کہ پریس کی مجبوریوں کی وجہ سے غیر متوقع طور پر تاخیر ہو گئی۔ ہمیں قارئین کی کاوش و تشویش کا احساس ہے۔ لیکن ہم اپنی مجبوریاں کہیں سے کہیں؟

بے قراری ہے کس قرار کے ساتھ
جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ

شاہ سید احمد شہیدؒ کی سیرت پر ایک اجمالی نظر

"پچھلے دنوں میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ حضرت شہید علیہ الرحمۃ کی سیرت کا مطالعہ کیا جس کے تاثرات بے ساختہ صفحۂ قرطاس پر آگئے، تاثرات کیا عقیدت کے آنسوؤں کے چند قطرے، جو بارگاہِ حضرت شہیدؒ میں بصد نیاز و احترام پیش کرتا ہوں" ضیاء

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

تم (اے مدعیانِ ایمان) بہترین قوم ہو جو نوعِ انسانی کے لئے پیدا کی گئی ہے (تمہارا فریضۂ حیات یہ ہے کہ) معروف کا حکم کرو اور منکر سے روکو!

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا

اور اسی طرح ہم نے تمہیں (اے مدعیانِ ایمان) بہترین قوم بنایا ہے تاکہ تم تمام نوعِ انسانی (کے اعمال) پر نگراں رہو اور رسول تمہارا نگراں ہو

قرآن کریم نے اپنی ان دو مختصر لیکن جامع آیاتِ مقدسہ میں مسلمان کی زندگی کا نصب العین واضح کر دیا ہے مسلمان "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کے لئے مقرر کیا گیا ہے اس کے ساتھ ہی وہ "شہداء علی الناس" ہے یعنی تمام نوعِ انسانی کے اعمالِ حیات پر نگراں۔ ظاہر ہے کہ اس مقصدِ عظیم کے حصول اور اس فرضِ گرانبار کی تکمیل کے لئے زندگی کو کس قدر عملِ پیہم اور جہادِ مسلسل سے عبارت ہونے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ نے جو ان آیاتِ جلیلہ کے اولین مخاطب تھے، اپنی زندگیوں کو اس نصب العین کے حصول کے لئے اس جذب و فنا سے وقف کیا کہ دُنیا نے مشاہدہ کر لیا کہ شہداء علی الناس کیسے ہوتے ہیں اور آمر بالمعروف اور ناہی عن المنکر کے فرائضِ زندگی کیا ہیں! اُن کی زندگی سرتاپا عمل تھی اس میں ایک لمحہ بھی جمود و تعطل کا نہ تھا۔ نتیجہ یہ کہ وہی غریب اور نادار مسلمان جو ابھی تھوڑا ہی عرصہ پہلے مخالف قوتوں کے جور و استبداد کی وجہ سے مکہ سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے

---

[1] یہ مضمون بکم و بیش سید ابو الحسن صاحب ندوی کی کتاب "سیرت سید احمد شہیدؒ" کے اقتباسات پر مشتمل ہے۔

دس سال کی قلیل مدت میں اسی مکہ میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے اور اپنے رب کے موعودہ "الکوثر" کے حقدار قرار پائے۔ وہ نہ صرف عرب ہی کے مالک بنے بلکہ قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج بھی اُن کے قدموں میں آگرے، اور یہ سب اس سُرعت سے ہُوا کہ آج یہ تاریخ کا اہم ترین سوال بن گیا ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہوا کہ عرب کے امّی بدّو اتنے تھوڑے عرصہ میں بے پناہ سیلاب کی طرح دُنیا کی وسعتوں پر چھا گئے؟

لیکن ترقی و عروج کی وہ خیرہ کن داستان شاید اس قدر حیرت انگیز نہیں جس قدر آج مسلمان کے زوال و پستی کی عبرتناک کہانی حسرت انگیز ہے۔ دُنیا تو یہ پوچھتی ہے کہ وہ کیسے ہوا تھا اور ہم دُنیا سے پوچھتے ہیں کہ یہ کس طرح ہو گیا؟ آسمان کی بلندیوں سے ہم زمین کی پستیوں پر کس طرح آگرے؟ لیکن دوسروں سے پوچھنے والے اگر خود اپنے ہاں تھوڑا سا غور کریں تو اس گتھی کا سلجھنا کچھ مشکل نہ ہوگا۔ اس "ہبوط" کی وجہ ظاہر ہے کہ وہ دَورِ سعی و عمل جلد گزر گیا۔ خلافت ملوکیت میں بدل گئی اور اس کے ساتھ ہی ملوکیت کی تمام لعنتیں ایک ایک کر کے قوم پر مسلط ہو گئیں۔ دربار پر ملوکانہ تکلفات چھا گئے، قلب و نظر پر عجمی تصورات غالب آگئے۔ فرصت کا زمانہ، فارغ البالی کے دن، کھانے پینے کے لئے فراوانی، نہ فکرِ فردا، نہ غمِ دوش، زندگی کا نصب العین ابیقوریت (Epicureanism) ارباب علم و فضل بالعموم اپنی اپنی مسندوں پر بیٹھے منطقیانہ موشگافیوں اور فلسفیانہ نکات آفرینیوں میں "مصروف عمل" ہو گئے۔ پہلے یہ تھا کہ اُدھر سے ارشاد ہوا کہ "قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی" اور اِدھر انہوں نے اپنے عمل سے اس قال کو حال کر دکھایا۔ اب یہ مسئلہ پیدا ہو گیا کہ جب اللہ کے متعلق لفظ قال (اس نے کہا) کا استعمال ہو تو اس قول کی ماہیت کیا ہوتی ہے؟ جو فرشتے اس "قولِ خداوندی" کے حامل ہوتے ہیں اُن کی نوعیت کیسی ہوتی ہے؟ ملکۂ نبوّت کسے کہتے ہیں؟ وحی کی کیا کیفیت ہے؟ وغیرہ ذالک۔

ان لفظی "مجاہدات" کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف قوم سینکڑوں فرقوں میں بٹ گئی اور دوسری طرف ان سے سعی و عمل کی صحیح اسلامی روح مفقود ہو گئی۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ کسی مسئلہ کا حل دریافت کرنا سب سے بڑا جہاد ہے۔ کسی مناظرہ کے میدان میں فریقِ مخالف کو منطقی دلائل سے خاموش کر دینا سب سے گراں قدر عمل حسنہ ہے۔ جبر و قدر کے مسائل، تجسیم و تنزیہہ کے مسائل، قرآنِ کریم کے مخلوق و قدیم ہونے کے مسائل، ذات و صفاتِ باری تعالیٰ، نبوّت، وحی، الہام، معجزات، ملائکہ، جنت، دوزخ، برزخ، حشر و نشر، غرضیکہ ایک ایک شعبہ اور عقائد کے ایک ایک گوشے کے متعلق لفظی مباحث و جدل کا ایک ایسا لامتناہی سلسلہ چھڑا کہ کثرتِ تعبیر سے خواب پریشان ہو گیا۔ اور اب اسلام کی اس مسخ شدہ صورت سے فرنگی اس امر پر متعجب

کہ ان نظری مسائل سے تلاعب ہی مسلمان کی زندگی کا مقصدِ وحید بن گیا، یہاں تک کہ اب ہمارے سامنے کسی کی "عظمت" کے ماپنے کا پیمانہ ہی یہی باقی رہ گیا ہے کہ دیکھیں اُس نے کس قدر کتابیں لکھیں؟ کون کون سے متنازع فیہ مسائل پر خامہ فرسائی کی؟ سلوک کے کون کون سے مقامات طے کئے؟ اور اس طرح مجاہد و شہید کا وہ مرتبۂ عظیم کہ جس کے متعلق خود خدا نے فرمادیا کہ "انہیں مردہ نہ کہو وہ زندہ ہیں" نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ "عظمت" کا یہ تصور اب مسلمان کے دل و دماغ پر کچھ اس طرح چھا گیا کہ وہ مجاہدین جنہوں نے سرفرازیٔ کلمۃ الحق کے لئے اپنی زندگیاں قربان کر دیں تاریخ کے دھندلے سے نقوش بنتے چلے گئے۔ کیونکہ وہ بوجھل تصنیفات کا انبار اپنے پیچھے نہیں چھوڑ گئے جو ہمارے مدارس میں "دین" کا نصاب بن کر ہمارے طالب العلموں کے دماغوں پر مستولی ہو جائے۔ اب ان مجاہدین کا تذکرہ، اگر خوش نصیبی سے کہیں تاریخ کے اوراق نے اپنے اندر محفوظ کر لیا ہے، تو وہیں محفوظ رکھا ہے۔ یہ تذکرے نہ کہیں ہمارے مکاتب کے حلقۂ درس و تدریس میں وجہ انجلائے قلب و نگاہ بنتے ہیں اور نہ ہماری خانقاہوں میں باعثِ تزکیۂ نفس و بالیدگیٔ روح سمجھے جاتے ہیں۔ انہیں تاریخ کی "کہنہ داستانیں" سمجھ کر قصۂ ماضی قرار دیدیا جاتا ہے اور کبھی یہ تصور میں بھی نہیں آتا کہ یہی وہ داستانیں ہیں جن کے تصدق میں ہم آج دنیا میں ایک کلمہ گو کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں یہ "پرانے خیال" کی دنیا کی حالت ہے۔ "جدید خیال" کے مسلمانوں کو دیکھا جائے تو وہ ان سے بھی دس قدم آگے ہیں۔ اُن کے سامنے یہ داستانیں آئیں تو وہ جھجکتے ہیں، تامل کرتے ہیں، مضطرب ہوتے ہیں کہ کہیں اُستادانِ مغرب میں سے کوئی بھانپ تو نہیں رہا۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح یہ ثابت کر دیا جائے کہ یہ داستانیں (معاذ اللہ) ایک عہدِ رفتہ کی یادگار ہیں جب انسان نے ہنوز اتنی ترقی نہیں کی تھی ان کی تمام عمر کی کوششوں کا ماحصل یہ ہوتا ہے کہ دنیا کو یہ بتا دیا جائے کہ "اسلام" کو ان چیزوں سے کچھ واسطہ نہیں، ان ٹکسالِ مغرب کے ڈھلے ہوئے مسلمانوں کو کون سمجھائے کہ جن چیزوں سے تم آج یوں نگاہیں جھکائے پھرتے ہو۔ یہی چیزیں ہیں جو دنیا میں کبھی تمہاری سرفرازی کا باعث بنی تھیں ؎

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے ؛

ترے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہئے

صدرِ اولیٰ کے مسلمانوں کو چھوڑ کر کہ وہ خوب سمجھتے تھے کہ اسلام کا مقصد کیا ہے اور اُن کی زندگی کا نصب العین

کیا۔ فی ملہٗ مابعد پر بھی نگاہ ڈالی جائے تو یہاں وہاں ایسی ایسی ہستیاں نظر آجائیں گی جنہوں نے اسلام کی اس حقیقت عظمیٰ کو پہچانا اور اتباع اسوۂ حسنہ میں اس کا عملی نمونہ اپنی زندگی کے کوائف میں پیش کر کے دُنیا کو دکھادیا کہ

بے دست و پائیم کہ ہنوز از دو رِ عشق

سوداست در سرم کہ بساماں برابراست

جلیل القدر ہستیوں میں سید احمد صاحب شہید علیہ الرحمۃ ہیں جو گو زمانہ کے لحاظ سے پیچھے لیکن مرتبہ کے لحاظ سے بہت آگے ہیں۔

رسول اللہ کا دُنیا میں ایک بہت بڑا کام اور آپؐ کی بعثت کا اہم مقصد حکومتِ الٰہی کا قائم کرنا اور دُنیا میں آسمانی نظام جاری کرنا تھا۔ جناب سید احمد صاحبؒ شہید کی حیاتِ طیبہ میں اتباعِ نبویؐ کی یہ حیثیت بہت نمایاں ہے اور اسی جوہر نے مشائخ اُمت میں اُن کا سر بہت اونچا کر دیا ہے۔

سید صاحبؒ علیہ الرحمۃ نے اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھا کہ حکومتِ الٰہی اور اسلامی نظام و قوانین و حدود کے اجراء اور ماحول کی تبدیلی کے بغیر اصلاحِ افراد کی کوششیں "کوہ کندن اور کاہ برآوردن" ثابت ہوں گی یعنی انہوں نے محسوس کر لیا کہ ضرورت فضا بدلنے اور جڑ مضبوط کرنے کی ہے۔ آپ اسی نقشہ پر کام کرنا چاہتے تھے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء راشدین نے کیا اور تجربہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ اور پائدار کامیابی اسی کو ہوئی اور قیامت تک اسلام کی ترقی کے لئے وہی نظامِ عمل ہے۔

اسلام صرف خواص کا مذہب نہیں کہ چند منتخب لوگوں نے اس پر عمل کر لیا اور اُن کے اعمال دوسروں کے کے لئے کفارہ ہوگئے۔ اسی طرح اسلام عیسائیت کی طرح چند عقائد و رسوم کا نام نہیں وہ زندگی کا نظام ہے، وہ زمانہ کی فضا طبیعت بشری کا مذاق اور سوادِ اعظم کا رنگ بدلنا چاہتا ہے اور عقائد کے ساتھ اخلاق و معاشرت۔ زندگی کے مقصد و معیار زاویۂ نظر اور انسانی ذہنیت کو بھی اپنے قالب میں ڈھالنا چاہتا ہے یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ اس کو مادّی و سیاسی اقتدار حاصل ہو۔ قانون سازی کا حق کسی انسان کو حاصل نہ ہو بلکہ صرف خدا کو ہو۔ اسلام کے مادّی اقتدار کا لازمی نتیجہ اس کا روحانی اقتدار ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے۔

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ

وَنَہَوا عَنِ المنکر وللہ عَاقِبَۃُ الاُمُورِ ہ

یہ (مظلوم مسلمان) وہ ہیں کہ اگر ہم نے انہیں زمین میں صاحبِ اقتدار کر دیا تو وہ نماز قائم کریں گے زکوٰۃ کی ادائیگی میں سرگرم ہوں گے نیکیوں کا حکم دیں گے برائیاں روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے (الحج)

یہ ظاہر ہے کہ شرعی حکومت کے بغیر شریعت پر پورا عمل ہو نہیں سکتا۔ اسلام کا دنیا میں ایک مستقل نظام ہے جو حکومت پر موقوف ہے بغیر حکومت کے قرآنِ مجید کا ایک پورا حصہ ناقابلِ عمل رہ جاتا ہے۔ خود اسلام کی حفاظت بھی بغیر قوت کے ممکن نہیں۔

سید صاحب علیہ الرحمۃ کی پہلی خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے ایک ایسے دور میں جبکہ اسلام کا یہ مطمح نگاہ بالعموم نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا اس بھولے ہوئے سبق کی یاد دلائی خود اس پر عمل پیرا ہوئے اور اس کے بعد دوسروں کو اس کی دعوت دی۔

اس کے بعد سید صاحبؒ کی ایک اور خصوصیت پر نظر ڈالئے یعنی اُن کا جذبۂ عمل اور اس کا حلقۂ اثر و نفوذ۔ آپ نے تھوڑے سے عرصہ میں ایک دینی فضا قائم کر دی اور ایک ایسی جماعت پیدا کر دی جو خود اُن کے رنگ میں رنگی ہوئی اور اُن کے مشن کی صحیح علمبردار تھی۔ سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے، ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے، اللہ کے لئے جان دینے والے، شریعت پر جینے اور مرنے والے، بدعت سے نفور، شرک کے دشمن، جہاد کے نشہ میں سرشار، تقویٰ و عبادت کے صحیح مفہوم سے لذت آشنا اور بڑی بات یہ کہ ہم رنگ و یک آہنگ، تاریخِ اسلام میں کسی ایک مقام پر اتنی بڑی تعداد میں اس شکل اور جامعیت کی جماعتیں کہیں کہیں نظر آئیں گی جو اس طرح منظم اور وسیع ہوں اور جن کے انقلابی اور دوامی اثرات اتنے ہمہ گیر اور دور رس ہوں۔ مشرقی بنگالہ سے لیکر افغانستان کے حدود تک لاکھوں مسلمان اس تحریک سے وابستہ تھے۔ بنگال کے کمشنر پولیس کی رپورٹ ہے کہ اس جماعت کے ایک ایک مبلغ کے پیروؤں کی تعداد اسی اسی ہزار تھی۔ سر ولیم ہنٹر اپنی کتاب "مسلمانانِ ہند" میں لکھتا ہے۔

"صوبہ متحدہ کے ایک انگریز کارخانہ دار نیل کا بیان ہے کہ اس کے دیندار مسلمان ملازم اپنی تنخواہ یا مزدوری کا ایک جزو ستھانہ کیمپ کے لئے علیحدہ کر کے رکھ لیتے تھے۔ جو لوگ زیادہ جری تھے وہ تھوڑے

بہت زمانہ کے لئے ستقانہ جاکر خدمت کرتے تھے۔ جس طرح ہندو ملازم اپنے بزرگوں (پرکھوں) کے شرادھ کے لئے چھٹی مانگتے تھے اسی طرح مسلمان ملازم یہ کہہ کر چند ماہ کی رخصت لیتے تھے کہ انہیں فریضۂ جہاد ادا کرنے کے لئے مجاہدین کے ساتھ شریک ہونا چاہیئے"۔

مندرجہ بالا تمہیدی سطور کے بعد پیشتر اس کے کہ ہم سید صاحبؒ کی زندگی پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالیں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تیرہویں صدی یعنی سید صاحبؒ کے زمانہ کے ہندی مسلمانوں کا بھی کچھ ضمنی تذکرہ کر دیا جائے۔

مذہبی طور پر مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ بدقسمتی سے ہندوستان میں اسلام ایران و افغانستان کا چکر کاٹ کر پہنچا اور راستہ میں اپنی بہت سی تازگی اور زندگی کھو کر یہاں تک آیا، پھر جس ملک میں وہ داخل ہوا اس کا خود ایک مذہب، ایک تصوف اور ایک تہذیب تھی۔ جس وقت حریفوں کی تلواریں آپس میں میدانِ جنگ میں دست و گریباں ہوتی تھیں اس وقت ان کی تہذیبیں استفادہ و تعارف میں مشغول ہوتی تھیں۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ بقول ڈاکٹر لیبان: "اسلام ہندوستان میں جتنا اثر انداز ہوا اس سے زیادہ متاثر ہوا اور تھوڑے دنوں میں ایک بین الاقوامی عربی، ایرانی، افغانی اور ہندوستانی اشتراکی مذہب و تہذیب پیدا ہو گئی، یہاں کے اسلام میں وہ ساری کمزوریاں تھیں جو ایران و افغانستان کے اسلام میں تھیں اور وہ بھی جو ہندو مذہب و تہذیب و تصوف کے اختلاط سے پیدا ہوئی تھیں جو لوگ یہاں اپنے پرانے مذہب سے اسلام میں داخل ہوئے وہ طبعاً اپنے ساتھ اپنی بہت سی مذہبی و قومی خصوصیات، عقائد اور خیالات لائے جو قائم رہے اور بعد میں مذہب میں داخل ہو گئے۔

اس زہر کا تریاق قرآن تھا۔ لیکن مرورِ زمانہ سے وہ صرف "ثواب حاصل کرنے" کا ذریعہ بن کر رہ گیا تھا۔ اس پر عمل تو کجا۔ اُسے اپنی زبان میں سمجھانے کی کوشش بھی کفر" سے کم نہ سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ جب ہندوستان میں سب سے پہلا قرآنِ کریم کا ترجمہ شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمۃ نے فارسی میں کیا تو علماء میں قیامت برپا ہو گئی۔ یہاں تک کہ شاہ صاحبؒ کو کچھ دنوں کے لئے ہندوستان چھوڑ کر باہر جانا پڑا۔

تیرھویں صدی کے مسلمانوں کے مذہبی رجحانات کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ شرک و بت پرستی عام تھی۔ قبروں اور مردوں کے متعلق ایک مستقل "شریعت" بن چکی تھی جس کے واجبات اور مستحبات میں وہ سب کچھ داخل ہو چکا تھا جسے ایک عبدِ مومن دیکھنا تو سمجھ نہ سکتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کس دین کی رُو سے ہو رہا ہے۔

سنت وشریعت بے معنی الفاظ تھے۔ بدعت کی تعریف کسی چیز پر صادق نہیں آتی تھی، اور ہر بدعت بدعت حسنہ
ی، بہت سے حرام حلال ہوگئے تھے اور بہت سے حلال حرام۔ اسلامی شعائر اٹھ رہے تھے اور اُن کی جگہ ہندوانہ
ائے رہے تھے اور رے چلے تھے، فرائض وعبادات سے عام غفلت تھی۔ اسلامی معاشرت کے زوال وانحطاط کا
ں سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ معتبر لوگوں کی شہادت ہے کہ سلام مسنون کی رسم سارے ہندوستان سے اٹھ گئی تھی اور
ں کی جگہ آداب عرض وتسلیمات کا رواج تھا۔

اخلاقی حالت یوں تھی کہ فسق ومعصیت ان کی آداب وتہذیب میں داخل ہو کر معاشرت کا جزو بن گئی تھی،
راب نوشی عام تھی، نشہ آور چیزوں کا استعمال گھر گھر تھا۔

سیاسی حالت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ سلطنتِ مغلیہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ کسی حکومت کا زوال
نے کو تو دو لفظ ہیں لیکن کسی ملک وقوم کی تاریخ میں قیامت سے کم نہیں، مسلمانوں کی سیاسی ساکھ گر چکی تھی اور اب
اپنے باپ دادا کی زمین پر نکما بوجھ بن کر رہ گئے تھے۔

تشتت وافتراق اور شرک وبدعت کے ایسے دور میں صفر کے مہینے میں ۱۲۰۱ھ میں جناب سیّد احمد شہید علیہ
رحمۃ کی پیدائش ہوئی۔

ابتدائی زندگی چار سال کی عمر میں شرفاء کے دستور کے مطابق آپ مکتب میں بٹھلائے گئے لیکن لوگوں نے تعجب
سے دیکھا کہ آپ کی طبیعت خاندان کے اور لڑکوں اور اپنے ہم عصروں کے برخلاف علم کی طرف راغب
ین۔ بڑی مشکل سے قرآن مجید کی چند سورتیں یاد ہوسکیں، اور مفرد ومرکب الفاظ لکھنا سیکھ سکے۔ البتہ آپ کو بچپن میں
یل کا بڑا شوق تھا خصوصاً مردانہ اور سپاہیانہ کھیلوں کا۔ کبڈی بڑے شوق سے کھیلتے اور اکثر لڑکوں کو دو گروہوں
ںسیم کر دیتے اور ایک گروہ دوسرے گروہ کے قلعہ پر حملہ کرتا اور فتح کرتا۔ اس طرح غیر شعوری طور پر آپ کی جسمانی
جی تربیت خود بخود ابتدائی مراحل طے کر رہی تھی۔

جب سنِ بلوغ کو پہنچے تو آپ کو خدمتِ خلق کا ایسا ذوق پیدا ہوا کہ اچھے اچھے بزرگ وخدا پرست انگشت بدنداں
گئے، ضعیفوں، اپاہجوں اور بیواؤں کے گھروں پر دونوں وقت جاتے، ان کا حال پوچھتے اور ان کے ادنیٰ سے
نیٰ کام کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتے، وہ لوگ آپ کے بزرگوں کے مُرید تھے اس لئے وہ اکثر کہتے کہ میاں کیوں

گنہگار کرتے ہو لیکن یہ باصرار ان کی ضرورتیں معلوم کرتے اور بازار سے ان کے لئے سودا وغیرہ لاتے۔ اس کے
ساتھ ہی آپ کو عبادت و ذکرِ الٰہی کا بے حد ذوق تھا۔ رات کو تہجد گزاری اور دن کو خدمت گزاری اور تلاوت و
مناجات میں مشغول رہتے قرآنِ مجید میں تدبر فرماتے اور یہی آپ کا مشغلہ تھا۔

آپکا ابتدائی شوقِ جہاد اور والدہ کا ایثار

ایسی مائیں دُنیا میں بہت کم ہوں گی جو بیٹے کی جان کے امتحان میں پوری اُتریں او
اُس کو مرنے کے لئے اپنے ہاتھ سے رخصت کریں۔ سیّد صاحبؒ کو اللہ نے والدہ
ایسی دی تھیں جو حضرت اسماءؓ کا نمونہ تھیں۔ تاریخ احمدی میں یہ واقعہ مذکور ہے
کہ ایک مرتبہ ایک مقام پر کفر و اسلام میں جنگ ہوگئی۔ سیّد صاحبؒ نے جانے کی آمادگی ظاہر کی لیکن کھلانے والی نے کس
طرح جانے نہ دیا۔ والدہ محترمہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ سیّد صاحب منتظر کھڑے تھے کہ آپ سلام پھیریں تو جانے کی اجاز
طلب کریں۔ آپ نے جب سلام پھیرا تو دایہ سے کہا بی بی تمہیں ضرور احمدؒ سے محبت ہے مگر میری طرح نہیں ہوسکتی۔
روکنے کا موقعہ نہ تھا، جاؤ بیٹا اللہ کا نام لے کر جاؤ مگر خبردار پیٹھ نہ پھیرنا ورنہ تمہاری صورت نہ دیکھوں گی، آپ
تو فساد رفع ہوگیا اور فریقین میں صلح ہوگئی۔

آپکی ورزشیں

اللہ تعالیٰ جس سے جو کام لینا چاہتا ہے اس کے لئے اس کا سامان اور شوق پیدا کر دیتا ہے اور اسی قد
کی اس کی تربیت فرماتا ہے۔ چنانچہ آپ کی توجہ بہت زیادہ جسمانی تربیت کی طرف تھی۔ آپ کی عاد
تھی کہ سورج نکلنے کے گھنٹوں بعد تک ورزش و کشتی میں مشغول رہتے۔ کسی بچہ کو پیلوں پر کھڑا کرکے پانچسو ڈنڑ لگاتے پھر کچھ
کر پانچسو اور۔ اور من بھر، تیس سیر اور بیس سیر کے مگدر ہلاتے اس میں تعداد نہیں گنتے تھے بلکہ وقت کا اندازہ تھا مثلاً دو گھنٹے
گھنٹے چار گھنٹے۔

پیرنے اور پانی میں ٹھہرنے کی آپ نے بڑی مشق بڑھائی تھی سخت بہاؤ میں بہاؤ کے خلاف پیرتے۔

جب آپ جوان ہو چکے اور والدہ کا انتقال ہوگیا تو آپ تحصیلِ معاش کی خاطر اپنے چند عزیزوں کے ساتھ لکھ
نئے کچھ عرصہ وہاں ٹھہر کر آپ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں دہلی حاضر ہوئے۔ سید صاحب جب شاہ صاحب
کی خدمت میں پہلی مرتبہ حاضر ہوئے تو نہایت سادگی میں السلام علیکم کہا جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے یہ وہ زمانہ تھا
سلام مسنون کا رواج بھی ہندوستان سے جاتا رہا تھا۔ جبکہ شاہ صاحبؒ کے خاندان میں بھی اس کی رسم نہ تھی۔

شاہ صاحبؒ نے سید صاحب کا اسلام سنا تو بہت خوش ہوئے۔ اور آپ نے حکم دیا کہ آئندہ سلام بطریق مسنون کیا جائے۔

تعلیم تصوّرِ شیخ اور سیّد صاحب کا عذر

تعلیم سلوک کے ضمن میں حضرت شاہ صاحبؒ نے حسبِ معمول تصورِ شیخ کی تعلیم کی۔ سید صاحبؒ نے نہایت ادب سے عرض کیا کہ حضرت اس میں اور بت پرستی میں کیا فرق ہے اس میں صورت سنگی یا قرطاسی ہوتی ہے اور اس میں صورت خیالی، جو تہ دل جگہ پکڑ لیتی ہے اور اس کی طرف توجہ اور اس سے استعانت ہوتی ہے۔ شاہ صاحبؒ نے حافظؒ کا یہ شعر پڑھا سے

بمئے سجّادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا!

سید صاحب نے فرمایا اگر مے نوشی کا حکم ہو گناہ کبیرہ ہے تو اس کی تعمیل ہو سکتی ہے لیکن شرک نہیں ہو سکتا۔ شاہ صاحبؒ نے یہ سن کر سید صاحب کو فرطِ خوشی سے گود میں لے لیا اور مسرت و جوش سے کئی مرتبہ بوسہ دیا اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و انعام سے تم کو ولایت انبیاء سے نوازا ہے۔

کچھ عرصہ کی تعلیم کے بعد آپ رائے بریلی واپس آئے۔ کچھ مدت وطن میں ٹھیرے پھر دہلی آئے اور یہاں سے نواب امیر خاں کے پاس چلے گئے۔

نواب امیر خاں

نواب امیر خاں جو بعد میں نواب امیر الدولہ خاں بہادر والیِ ریاست ٹونک ہوئے سنبھل ضلع مراد آباد کے ایک منچلے افغانی شریف زادے اور سپاہی تھے جنھوں نے اپنی لیاقت اور تدبیر سے ایسی قوت و جمعیت فراہم کر لی تھی جس کو ہندوستان کی سیاست میں کوئی قوت آسانی سے نظر انداز نہیں کر سکتی اور اگر حالات سازگار رہتے اور ان کی جماعت میں تفرقہ نہ ڈالا جاتا تو وہ ہندوستان میں نہایت اہم عنصر ہوتی، سید صاحبؒ نے اُن کو باکار آدمی سمجھا اور خیال کیا کہ ان کی معیت و امداد سے کچھ کام ہو سکتا ہے۔ سید صاحبؒ کا یہ خیال غلط نہ تھا اور اگر بعض مجبوریاں نہ ہوتیں تو جو کام بعد میں جا کر ہو سکا تھا، پھر بھی آپ کا وہاں پہنچنا خود آپ کے لئے اور اہلِ لشکر کے لئے فائدے سے خالی نہ تھا بہت سے لوگوں کی روحانی تربیت اور اصلاح ہو گئی۔

سید صاحبؒ نواب صاحب مرحوم کے لشکر میں چھ سال سے زاید رہے آپ کا یہ زمانہ پوری مشغولیت کا تھا۔ رات کو عبادت اور دن کی مشقت سے پیروں پر ورم آجاتا لیکن آپ اپنے مقصد سے غافل نہ تھے آپ نواب صاحب کو

کو صحیح مشورے اور قیمتی امداد دیتے رہتے آخر یہ صحبت اس واقعہ پر ختم ہوگئی کہ مادھو راجپورہ پر فوج کشی کے سلسلہ میں دشمن سے صلح کر لینے کا مشورہ ہوا۔ سید صاحبؒ اس کے مخالف تھے آپ کا مشورہ جنگ جاری رکھنے کا تھا مصالحت کو کسی طرح مناسب نہ سمجھتے تھے خود نواب صاحب کی بھی خوشی تھی مگر لشکر کی بے سروسامانی اور اہل لشکر کی خود غرضی اور نااتفاقی کا عذر کرتے تھے۔ سید صاحب فرماتے کہ مصالحت کے بعد تم کچھ نہ کر سکو گے۔ لیکن نواب صاحب مصالحت میں ہی مصلحت دیکھتے تھے۔ انہوں نے اس کی تیاری کی سید صاحبؒ نے کہا اچھا آپ کفار سے ملتے ہیں میں رخصت ہوتا ہوں۔ چنانچہ آپ نواب صاحب سے رخصت ہو کر دہلی آ گئے۔

چونکہ اب آپ کو اپنے زہد و تقویٰ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مقبولیت عام عطا فرمائی تھی اس بار آپ کا دہلی آنا لوگوں کے اشہب شوق و عقیدت کے لئے ایک مہمیز رہا۔ اور لوگوں نے جوق در جوق آپ کی زیارت کے لئے آنا شروع کیا یہیں مولانا عبدالحئیؒ اور مولانا اسماعیلؒ صاحب کہ خاندان ولی اللّٰہی کے چشم و چراغ تھے آسمان علم و فضل کے مہر و ماہ تھے آپ سے بیعت ہوئے اور اس طرح آپ کو زندگی کے دو بہترین رفیق ملے جنہوں نے آخر دم تک آپکا ساتھ نہ چھوڑا۔

زاں بعد آپ مختلف شہروں دیہات و قصبات سے ہوتے ہوئے جہاں ہزارہا لوگ آپ سے فیض یاب ہوتے وطن واپس آئے یہاں آپ کے معمولات درس و تدریس کے علاوہ لوگوں کو محنت و مشقت کی ترغیب و تربیت پر مشتمل تھے۔

عسکری تربیت و مشاغل

پنجاب میں مسلمانوں کی حالت نہایت گری ہوئی تھی، سکھوں کا راج تھا اور مسلمانوں کی عزت و آبرو اور جان غیر محفوظ تھی۔ سید صاحب اُن کی مظلومی پر کڑھتے اور جہاد کی ضرورت کے احساس کو نہاں خانہ دل میں پرورش فرماتے، یہ کانٹا آپ کو ہمیشہ بے چین رکھتا، آپ کو دن رات اسی کا خیال رہتا، زیادہ تر یہی مشاغل بھی رہتے آپ اکثر اسلحہ لگاتے تاکہ دوسروں کو اسکی اہمیت معلوم ہو اور شوق ہو، بدقسمتی سے بہت سے مسلمان ان چیزوں کو تقدس و مشیخت کے خلاف سمجھتے تھے۔ لکھنؤ میں ایک مرتبہ جب آپ قندھاریوں کی چھاؤنی میں تشریف لے جا رہے تھے آپ ہتھیار باندھے ہوئے تھے اور وہ لوگ بھی جو آپ کے ساتھ تھے کہ ایک صاحب عبدالباقی خاں نے یہ دیکھ کر کہا کہ حضرت آپ کی سب باتیں تو بہتر ہیں مگر ایک بات مجھ کو بہت ناپسند ہے اور وہ بات آپ کے خاندان والا شان کے خلاف ہے۔ آج تک یہ طریقہ کسی نے اختیار نہیں کیا آپ کو وہی کام زیبا ہے جو آپ کے حضرات آباد اجداد کرتے آئے "آپ نے فرمایا وہ کونسی بات ہے کہا یہ سپر، تلوار، بندوق وغیرہ باندھنا۔ یہ اسباب جہالت ہیں یہ آپ کو نہ چاہئے " یہ سنتے ہی سید صاحب

کا چہرہ غصہ کے مارے سرخ ہو گیا اور فرمایا کہ خان صاحب اس بات کا آپ کو کیا جواب دوں اگر سمجھئے تو یہی کافی ہے کہ یہ دعا اسباب خیر و برکت ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو عنایت فرمائے تاکہ کفار و مشرکین سے جہاد کریں۔ خصوصاً ہمارے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی سامان سے تمام کفار و اشرار کو زیر کر کے جہان میں دین حق کو رونق بخشی اگر یہ سامان نہ ہوتا تو ہم نہ ہوتے اور اگر ہوتے تو خدا جانے کس دین و ملت میں ہوتے۔"

آپ کو سب سے زیادہ جہاد کا خیال رہتا تھا جس کو مضبوط و توانا دیکھتے فرماتے کہ یہ ہمارے کام کا ہے اسے لو جب فنون حرب کی مشق و تعلیم میں زیادہ انہماک ہوا اور زیادہ تر وقت اسی میں صرف ہونے لگا یہاں تک کہ سلوک کے کاموں میں کمی ہونے لگی تو رفقاء نے آپس میں باتیں کرنی شروع کیں اور مشورہ کیا کہ مولانا محمد یوسف صاحب پھلتی اس بارے میں سید صاحب سے گفتگو کریں اور جماعت کے خیالات کی اطلاع دیں۔ مولانا نے سید صاحب سے عرض کیا۔

سید صاحبؒ نے آپ کو جواب دیا کہ "ان دنوں دوسرا کام اس سے افضل ہم کو درپیش ہے اس میں ہمارا دل مشغول ہے یہ جہاد فی سبیل اللہ کے لئے تیاری ہے۔ اس کے سامنے اس حال کی کچھ حقیقت نہیں وہ کام یعنی تحصیل علم سلوک اس کام کے تابع ہے۔ اگر کوئی تمام دن روزے رکھے اور تمام دن زہد و ریاضت میں گزارے اور نوافل پڑھتے پڑھتے پیروں پر ورم آجائے اور دوسرا شخص جہاد کی نیت سے ایک گھڑی بھی بارود اڑائے تاکہ کفار کے مقابلہ میں بندوق لگاتے آنکھ نہ جھپکے تو وہ عابد اس مجاہد کے رتبہ کو ہرگز نہیں پہنچ سکتا اور وہ کام (سلوک و تصوف) اس وقت کا ہے جب اس کام (تیاری جہاد) سے فارغ البال ہو۔ اور اب جو پندرہ سولہ روز سے دوسرے انوار کی ترقی نماز یا مراقبہ میں معلوم ہوتی ہے وہ اسی کاروبار کے طفیل سے ہے کوئی بھائی جہاد کی نیت سے تیر اندازی کرتا ہے۔ کوئی بندوق لگاتا ہے کوئی پھری گر کھیلتا ہے کوئی ڈنڑ پیلتا ہے اگر ہم اس کام کی اس وقت تعلیم کریں تو ہمارے یہ بھائی اس کام سے جاتے رہیں۔ یوسف جی تم خود اپنا حال دیکھو کہ گردن ڈالے ہوئے ایک عالم سکوت میں رہتے ہو اسی طرح اور لوگ ہیں کوئی کمل اوڑھے مسجد کے کونہ میں بیٹھا ہے کوئی چادر لپیٹے حجرہ میں بیٹھا ہے کوئی جنگل جا کر مراقبہ کرتا ہے کوئی ندی کے کنارے گڑھا کھود کر بیٹھا رہتا ہے ان صاحبوں سے تو جہاد کا کام ہونا مشکل ہے تم ہمارے بھائیوں کو سمجھاؤ کہ اب اس کام میں دل لگائیں یہی بہتر ہے۔"

سید صاحب کی اب ایک اہم فریضہ کی طرف توجہ ہوئی یعنی ادائیگی حج۔ حج عرصہ سے علماء کی تاویلوں۔ فقہی موشگافیوں اور عوام کی غفلتوں سے متروک ہو گیا تھا۔ حج بہت سی مناسبتوں سے جہاد کا بھی ایک مقدمہ ہے۔

سید صاحب جن کو اللہ تعالیٰ نے اور شعائر اسلامی کو زندہ کرنے کے لئے پیدا کیا تھا فرائض کو کس طرح زندہ نہ کرتے ۔ چنانچہ آپ نے حج کی تیاری کی ۔ اور تیاری کیا کی " نیت کی " جماعت کو اطلاع دی " اہل خاندان کو شوق دلایا اور جہاں جہاں سید صاحب کے متعلقین تھے ان کو خطوط لکھوائے کہ ہم حج کو جاتے ہیں جو ہمارے ساتھ چل سکے ، چلے ۔ سارے ہندوستان میں اس کی شہرت ہوگئی کہ سید صاحبؒ حج کو جاتے ہیں ۔ چنانچہ لوگوں کے خطوط و وفود آنے شروع ہو گئے ۔ اور یکم شوال ۱۲۳۶ھ عید کے روز نماز کے بعد چار سو آدمیوں سمیت آپ عازم حج ہوئے ۔ پہلے ڈلمؤ گئے وہاں سے کلکتہ ۔ سینکڑوں آدمی اور شریک ہوئے ۔ اور مجاہدین کا یہ لشکرِ جرار سرزمینِ حجاز کی طرف روانہ ہوا ۔ اور ۲۹ شعبان ۱۲۳۹ھ دو سال گیارہ مہینے کے بعد فریضۂ حج سے فارغ ہو کر وطن پہنچے ۔

اب یہاں سے سید صاحبؒ کی زندگی کا دوسرا اہم باب شروع ہوتا ہے جس کا ذکر آئندہ صحبت میں کیا جائے گا ۔

رمزِ غلامی!
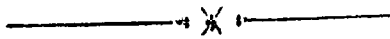
...ہ قومی میں آزادی پہ تقریریں ہوئیں — سُن کے حیراں ہو رہے تھے ایک مسجد کے امام
...جگہ تو لب کشائی کا نہ تھا موقع مگر — اپنی مسجد میں پہنچ کر یوں ہوئے گرم کلام
...محلّے کے مسلمانو! یہ دیکھو تو سہی — رہبرانِ قوم کے سر میں ہے کیا سودائے خام
...ر برپا کر رہے ہیں یہ غلامی کے خلاف — چاہتے ہیں ملک میں اپنی حکومت کا قیام
...، یہ رمزِ غلامی سے ذرا واقف نہیں — ورنہ بھولے سے کبھی لیتے نہ آزادی کا نام
...تُمُ الْاَعْلَوْنَ" آیا ہے ہماری شان میں — ہم سے بڑھکر ہو نہیں سکتا کوئی عالی مقام
...راں کہتے ہیں جنکو وہ تو خدمتگار ہیں — اہلِ دیں کیواسطے کرتے ہیں جو دنیا کے کام
...اگر اجمیر و کلیر کی زیارت کو چلیں — اُنکے ذمّے ریل گاڑی کا مناسب اہتمام
...ں ہے ہم پر نماز و روزہ و حج و زکوٰۃ — ان پہ واجب شہر میں امن و اماں کا انتظام
...ہم مشغولِ تسبیح و عبادت رہ سکیں — حق نے دے رکھا ہے انکو ملک کا ضبط و نظام
...طلاحِ عام میں محصول کہدیں یا خراج — درحقیقت ہے یہ مزدوری کا اک اچھا سا نام

کہدو اے مومن مسلمانو! تمہیں انصاف سے
کیا ملازم وُہ ہمارے ہیں کہ ہم اُن کے غلام؟

اسد ملتانی

(مضمون مکتوب گرامی شمس العلماء علامہ حافظ سید محب الحق صاحب مدظلہٗ)

بینک روڈ پٹنہ

۲۶ر ستمبر ۱۹۴۱ء

مکرم و مخلص   سلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

معارف القرآن جس کا مضمون جس کا کاغذ جس کا چھاپہ جس کی جلد اور جس کے سارے تکلفات بہ اقتضائے کلام الٰہی لاجواب ہیں اور اس پر خلوص نیت کا رنگ الگ چھایا ہوا ہے باہمہ دلکشی مجھے آپ نے عنایت فرمایا اور میں نے بھی اخلاص کے ہاتھوں ہی لیا۔ میں نہ تو خدا کا شکر ادا کر سکتا ہوں نہ اُس کے مخلصین و محسنین کا شکریہ ادا کر سکتا ہوں اور مجھے اپنے اس عجز کا اعتراف ہے۔ میں نے فوراً ہی اس کو دیکھنا شروع کیا۔ مخلصی مولوی اسلم صاحب جیراجپوری کا قابل قدر مقدمہ دیکھ کر کچھ آگے بھی دیکھا۔ یہ مقدمہ سارے کا سارا موضوع کے اندر فضولیات سے پاک اور خانہ اور صداقت سے بھرا ہوا پایا، کچھ آگے کتاب کا حصہ بھی دیکھا جہاں تک دیکھا اُس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح عکسی قرآن چھپنا شروع ہوا ہے آپ نے میری عقیدت اور خیالات کا عکسی مرقع شائع فرمایا ہے۔ اس قدر اتحادِ خیالات بھی کیا حیرت انگیز نہیں ہے۔ اب ان کی تعریف کرنا اپنی تعریف کرنا ہے۔ اور لاتزکوا انفسکم کے احاطے کے اندر ممنوع ہے۔

بہرکیف اصل کتاب تو ابھی دیکھنی باقی ہے ممکن ہے کہ بہ اقتضائے فطرت کہیں کہیں جزوی اختلاف ہو تو وہ کوئی چیز نہیں ہے۔ جب لوگوں نے قرآن میں اختلافات پیدا کئے تو اور تصنیفوں کا کیا ٹھکانا۔ باقی آئندہ آپ کیسے ہیں؟ ہم سے بعض آدمیوں نے سوال کیا کہ کتاب کی قیمت کیا رکھی ہے اور مجھے قیمت کی اطلاع نہیں مطلع فرمائیے تو بہتر ہو۔

(سید محب الحق)

وہی ہُوا

جس کا ڈر تھا۔ ہمیں پہلے ہی خدشہ تھا کہ جنگ کے اس زمانہ میں جب ہر شے روز بروز گراں ہوتی چلی جارہی ہے یہ مشکل ہوگا کہ **"معارف القرآن"** کی ایسی عمدہ جلد پھر بھی اُسی نرخ پر تیار ہو جائے جس نرخ پر پہلی قسط تیار ہوگئی ہے۔ چنانچہ یہی ہوا، اور اب جلد ساز نے اس نرخ پر جلدیں تیار کرنے سے انکار کر دیا۔ اسلئے مجبوراً جلد کی قیمت میں اضافہ کرنا پڑا۔

اب ۱۰ ر نومبر کے بعد مجلّد کتاب کی قیمت بجائے چھ روپے چار آنے کے چھ روپیہ آٹھ آنہ ہوگی۔ محصول ڈاک ایک روپیہ۔

غیر مجلّد کی قیمت وہی پانچ روپے۔ محصول ڈاک تیرہ آنہ ہے۔

ناظم ادارۂ طلُوعِ اسلام دہلی

نوجوانوں سے چند باتیں

(جناب ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب۔ جامعہ عثمانیہ۔ حیدرآباد)

[اگر ان اسباب و علل کا تجزیہ کیا جائے جن کی وجہ سے ہماری قوم آج موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ اس کا جزو اعظم ہماری شعر و شاعری ہے۔ یہ وہ تپ دق ہے جس میں آج قوم کا قریب قریب ہر نوجوان مبتلا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم کا یہی عنصر جسے ایک زندہ قوت ہونا چاہئے تھا راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گیا۔ ہماری قوم کا نوجوان اپنے تصورات کی حسین دنیا میں سرمست، حقائق سے بے نیاز، جھوٹی تعریف اور نمائشی تحسین کے کھلونوں سے کھیلتا رہتا ہے اور نہیں سمجھتا کہ قومیں کیا کر رہی ہیں اور اس کا رخ کس طرف کو ہے؟ یہ موضوع نہایت اہم ہے اور ہم ایک مدت سے ارادہ کر رہے تھے کہ نوجوانوں کی توجہ اس طرف مبذول کرائی جائے لیکن دیگر اہم مسائل نے اس کی فرصت نہ دی (اگرچہ اس کے متعلق ضمناً دو ایک مرتبہ کچھ لکھا بھی گیا[1] لیکن وہ ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کافی نہ تھا) ہم اپنے محترم ڈاکٹر صدیقی صاحب کے شکر گذار ہیں کہ انھوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا یہ ابتدا اس لئے بھی مبارک ہے کہ اگر ہم اپنی طرف سے کچھ کہتے تو قوم کے نوجوان یہ کہکر اپنے آپ کو فریب دے لیتے کہ یہ "دقیانوسی قسم کے لوگ" جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے امیال و عواطف اور فنونِ لطیفہ کی نزاکت و نفاست کو کیا جانیں! لیکن اب تو انھیں یہ کہکر خود فریبی کا موقعہ نہ رہے گا اس لئے کہ صاحب مضمون نہ صرف جدید تعلیم یافتہ بلکہ اس تعلیم میں اس مقام پر پہونچے ہوئے ہیں جس کے اعتراف میں استادانِ مغرب نے انھیں "نوبل پرائز" کا مستحق سمجھا ہے۔

ہم جناب ڈاکٹر صاحب کے اس لئے بھی شکر گذار ہیں کہ انھوں نے باوجود علالتِ طبع طلوعِ اسلام کو اپنی یاد سے نہیں بھلایا اور اپنے گرامی نامہ میں ایک اور مضمون کا وعدہ بھی فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی صحت اور عزم میں برکات عطا فرمائے۔ طلوعِ اسلام]

---

[1] ملاحظہ ہو "زبان کا مسئلہ" جو الگ پمفلٹ کی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔

چند دن قبل مجھے ایک ادبی ادارہ کی طرف سے منعقدہ مشاعرہ میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ یوں تو اس مشاعرہ میں ملک کے چند مشہور اور کہنہ مشق شاعر بھی موجود تھے اور ایک دو ہستیاں ایسی بھی تھیں جن کا باہر والے بھی احترام کرتے ہیں لیکن زیادہ تر تعداد نوجوانوں کی تھی جن میں سے اکثر نے شاید ابھی مدرسہ یا کالج کی تعلیم بھی ختم نہیں کی یا کم از کم جن کو ابھی زیر تعلیم ہونا چاہیئے۔ ان حضرات نے اپنی حیثیت اس قسم کی بنا رکھی ہے جس کو وہ شاید ایک شاعر کے لئے لازمی سمجھتے ہیں انھیں دیکھکر پیرس کے وہ "حسن کار" یاد آجاتے ہیں جو دو برس قبل تک وہاں کے اکثر کافی خانوں میں نظر آتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے نوجوانوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ طرز غالباً وہیں سے اڑائی ہے فلم کے ذریعہ سے ان "تہذیب یافتہ" قوموں کی زندگی اور ان کے رہنے سہنے کا طریقہ ساری دنیا کو معلوم ہو چکا ہے، ہمارے نوجوان بھائیوں نے بھی پیرس کے اس منظر کو پردۂ سیمیں پر اکثر دیکھا ہوگا۔ حسن کار چاہے پیرس کے ہوں یا حیدرآباد کے، ہمیں سر دست ان کے لباس یا وضع قطع سے کوئی بحث نہیں، ہم یہاں اس مسئلہ پر غور کرنا چاہتے ہیں کہ نوجوانوں کی اکثریت کا فنون لطیفہ میں اس قدر انہماک ہماری قوم کے ارتقا پر کیا اثر ڈالے گا۔

پیرس کے حسن کاروں کا ذکر آیا ہے تو ان کے متعلق کچھ تفصیل بھی نامناسب نہ ہوگی۔ ایک تو ان ماہرین کا گروہ ہے جن کو حسن کاری اور فن لطیف کا ذوق فطرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے اور جنھوں نے طویل محنت اور مشق کے بعد جگر کو خون کر کے اپنے فن میں مہارت اور شہرت حاصل کی ہے ظاہر ہے کہ اس گروہ کے خوش قسمت افراد کی تعداد بہت ہی قلیل ہے۔ دوسرے گروہ میں پیرس کے مدرسوں، یونیورسٹی اور دوسرے اداروں کے طالب علم اور ان کے علاوہ وہ نوجوان شامل ہیں جن کو ان کے والدین تعلیم کی غرض سے پیرس بھیجتے ہیں۔ ان نوجوانوں کا اصول حیات ہے

"خوش باش دمے کہ زندگانی ایں است"

اس خوش باش کے لئے پیرس میں ایک عرصے سے بنا بنایا میدان موجود ہے جس کو بوہیمین سوسائٹی (Bohemian Society) کہتے ہیں اور جو حسن کاری کے انھی نام نہاد امیدواروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ "یہ حسن کار" مختلف فنون لطیفہ کے متعلق چند سطحی معلومات حاصل کر لیتے ہیں اور ان کی بنا پر خود اپنے متعلق تعلّی اور ایک دوسرے کے کام کی مدح سرائی کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں ان کا دن سونے میں اور رات کافی خانوں اور یا اپنے کمروں میں اودھم مچائے رکھنے میں بسر ہوتی ہے ان کے بھاری بھرکم الفاظ اور لایعنی اور مہمل گفتگو سے قطع نظر کی جائے تو دنیا کے حالات سے ان کی واقفیت اتنی بھی نہیں ہوتی جو ایک معمولی پڑھے لکھے مزدور کی ہوتی ہے۔ فرانس کی نئی نسل جب اس طرح تباہ ہوئی تو اس کا نتیجہ دنیا نے جون ۱۹۴۰ء میں دیکھا کہ دس دن کے اندر جرمنی نے اتنی بڑی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ فرانس اور برطانیہ

ے اکثر مدبّروں نے اس مکمل شکست کے اسباب میں بڑا سبب نوجوان نسل کے اس دماغی اور جسمانی تعیش کو بتایا ہے۔
راقم الحروف کو موجودہ جنگ شروع ہونے سے تقریباً دو برس قبل بھی اس حالت کو مشاہدہ کرنے کا موقع ملا تھا اور
افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ خود ہمارے نوجوانوں میں بھی اس پیرس کی حالت سے کسی قدر توازیت (Parallelism)
پائی جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس خطرہ سے بروقت آگاہ کر دینا بہت ضروری ہے۔

اس میں شک نہیں کہ شاعری، موسیقی، مصوری وغیرہ فنون لطیفہ کسی قوم کی تہذیب اور ترقی کے آئینہ دار ہوتے ہیں لیکن یہ بھی بالکل صحیح ہے کہ جب یہی چیزیں حد سے زیادہ گذر کر نوجوانوں کی طبیعتوں میں عام طور پر سرایت کر جاتی ہیں تو وہ قوم کے انحطاط کی نشاں زدگی کرنے لگتی ہیں۔ مصر، بابل، یونان، روما، ایران اور چین کے زوال کے حالات کا مطالعہ کیجیے، آپ کو ان سب میں یہی ایک مشترک جزو نظر آئے گا؟

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر (اقبالؒ)

نوجوانوں میں شاعری اور ادب نوازی کی طرف عام رجحان اور انہماک کے محرکات پر غور فرمائیے، شہرت اور عزت کی خواہش ہر انسان کے دل میں کم و بیش ہوتی ہے اور ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اپنے ہم چشموں میں ممتاز حیثیت حاصل کرے، اب شہرت و امتیاز حاصل کرنے کے چند محدود طریقے ہی ہیں، حکومت۔ دولت کسی علم یا فن میں مہارت گیمس اور اسپورٹس میں غیر معمولی کمال، ان کے علاوہ ممکن ہے دو ایک طریقے اور ہوں۔ ہماری سوسائٹی کے موجودہ نظام میں حکومت اور دولت یا تو آبا و اجداد سے ورثہ میں ملتی ہیں یا کبھی اکا دکا افراد کو بالکل اتفاقی طور پر حاصل ہو جاتی ہیں۔

بہرحال دولت یا حکومت کسی قوم میں صرف معدودے چند افراد کے حصہ میں آتی ہے شہریوں کی ایک عظیم اکثریت تو اس سے کم و بیش محروم ہی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ دولت اور حکومت سے ایک قسم کا امتیاز تو حاصل ہو جاتا ہے لیکن حقیقی عزت اور ہر دلعزیزی نصیب ہونا ضروری نہیں ہے۔ یہ نعمت صرف علم، فن خطابت وغیرہ کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی ایک چیز میں کمال حاصل کرنے کے لئے سالہا سال تک صبر و استقلال کے ساتھ محنت شاقہ برداشت کرنی پڑتی ہے!

"جگر خون ہو تو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا" (اقبالؒ)

لیکن قوم میں سے جب اپج اور ہمت کا مادہ کم ہونے لگتا ہے تو اس کے افراد اور خصوصاً نوجوانوں میں مشکل پسندی کی بجائے آرام طلبی پیدا ہو جاتی ہے پہلے تو ان کا نصب العین ہی پست ہو جاتا ہے اور پھر اپنی خواہشات کی تکمیل

کے لئے وہ راستہ بھی وہی اختیار کرتے ہیں جس میں مزاحمت کم سے کم ہو چنانچہ وقتی شہرت اور زود فنا ہر دلعزیزی حاصل کرنے کا بھی ایک آسان اور سستا طریقہ ہے اپنی زبان کے چند الفاظ کو الٹ پھیر کر مرعوب کن یا خوش آئند جملے بناتے چلے جائیے اور پھر چاہے تو "نثر میں شاعری کیجیے" یا "نظم میں ساحری" نہ صرف ایک خاص طبقہ میں بلکہ ان عوام میں بھی جنھیں وقت کو خوشگوار طریقہ پر کاٹنے کی تلاش رہتی ہے آپ کو سر آنکھوں پر بٹھائے جائیں گے، کوئی اس پر غور نہیں کرتا کہ شاعر یا ادیب کوئی مکڑی تو ہے نہیں کہ اپنے ہی پیٹ میں سے جالا تنتا چلا جائے۔ شاعری اور ادب کی بنیاد تو انسان کے ذاتی تجربہ اور احساسات پر ہوتی ہے یا دنیا اور زندگی کے حقائق کے متعلق غور و فکر پر۔ یا پھر دوسرے مفکرین کے کلام کے وسیع مطالعہ اور تجربہ پر۔ اس میں شک نہیں کہ شعر و ادب میں ایک بڑا عنصر غیبی الہام و القا کا ہوتا ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ الہام و القا بھی صرف انھی لوگوں پر ہوتا ہے جنھوں نے ایک عمر کی ریاضت اور مشقت سے اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کیا ہو ہم جب ابھی مدرسہ یا کالج کی ابتدائی منزلوں میں ہوں تو سمجھنے کی بات ہے ہمارا تبصرہ، دنیا کے حقائق سے واقفیت، اوروں کے افکار کا مطالعہ، یہ سب کس قدر ناقص ہیں۔ ہمارا مبلغ علم ہی کیا جو ہمیں بلند مضامین یا بلند خیالات سوجھیں یہ نمائش بین جو بھری محفلوں میں ہماری طفلانہ نظموں اور غزلوں پر داہ داہ کے نعرے بلند کرتے ہیں ان سے ہمیں دھوکہ نہ کھانا چاہیے یہ صرف اپنی خوش وقتی چاہتے ہیں۔ بظاہر تو یہ تعریف کرتے ہیں لیکن اصل میں یہ ہمیں بے وقوف بناتے ہیں اور اپنے بے تکلف احباب کی صحبت میں ہماری سادہ لوحی کا مذاق اڑاتے ہیں۔ کیا ہم واقعی اس کا یقین کر سکتے ہیں کہ جن لوگوں کے لئے فردوسی، سعدیؒ، شیکسپیر، گوئٹے، غالبؔ، اقبالؒ، غرض دنیا کے بلند ترین شعر و ادب کو پڑھ کر لطف اٹھانے کا موقع ہمیشہ موجود ہے وہ ہمارے طفلانہ خیالات سے محظوظ ہوتے ہونگے۔ اپنے سنجیدہ لمحوں میں تو وہ انہی کلاسکس (Classics) کی طرف رجوع کرتے ہیں لیکن جب دل بہلانا یا وقت کاٹنا مقصود ہو تو پھر انھیں آپ کا ہمارا مذاق اڑانے کی سوجھتی ہے کیونکہ ہماری شاعری میں اکثر ہوتا ہی کیا ہے؟

اس عہد میں شاعر کے لئے قوت نہیں ہے
اس باغ میں طوطی کے لئے قوت نہیں ہے
لفظوں ہی کے چکر میں ہیں سب افعل و تفعل
چرخا بھی چلا کرتا ہے اور سوت نہیں ہے (اکبر)

اس کے علاوہ آپ جانتے ہیں اس دنیا میں سائنس اور میکانیت کا دور دورہ ہے آج کل نہ صرف افراد کا بلکہ

قوموں کا بھی جینا مرنا مشینوں کی طاقت پر منحصر ہے۔ یہ بحث اب بے سود ہے کہ ایسا ہونا چاہیئے یا نہیں یعنی انسان کو مشینوں کا غلام بننا چاہیئے یا نہیں۔ سوال اب اخلاقی یا مذہبی اصول کا نہیں۔ جب مشینوں کا وجود ایک امر واقعہ ہے تو ہمیں اس واقعہ سے نبٹنا چاہیئے اور اس لئے جہاں تک ہو سکے ہمارے افراد کی زیادہ تعداد کو مشینوں کا چلانا۔ انھیں درست کرنا اور موقع ملے تو انھیں بنانا بھی سیکھنا چاہیئے، اس سے ایک قدم آگے بڑھکر یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ اگر مشین بنانے کے مواقع موجود نہیں ہیں تو پیدا کئے جائیں، خانگی کمپنیوں اور خود حکومت سے اس کی درخواست کرنی چاہیئے کہ ایسے ذریعہ فراہم کئے جائیں جس سے ملکی اور قومی ضرورت کی تمام اشیا اور خصوصًا مشینیں یہیں تیار کی جائیں اور افراد قوم کو ان کے استعمال کا عادی بنایا جائے۔ یہ زمانہ نہیں کہ ہمارے نوجوان شعر و شاعری میں والہانہ منہمک رہیں۔ مشین کا جواب اشعار سے نہیں دیا جاسکتا، چاہے ان اشعار میں گل و بلبل کی داستان دہرائی گئی ہو یا کسان اور مزدور کی مظلومیت یقین مانئے کہ اوّل الذکر کی طرح آخر الذکر شاعری بھی اب فرسودہ اور پامال ہوتی چلی جارہی ہے کیونکہ زمانہ کا رجحان دیکھکر ہمارے نوجوان شاعر بلا امتیاز اس میدان میں طبع آزمائی کرنے لگے ہیں، غرض ہماری استدعا ان نوجوان بھائیوں سے یہی ہے ؎

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ (اقبال رح)

اس سے ہمارا مطلب یہ نہیں کہ تمام شاعرانہ اور ادیبانہ کوششیں یک لخت موقوف کر دی جائیں۔ بلکہ ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس بارے میں احساس تناسب سے کام لینا چاہیئے، جذبات کی فراوانی کے تحت اگر ہم کبھی کبھی اپنے خیالات اور احساسات کے اظہار کی کوشش بھی کریں تو انھیں ابتدائی مشقوں سے زیادہ اہمیت اور وقعت نہیں دینی چاہیئے۔ اپنا دل بہلانے کے لئے تنہائی میں پڑھنا یا دو چار بے تکلف دوست احباب کو اصلاح کی غرض سے سنانا جائز ہے لیکن اپنی ابتدائی مشقوں کو بھرے مشاعرہ میں پڑھنا یا اخباروں اور رسالوں میں شائع کرنا سوائے اپنی تضحیک کے اور کچھ نہیں۔ اچھا شاعر بننا اچھے سائنس داں بننے سے کہیں زیادہ مشکل ہے کیونکہ سائنس میں پھر بھی قاعدہ اور قانون پایا جاتا ہے۔ لیکن شاعری صرف خدا کی دین ہے جب تک ہمارے "نالے ابھی خام ہوں" انھیں اپنے سینے میں تھامنا" لازمی اور ضروری ہے، پختگی، غمکدہ کی تنہائی میں ہی حاصل ہوتی ہے، شاعری صرف الفاظ کی بندش اور قافیہ اور ردیف کی پابندی ہی نہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت نگاری ہے جو اپنی مخصوص زبان میں بیان کی جاتی ہے جس طرح کہ سائنس یا حکمت میں حقیقت اصطلاحی زبان میں بیان کی جاتی ہے۔ ایک ایک شعر میں کائنات کے متعلق وہ حقیقت بیان ہوتی ہے

جس کے لئے سائنس میں صفحوں کے صفحے درکار ہوتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ شاعری کے لئے کس قدر غیر معمولی مختلف اور قابلیت کی ضرورت ہے۔ اور یہ ہماری خود فریبی ہے اگر ہم سمجھیں کہ ابھی طفل مکتب رہ کر ہم شاعری اختیار کر سکتے ہیں

اگر ایں کار را کار نفس دانی چہ نادانی
دم شمشیر اندر سینہ باید نے نوازی را (اقبالؒ)

ہمارے نوجوانوں کے اس شاعرانہ اور ادیبانہ ابال کی ذمہ داری بڑی حد تک سوسائٹی اور حکومت پر بھی عائد ہوتی ہے۔ خانگی اور سوسائٹی کی محفلوں میں آؤ بھگت ان ہی لوگوں کی کی جاتی ہے جو اپنی شاعری یا لفاظی سے محفل کو گرما سکیں، انجمنوں کے پلیٹ فارم پر بے تحاشا بولنے والوں کو پیش پیش رکھا جاتا ہے چاہے چرب زبانی کے اس مظاہرہ میں کوئی کام کی بات ہو یا نہ ہو، اخباروں اور رسالوں کے ایڈیٹر صاحبان نوجوانوں سے نظمیں اور مضمون لکھواتے اور ان کی بری بھلی تحریریں شائع کرتے رہتے ہیں۔ اس سے ایک تو اخباروں اور رسالوں کے صفحوں کی تعداد پوری ہوتی ہے اور دوسرے ان پرچوں کی نکاسی بھی ہوتی ہے کیونکہ مضمون لکھنے والے اپنے اور اپنے احباب کے لئے کاپیاں ضرور خریدتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آئے دن اخباروں میں بیسیوں انجمنوں کی روئدادیں اور ہر سیاسی، سماجی۔ معاشی۔ علمی مسئلہ پر مختلف حضرات کے بیانات شائع ہوتے رہتے ہیں اور ان حضرات میں سے بھی اکثر ہمارے نوجوان طالب علم ہوتے ہیں آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں محض قیاسی باتیں لکھ رہا ہوں، ایک مقامی روزنامہ کے تجربہ کار ایڈیٹر صاحب سے گفتگو کے دوران میں اس راز کا انکشاف ہوا ہے، غرض کہ انجمنوں کے معتمدوں، مشاعروں اور کانفرنسوں کے منتظموں، اخباروں کے ایڈیٹروں اور رسالوں کے مدیر صاحبان کے تقاضوں اور ترغیبوں کی اس فراوانی میں کون نوجوان ہے جو اپنا دامن بچالے جبکہ کسی کے دل میں ذرا بھی شہرت اور امتیاز کی خواہش ہو (اور کتنے ایسے نوجوان ہیں جن کے دل میں یہ خواہش نہیں) وہ اس جال میں پھنس جاتا ہے، پھر دوست احباب کی ہمت افزائی بزرگوں کی شاباش اور حاضرین محفل کی واہ واہ (چاہے طنز آمیز ہی کیوں نہ ہو) اس شعلہ اشتیاق کو بھڑکاتی ہے۔ اس کے بعد کیا تعجب ہے اگر ہمارے نوجوان محنت و مشقت کی زندگی سے جی چرانے لگیں اور نمود و نمائش کے مشاغل کو ترجیح دیں۔

مشتے نمونہ از خروارے، یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے چند دن قبل ایک مقامی اخبار کے ایڈیٹر صاحب نے "انسداد گداگری" پر دو تین کالموں کا اداریہ تحریر فرمایا، اس کے دوسرے دن اس اخبار میں اسی عنوان کا تقریباً اسی قدر طویل مضمون ایک ایسے بزرگ کا شائع ہوا جنھیں کافی عمر کے باوجود علمی اور صحافتی میدان کا کچھ زیادہ تجربہ نہیں تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب انھوں نے اس کمی کو پورا کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ ان بزرگ کے مضمون کا تین

چوتھائی حصہ ایک دن قبل چھپے ہوئے اداریہ کے مختلف ٹکڑوں کو واوین کے اندر لفظ بہ لفظ نقل کر دینے پر مشتمل تھا اور بقیہ چند سطریں اس طرح کے جملوں پر مشتمل تھیں "جیسا کہ مدیر اخبار نے لکھا ہے" یا "مدیر اخبار بجا فرماتے ہیں" وغیرہ مضمون نگار صاحب کا مقصد اچھی طرح پورا ہو جاتا اگر وہ صرف یہ ایک جملہ لکھ دیتے کہ "ہمیں مدیر اخبار کی رائے سے لفظ بہ لفظ اتفاق ہے" کیونکہ بالآخران کی ساری خامہ فرسائی کا ماحصل یہی تھا۔ لیکن اس طرح لیڈری کی خواہش کیسے پوری ہوتی اور مضمون کے اخبار میں چھپنے کا امکان کیسے نکلتا؟ دوسری طرف ایڈیٹر صاحب کو اخبار کے مقررہ صفحوں کی تعداد پر کرنے کے لئے مواد کہاں سے ملتا اور خریداروں کی تعداد میں اضافہ کیسے ہوتا؟

اس کے علاوہ ان مضمونوں میں صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جائیے کام کی بات شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ مضمون نگار ہر وادی میں بھٹکتے ہیں لیکن حاصل کچھ نہیں کرتے ؎

دشت و کہسار نوردید و غوغائے نگرفت

طوف گلشن زد و یک گل بہ گریبانش نیست (اقبالؒ)

خود حکومت نے اپنی اعلیٰ قسم کی ملازمتوں کے لئے امیدواروں کے انتخاب کے جو طریقے مقرر کئے ہیں ان سے نوجوانوں کے اس عام رجحان کو اور تقویت ہوتی ہے۔ سیول سروس وغیرہ کے مقابلہ کے امتحانوں میں کامیابی کا دارومدار انگریزی تقریر و تحریر کو کیا گیا ہے ہماری سمجھ میں اب تک نہیں آیا کہ آخر اچھی تقریر کر لینے یا اچھے مضمون لکھنے اور حکومت کے مسئلوں کو سلجھانے یا نظم اور ضبط کو قائم رکھنے میں کونسا منطقی تعلق ہے، اگر حکومت کو محکمہ کروڑگیری یا مال یا پولیس کے لئے کسی عہدہ دار کی تلاش ہے تو کیا ضرورت ہے کہ ادب، تاریخ، یا معاشیات کے طلبا میں سے ہی انتخاب کیا جائے (موجودہ طریقہ انتخاب میں زیادہ کامیابی اسی نہج کے طلبا کو ہوسکتی ہے) کیا ایک میکانک یا اورسیر یا علمی سائنس کا طالب علم اس عہدہ کے فرائض کو انجام نہیں دے سکتا؟ جب تک حکومت اپنی پالیسی نہیں بدلے گی نوجوان لامحالہ انھیں مضمونوں کی طرف مائل ہونگے جو انھیں شاعری، لفاظی اور آخرکار ——— "لیڈری" سکھاتے ہیں۔ اس ملک میں مشاعرے اور کانفرنسیں تو ہر روز منعقد ہو سکیں گی، لیکن وقت ضرورت ایک سوئی بھی کوئی نہیں بنا سکے گا اور آخر وہی نوبت آئے گی، کہ نہ صرف زندگی میں بلکہ مرنے کے بعد بھی ہم کفن اور دفن کے سامان کے لئے غیروں کے دست نگر رہیں گے۔ افراد اور اقوام کی زندگی کا یہ ناقابل انکار اصول ہے کہ پہلے ضروریات زندگی کی تکمیل کیجائے، اور پھر عیش و عشرت کے سامان کی فراہمی کی طرف رجوع ہوں؛ اس وقت شعر و سخن ہمارے لئے ذہنی تعیش سے زیادہ نہیں سوائے ان صورتوں کے جن میں شاعری سے پیغمبری کا کام لیا جائے۔ ہماری قوم کے بقا، تحفظ اور ترقی کے لئے سائنس اور مشین ضروریات میں داخل ہیں۔ ہماری

انفرادی اور اجتماعی کوششیں زیادہ تر اسی طرف مرکوز رہنی چاہییں۔ رسالہ المعلم بابتہ اسفندار سنہ ۱۳۳۵ف کے مضمون "ہماری ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم" میں میں نے اس نکتہ کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا ہے۔

حقائق و عِبَر

راز کی بات

مِلّتِ اسلامیہ کی فلاح و بہبود کا احساس رکھنے والے حضرات مارے مارے پھر رہے ہیں کہ کسی طرح اس سوختہ بخت قوم کے درد کا درماں مل جائے۔ لیکن کوئی تدبیر کارگر اور کوئی تجویز کامیاب نہیں ہوتی۔ کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں۔ تحقیقاتی کیشن بٹھائے جاتے ہیں۔ ارباب بست وکشاد آئے دن سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں۔ لیکن قوم ہے کہ روز بروز نکبت و افلاس کے ہلاکت آفریں گڑھے کی طرف بڑھے چلی جا رہی ہے۔ عقل حیران ہے۔ تدبّر سر بزانو ہے۔ فکر انگشت بدنداں ہے کہ۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا؟ کیوں کوئی تدبیر کارفرما نہیں ہوتی؟ کیوں کوئی علاج موثر ثابت نہیں ہوتا؟ لیکن مبارک ہو کہ بالآخر "قدرت" کو اس شوریدہ خاطر قوم کی اس کس مپرسی اور مظلومی پر رحم آ ہی گیا اور بریلی شریف کے ایک مولوی صاحب نے قوم کے اس افلاس و زبوں حالی کے اصل راز کو پا لیا۔ اور راز کو پا لینے کے بعد کسی بخل سے کام نہیں لیا بلکہ یہ راز کی بات بھری بزم میں کہدی کہ فائدہ اُٹھانے والے اس سے فائدہ اُٹھائیں اور یوں مارے مارے نہ پھریں۔ سُن لیجئے کہ وہ راز کیا ہے؟ مولوی صاحب نے فرمایا:۔

> "سنّی بھائیو! لوگ کہتے ہیں مسلمان غریب ہیں مفلس ہیں اور نادار ہیں، دولت و ثروت اور حکومت سے محروم ہیں۔ اور پھر مسلمانوں کی دُنیوی ترقّی کے لئے دولت و ثروت اور حکومت کی واپسی کے لئے کانفرنسیں کی جاتی ہیں۔ انجمنیں بنائی جاتی ہیں۔ اور تدبیریں سوچی جاتی ہیں حالانکہ یہ سب بیکار اور فضول باتیں ہیں۔ لوگ چونکہ اصلی بات اور اُس کے حقیقی سبب سے ناواقف ہیں اس لئے یہ فضول کام کرتے اور اپنا سر کھپاتے ہیں۔ — بھائیو! آج میں آپ کو اس کا اصلی راز بتاتا ہوں اتنی بات پر تو سب کا اتفاق بلکہ ایمان ہے کہ زمین و آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کے بعد ہم

مسلمانوں خصوصاً سنّیوں کا یہ بھی عقیدہ اور ایمان ہے کہ اللہ پاک نے زمین وآسمان
کے سارے خزانے اپنے حبیب پاک صاحب لولاک حضرت احمد مجتبےٰ محمد مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم
کو سپرد فرما دیئے ہیں اور اب سب کچھ حضور اقدس ہی اپنے ہاتھ سے تقسیم فرماتے ہیں۔ دُنیا
میں جس کسی کو جو کچھ مل رہا ہے وہ حضور ہی کی عطا سے مل رہا ہے تو بھائیو! دنیاوی دولت وحکومت
میں سے حضور بالقصد اپنے اُمتیوں کو کم حصّہ دیتے ہیں تاکہ لوگ یہ نہ کہیں کہ حضور اپنے امتیوں کو
زیادہ بخشتے ہیں — بس یہ ہے راز مسلمانوں کی غریبی اور حکومت وسلطنت سے اُن کی محرومی کا۔"

لیجئے صاحب! بات صاف ہوگئی۔ معاملہ واضح ہوگیا۔ اب مسلمانوں کی خوشحالی اور کامرانی کے لئے جدوجہد
نہ صرف عبث ہے کار ہی ہے بلکہ (ان محقق صاحب کی تحقیق کے مطابق) جنابِ سرور کائنات کی منشاء کے خلاف۔
لہٰذہ معصیتِ رسولؐ۔ غالبًا یہی وجہ ہے کہ ہمارے جمعیت العلماء کے مولوی صاحبان مسلمانوں کی مرکزیت، جداگانہ
تشخص اور خالص اسلامی اجتماعی زندگی کے خلاف ہیں۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان چیزوں سے اس قوم میں خوش بختی
اور فارغ البالی، حکومت وثروت آجائے گی اور یہ چیز (اس تحقیق کی روسے) معصیتِ رسولؐ ہے۔ اب یہ بھی
معلوم ہوگیا کہ حضرت علّامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے جو فرمایا تھا۔ کہ

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال، بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

تو اس کا کیا مفہوم تھا؟ کس قدر احسانِ عظیم ہے ملّتِ اسلامیہ پر ان مولوی صاحب کا جنھوں نے اتنی کاوش
وجگر سوزی کے بعد اس نکتۂ دقیقہ کو پالیا اور اس کے بعد مسلمانوں کو آگاہ کر دیا کہ ہوش میں آؤ! کدھر جا رہے ہو!!
لیکن ایک بات ذرا تفصیل طلب رہ گئی۔ شاید مولوی صاحب اسے بھی واضح فرما دیں۔ یعنی نبی اکرمؐ اپنے اُمتیوں کو زیادہ
کچھ اس لئے نہیں دیتے کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ دیکھئے سب کچھ اپنوں کو ہی دیدیا۔ لیکن اللہ میاں کو (معاذاللہ) اس بات
کا خیال نہیں آیا اور اس نے سب کچھ اپنے حبیبؐ کے حوالے کر دیا؟ اللہ میاں کو بھی تو یہ خیال رکھنا چاہئے تھا کہ کہیں
لوگ یہ نہ کہیں کہ سب کچھ اپنوں کو ہی دے دیا۔ خدا اور رسولؐ کے مسلک میں یہ کھلا ہوا اصولی اختلاف ہم عامیوں
کی سمجھ میں نہیں آسکتا!۔

مولوی صاحب نے مسلمانوں کے تنزل و افلاس کی جو وجہ بیان فرمائی ہے اس پر آپ ایمان لائیں یا نہ لائیں لیکن اس حقیقت کے اعتراف میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہوگی کہ جس قوم میں ایسے ایسے "دیدہ ور" موجود ہوں اس کے تنزل و ادبار کی وجوہات معلوم کرنے کے لئے کسی تحقیقاتی کمیشن کی ضرورت باقی نہیں رہتی - اللہ کا عذاب مختلف قوموں پر مختلف شکلوں میں رونما ہوتا رہتا ہے - ہم پر وہ عذاب ایسے ایسے مولوی صاحبان کے پیکر میں نازل ہو رہا ہے -

شامتِ اعمالِ ما - صورتِ مُلّا گرفت

یہ ہے برگِ حشیش کا وہ بادۂ ہلاکت آمیز جس کا نام محبّتِ رسولؐ کی مئے حیات آور رکھا جاتا ہے!

۲- جیتی رہو!

آج کل اخبارات میں شادی بیاہ کے معاملات کے متعلق اشتہار بازی ایک عام روش ہوگئی ہے - ۱۸ اگست کے ہندوستان ٹائمز میں دو "وسیع القلب - مہذب اور جاذبِ نگاہ" دوشیزگان کی طرف سے ایک اشتہار شائع ہوا - ان میں سے ایک ہندو لڑکی ہے اور دوسری مسلمان - ہندو لڑکی نے لکھا تھا کہ وہ کسی مسلمان سے شادی کرنا چاہتی ہیں اور مسلمان لڑکی نے لکھا تھا کہ وہ کسی ہندو نوجوان سے وابستۂ دامن ہونے کا ارادہ رکھتی ہیں - اشتہار نکلا اور اس کے بعد کوئی چیز منصۂ شہود پر نہ آئی - فتح گڑھ (یو- پی) کے ایک مسلمان صاحب نے محسوس کیا کہ دنیا ایسی کور ذوق ہوچکی ہے کہ کسی نے ان "دیویوں" کے اس عزم و ہمت اور متحدہ قومیت کے لئے اس جاں فروشانہ اقدام کی داد ہی نہیں دی - چنانچہ انھوں نے اپنے جوش کے تقاضے سے ہندوستان ٹائمز مورخہ ۲۹ ستمبر ۱۹۴۱ء میں ایک طول طویل مکتوب شائع کردیا ہے - جس میں ان مُصلحاتِ قوم کی اس ہمت کی جی بھر کر داد دی ہے جس کے دوران میں وہ رقمطراز ہیں :-

"یہ دونوں جوان باغی (لڑکیاں) - باغی نہیں بلکہ مُصلح - جنھوں نے یہ اشتہار دیا ہے! میں انھیں خوش بختی کی دعا دیتا ہوں - خدا کی برکات ان کے ساتھ ہوں - میرا سرِ نیاز ان کے حضور جھک رہا ہے - میں انھیں ہندوستان کی نشاۃِ ثانیہ کے لئے مقدمۃ الجیش سمجھ کر ان کی بارگاہ میں ہدیۂ سلام پیش کرتا ہوں - خدا ان کے ہم وطنوں کو بھی اس قسم کی بصیرت عطا فرمائے کہ وہ بھی ان کے نقشِ قدم پر چلیں ...... مجھے یقین ہے کہ مادرِ ہند ان پر فخر کرے گی اور انھیں

شاباش دے گی کہ انھوں نے اپنے عقیدہ اور عمل سے ثابت کر دیا ہے کہ وہ اس کی سچی بیٹیاں ہیں۔"

اب ان داد دینے والے مسلمان سے یہ بھی سُن لیجئے کہ ان کے نزدیک ان لڑکیوں کے اس اقدام کو سراہنے کی وجوہات کیا ہیں؟ فرماتے ہیں:۔

"اس کے لئے ہمارے پاس مہاتما گاندھی سب سے بڑی سند ہیں۔ انھوں نے ۱۳ راپریل ۱۹۴۷ء کے ہریجن میں لکھا تھا کہ میں یقیناً اس خیال کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنا چاہتا ہوں کہ یہ لاکھوں ہندوستانی جو ابھی چند دنوں پیشتر ہندو تھے۔ جب مسلمان ہوگئے تو مذہب کی تبدیلی کے ساتھ ہی ان کی قومیت بھی بدل گئی!"

یہ دلیل ہے قومیت کے نقطۂ خیال سے۔ اب دوسری دلیل مُلاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں:۔

"وہ کون سی بات ہے جو اس قسم کی مخلوط شادیوں سے مانع ہو سکتی ہے؟ اس قسم کی شادیوں پر کیوں پابندیاں عائد کی جاتی ہیں اور انھیں آئے دن کے فسادات اور خونریزی کا سبب کیوں بنا دیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ مذہب نے یہ حیثیت اختیار کر رکھی ہے کہ جس جس تک اس کا ہاتھ پہنچ سکتا ہے وہ اس کے اخلاق کا محافظ ہے اور پھر اخلاق کو خدا کے قوانین کے تابع نہیں رکھتا بلکہ اُسے عہدِ قدیم کی قبائلی رُسومات اور توہم پرستانہ عقائد پر قائم کرتا ہے جنھیں کوئی سمجھدار آدمی برداشت نہیں کر سکتا" (یہ آخری الفاظ انھوں نے مسٹر ڈی۔ ایف۔ کراکا کی کتاب سے اقتباساً لکھے ہیں) یہ عہدِ قدیم کے فرسودہ معتقدات ہیں جو مُلک کی ترقی اور آزادی کی راہ میں حائل ہیں۔"

ہمیں نہ تو ان بلند حوصلہ۔ وسیع القلب۔ روشن خیال۔ بھارت ورش کی سپوت بیٹیوں سے کوئی علاقہ ہے نہ ان کو داد دینے والے قومیت پرست مُسلمان صاحب سے کچھ دلچسپی۔ دلچسپی صرف اتنی ہے کہ انھوں نے خود تسلیم کیا ہے کہ مذہب نے اخلاقیات کی بنار خدا کے قوانین کی بجائے انسانوں کے رسمی معتقدات کو قرار دے رکھا ہے یعنی اگر خدا کے قوانین کے مطابق اخلاقیات کی بنیادیں قائم کر دی جائیں تو یہ روش ان کے نزدیک بالکل درست اور عقل و بصیرت کے مطابق ہے۔ اب دیکھئے کہ مسئلہ زیرِ نظر کے متعلق خدا کا قانون کیا کہتا ہے۔ ان صاحب کے نام سے ظاہر ہے کہ یہ مُسلمان ہیں۔ اور ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن کریم کو خدا کا قانون سمجھے۔ اِس

خدا کے قانون میں مشرکین کے ساتھ مناکحت کے متعلق ارشاد ہے کہ

وَلَا تَنكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ ۲/۲۲۱

"اور مشرک عورتوں سے نکاح مت کرو، جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مشرک عورت تمھیں (بظاہر) کتنی ہی پسند کیوں نہ آئے لیکن مومن عورت اس سے کہیں بہتر ہے۔ اسی طرح مشرک مرد جب تک ایمان نہ لے آئیں۔ مومن عورتیں ان کے نکاح میں نہ دی جائیں۔ یقیناً خدا کا مومن بندہ ایک مشرک مرد سے بہتر ہے۔ اگرچہ (بظاہر) مشرک مرد تمھیں کتنا ہی پسند کیوں نہ ہو۔ یہ (مشرکین) تمھیں آگ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ تمھیں جنت و مغفرت کی طرف بلا رہا ہے۔ اللہ لوگوں کی ہدایت کے لئے اپنی آیتیں واضح کر دیتا ہے تاکہ متنبہ ہوں اور نصیحت پکڑیں۔"

فرمائیے اس کے بعد کیا ارشاد ہے ؟

ذرا غور کیجئے۔ ہمارے مولوی صاحبان کی یہ کیفیت ہے کہ مسجد میں کوئی نوجوان نماز پڑھنے کے لئے آجائے تو پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ تمھارے ٹخنے ڈھکے ہوئے ہیں۔ آستینیں کھلی ہیں۔ داڑھی منڈی ہوئی ہے۔ سر کے بال انگریزی ہیں۔ کوٹ کی لمبائی چھوٹی ہے۔ لیکن ان کے سامنے آئے دن قومیت پرست نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی طرف سے اس قسم کی چیزیں شائع ہوتی رہتی ہیں جو علانیہ مذہب کے خلاف بغاوت لئے ہوتی ہیں۔ لیکن یہ حضرات ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ یہ علماء حضرات خود قومیت پرست واقع ہوئے ہیں ان کی اپنی یہ حالت ہے کہ قرآن کریم بنصِ صریح مشرکین کو نجس قرار دیتا ہے۔ لیکن یہ آئے دن انہی مشرکوں کے ساتھ مل کر ان کے ہاں کا پکا ہوا کھانا مزے لے لے کر کھا جاتے ہیں۔ اس لئے جب نوجوان ایک قدم اور آگے بڑھ کر اس قسم کی مخلوط شادیوں کی تحریک پیش کرتے ہیں تو یہ حضرات زبان نہیں ہلا سکتے اور اس لئے بھی کہ انھیں معلوم ہے کہ ان کے نشتر کی زد خود انھیں میں کے بعض قومیت پرست حضرات کی دکھتی ہوئی رگ تک پہنچ جائے گی۔ چنانچہ کفر والحاد کے یہ اسلام سوز مظاہرے آئے دن ہوتے رہتے ہیں اور ان محافظِ ناموسِ دین کے مدعیان کی زبان سے ایک حرف احتجاج و مخالفت کا نہیں نکلتا۔ وہ ہے قوم کا نوجوان طبقہ اور یہ ہیں ان کے مرشدانِ طریقت۔

اُن کی سند بھی گاندھی جی اور اِن کے خضرِ راہ بھی وہی۔ اس لئے دینِ حقہ وہ جو اکبر نے جاری کیا اور جس کی تبلیغ آج متحدہ قومیت کے فریبِ نگاہ نقاب کی آڑ میں زندگی کے ہر شعبے میں جاری و ساری ہے۔

۳۔ مہذب بربریت

برٹش ایسوسی ایشن کے صدر، سر رچرڈ گریگوری نے اپنی جمعیت کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

"جس کرب و الم میں آج دنیا مبتلا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ علم کا استعمال ناجائز ہو رہا ہے اور مہذب بربریت نے زندگی کے بلند مقاصد و مطامح کو ٹھکرا رکھا ہے۔" (ہندستان ٹائمز ۲۹)

جس چیز نے آج تک تہذیبِ مغرب کو محکوم قوموں کی نگاہ میں اس قدر درخشندہ و تابناک بنا رکھا ہے وہ ان کی علمی تحقیق (سائنس کے انکشافات) ہے۔ لیکن غور فرمائیے کہ علم و عقل کے ان مُدعیان کا اپنی اس متاعِ عزیز کے بارے میں کیا فیصلہ ہے۔ وہی فیصلہ جو آج سے چودہ سو برس پیشتر قرآن کریم کی بارگاہ سے صادر ہوا تھا دانایانِ فرنگ بالآخر اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ علم اچھی چیز ہے لیکن اس کا غلط استعمال تریاق کو زہر بنا دیتا ہے آب سوال یہ ہے کہ وہ کون سی کسوٹی ہے جس سے یہ پرکھا جا سکے کہ علم کا فلاں استعمال غلط اور فلاں صحیح ہے۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ اگر انسان علم کو اپنی خواہشات کے ماتحت استعمال کرے تو یہ سرکش قوت پیکرِ فنا و ہلاکت بن جاتی ہے۔ لیکن اگر اسے احکامِ خداوندی کے تابع رکھا جائے تو یہی علم دنیا میں جنت پیدا کر دیتا ہے مغرب نے علم الاشیاء کی تحصیل تو کرلی۔ لیکن

عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا (اقبالؒ)

جس کا نتیجہ یہ کہ آج کائناتِ انفس و آفاق کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو علم کے اس غلط استعمال کی وجہ سے جہنم نہ بن رہا ہو۔ دُنیا کے نظام کو انسانی خواہشات کے تابع چلانا شرک ہے اور یہ شرک انسان کو ہلاکت کے جہنم کی طرف لے جاتا ہے

اَفَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ

اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ ۝ ۲۳/۴۵

کیا تم نے اُسے بھی دیکھا جس نے اپنی خواہشات کو ہی اپنا خدا بنا لیا ہو۔ اور اُسے اللہ (کے قانون نے اس طرح) علم کے باوجود گمراہ کر دیا ہو۔ اور اس کے کانوں پر اور دل پر مُہر لگا دی ہو اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہو۔ ایسے شخص کو اللہ (کے اِس فیصلے) کے بعد کون ہدایت دے سکتا ہے۔ کیا تم (اس کے بعد بھی) نصیحت نہیں حاصل کرتے؟

لیکن یہ عملی شرک کا نظامِ زندگی کب تک قائم رہ سکتا تھا۔ کوہِ آتش فشاں کے دامن میں کب تک امن و سکون سے رہا جا سکتا ہے۔ یہ آتش گیر مادہ پھوٹا اور زندگی کی ہر علامت کو راکھ کا ڈھیر بنا کر بڑھتا ہوا آگے چلا گیا اور چلا جا رہا ہے۔ دنیا کو اس آگ اور خون کے بپتسمہ کے بعد ایک نئی زندگی ملنے والی ہے جس میں علم، قوانینِ الٰہیہ کے۔ یعنی عقل، عشق کے تابع رہے گی۔ اور اُس وقت انسان اس منزل کی طرف جادہ پیما ہوگا جو اُس کی زندگی کے ارتقائی مراحل کا نقطۂ ماسکہ ہے۔ وَھُدُوْا اِلٰی صِرَاطِ الْحَمِیْدِ

۴۔ شیشہ باز

مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کے اجلاس منعقدہ بمبئی میں، ڈیفنس کونسل سے استعفےٰ دینے کے سوال پر سر سکندر حیات خاں صاحب نے جو روش اختیار کی تھی اس کے متعلق ہم نے ستمبر ۱۹۴۱ء کی اشاعت میں تفصیلاً لکھا تھا۔ آپ ایک نظر سے اُسے پھر دیکھئے اس کے بعد غور کیجئے کہ کیا حقیقت وہی نہ تھی جس کا ہم نے ذکر کیا تھا۔ اس روش سے بعض حلقوں میں یہ شبہ ہونے لگ گیا تھا کہ خدانکردہ کہیں یہ سچ مچ کے مسلم لیگی تو نہیں ہو گئے۔ انھوں نے اس شبہ کو بھانپا اور اپنی صفائی میں ایک ایسی نئی چال چلے جو کسی کے حیطۂ تصور میں بھی نہ تھی۔ یعنی انھوں نے مسٹر چرچل کے بیان کے جواب میں ایک ایسا بیان شائع کرایا جس سے اپنے پرائے سب محوِ حیرت ہو گئے۔ اپنے اس لئے کہ وہ مسلم لیگ کے اس بنیادی نصب العین کے سراسر خلاف تھا جس کے لئے اس ملی جماعت کا وجود قائم ہے۔ اور پرائے اس لئے کہ وہ اس کا خیال بھی نہ کر سکتے تھے کہ وہ "فرقہ پرستی" کا لیبل چھپانے کے لئے اس قسم کا متشدد قومیت پرست چولا پہن لیں گے۔ انھوں نے واضح الفاظ میں کہدیا کہ مسٹر چرچل کا بیان یکسر ناتسلی بخش ہے۔ انھیں چاہئے کہ جنگ کے بعد

ہندوستان کی پوزیشن کے متعلق ایک واضح اور غیر مبہم بیان شائع کریں۔ یعنی

" جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ واضح الفاظ میں ہندوستان کی مستقبل کی حیثیت کو بیان کر دیا جائے اور اس بات کا وعدہ دیا جائے کہ ملک کے مختلف مفاد کے نمایندوں کی ایک منتخب جماعت متشکل کی جائے گی جس میں انگریزوں کے نمایندے بھی شامل ہوں جو ایک متفقہ دستورِ حکومت مرتب کرے۔ لیکن اگر وہ جماعت ایک وقتِ معینہ کے اندر اس قسم کا متفقہ دستور مرتب نہ کر سکے تو پھر حکومتِ برطانیہ ان عناصر کے تعاون سے جو دفاعِ ملک کے مسئلہ میں (حکومت کے) مددگار رہوں، ایک مناسب دستورِ اساسی مرتب کر دے۔ جس کی رو سے ہندوستان کو درجۂ نوآبادیات (ڈومینین اسٹیٹس) عطا کر دیا جائے۔"

(ہندوستان ٹائمز ۱/۱۱ ۲)

انھوں نے اس دستورِ حکومت کی مزید تشریح ان الفاظ میں فرمائی

" وہ بنیادی ڈھانچہ جس کے مطابق اس دستورِ حکومت کو مرتب کیا جائے گا اس کمیٹی کے فیصلہ پر چھوڑ دیا جائے۔ یعنی یہ چیز کہ مثلاً آئینِ حکومت فیڈرل انداز کا ہو یا کانفیڈریسی انداز کا۔ یا کسی اور انداز کا۔ جس سے اس ملک کے کوائف کے مطابق اور مقتضیات کو پورا کر سکے۔" (ہندوستان ٹائمز ۱/۱۱ ۷)

ان ہر دو بیانات کو غور سے پڑھئے اور دیکھئے کہ یہ تحریک کس طرح مسلم لیگ کے بنیادی مطالبہ کے خلاف ہے۔ مسلم لیگ نے ڈومینین اسٹیٹس کو ٹھکرایا۔ فیڈرل اندازِ حکومت کی یکسر مخالفت کی۔ اور اسی کی مخالفت کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان میں فیڈریشن آتے آتے رہ گئی۔ پھر مسلم لیگ نے حکومتِ برطانیہ کی اس تحریک کی مخالفت کی کہ تمام ہندوستان کی سیاسی جماعتیں مل کر ایک متفقہ نظامِ حکومت مرتب کریں۔ مسلم لیگ نے واضح الفاظ میں کہدیا کہ مسلمانانِ ہند کو کوئی ایسا نظامِ حکومت قابلِ قبول نہ ہوگا جو ان کی اکثریت کے لئے پاکستان کا قیام اپنے اندر نہ لئے ہوگا۔ مسلم لیگ کا بس ایک ہی مطالبہ ہے اور ایک ہی نصب العین۔ سر سکندر حیات خان صاحب نے مسلم لیگ کی اس تمام جدوجہد اور پیہم کدوکاوش کے علی الرغم یہ تحریک پیش کر دی اور صرف

پیش ہی نہیں کر دی بلکہ اس کے ساتھ یہ دھمکی بھی دی کہ

"اگر انگریزوں میں تدبرِ سیاسی کی کوئی سمجھ بوجھ باقی ہے تو انھیں چاہیئے کہ میں نے جس قسم کی تجویز پیش کی ہے اس کے مطابق فوراً اعلان کریں۔ اگر دو یا تین ہفتے کے اندر ایسا نہ کیا گیا تو میں بلا تامل تمام سیاسی جماعتوں سے اپیل کرونگا کہ وہ ایک متحدہ محاذ قائم کر دیں۔" ہندوستان ٹائمز ۴)

اس گیدڑ بھبکی کے دو ہی چار روز بعد مسٹر ایمرے نے دارالعوام میں صاف صاف کہدیا کہ مسٹر چرچل کا بیان حکومت کے سابقہ اعلانات پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتا۔ جس قسم کے اعلان کا مطالبہ سر سکندر حیات خاں صاحب نے کیا تھا۔ اس کا مسٹر ایمرے کی تقریر میں اشارہ تک بھی نہ تھا۔ اب چشمِ فلک اس تماشے کے لئے یکسر اضطراب تھی کہ دیکھیں اب کون سا "متحدہ محاذ" قائم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ مسٹر ایمرے کی طرف سے اس برتاؤ کے بعد اس کے سوائے اور چارہ کار ہی کیا رہ سکتا تھا۔ مسٹر ایمرے کو بیان دیتے ہوئے دو ہفتے گذرے لیکن سر سکندر ہیں کہ گونگے کا گڑ کھائے بیٹھے ہیں۔ بالآخر دو ہفتے کے سکوت کے بعد مُہرِ خاموشی ٹوٹی اور آپ نے فرمایا کہ "جس حد تک مسٹر ایمرے نے کہا ہے بالکل تسلی بخش ہے" (ہندوستان ٹائمز ۲۴) سبحان اللہ! اس دھمکی کے بعد کیسا عمدہ رویہ ہے جو اختیار کیا گیا۔ اس مقام پر ہمیں بے اختیار ایک لطیفہ یاد آگیا۔ ایک پوربیہ سائیس مالک کی خوشامد کرتے کرتے تنگ آگیا تو اس نے سوچا کہ اب دھمکی سے کام نکالنا چاہیئے۔ اس کے بغیر مالک تنخواہ میں اضافہ نہیں کرے گا۔ مالک دور سے آرہا تھا کہ اس نے چلانا شروع کر دیا کہ یہ بہت بڑا ظلم ہے۔ بڑی زیادتی ہے۔ ہم کام کرتے کرتے مر گئے ہیں اور ہماری تنخواہ میں آجتک اضافہ نہیں ہوا۔

اتنے میں مالک قریب آگیا اور اس نے کھونٹی کے ساتھ لٹکے ہوئے چابک کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ سائیس نے اپنے احتجاج کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اب آپ کو ہماری تنخواہ بڑھانی پڑے گی! اگر آپ نے تنخواہ نہ بڑھائی تو ....

اتنے میں مالک کا ہاتھ چابک تک جا پہنچا تھا۔ مالک نے کہا۔ ہاں! اگر تنخواہ نہ بڑھائی تو........ یہ کہکر مالک آگے بڑھا۔ تو نوکر بولا ۔۔ اگر تنخواہ نہ بڑھائی تو حضور! ہم پھر اسی تنخواہ پر کام کریگا!!

کس قدر افسوسناک تھی ہمارے اس فریب خوردہ بھائی کی روش اور کیسا عبرت انگیز تھا اس کا انجام۔ اور یہ سب اس لئے کہ کسی طرح ہندو خوش ہو جائیں کہ جناب سر سکندر حیات خاں صاحب فرقہ پرست نہیں ہیں بلکہ آزادیٔ ہند کے حصول کے لئے گاندھی جی سے بھی چار قدم آگے ہیں۔ لیکن جس مضحکہ انگیز اور نفرت آمیز طریقہ سے ہندوؤں نے اُن کی اس طفلانہ روش کا استقبال کیا۔ دیدۂ عبرت کے لئے سبق حاصل کرنے کے لئے وہ کافی سے زیادہ تھی۔ جو اپنی جماعت کو چھوڑ کر دوسروں کے ہاں عزت کا متلاشی ہوتا ہے اس کا یہی حشر ہوا کرتا ہے۔

لیکن ہمیں سر سکندر حیات خاں صاحب سے کہیں زیادہ افسوس خود مسلم لیگ پر آتا ہے کہ ان تمام باتوں کے باوجود سر سکندر لیگی وزیر بھی ہیں اور لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن بھی! ہم آج تک نہیں سمجھ سکے کہ بالآخر لیگ کی اس روش کا مقصد کیا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ کوئی یہ کہدے کہ سر سکندر کی یہ باتیں تم لوگوں کو لیگ کے خلاف دکھائی دیتی ہیں لیگ ان میں کسی قسم کا تضاد و تباین نہیں پاتی۔ اس لئے سر سکندر کے خلاف کسی اقدام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن خود لیگ کا سر سکندر کی اس روش کے متعلق کیا خیال ہے۔ یہ ہم سے نہیں۔ خود لیگ کی زبان سے سُنئے۔ منشور آل انڈیا مسلم لیگ کا سرکاری ترجمان ہے۔ اس کی ۱۹ر اکتوبر کی اشاعت میں اس موضوع پر مقالۂ افتتاحیہ شائع ہوا ہے۔ جس کے دوران میں تحریر ہے:۔

"لوگوں کو حیرت ہے کہ پنجاب کے وزیر اعظم کو خواہ مخواہ مسٹر چرچل کی اس تقریر پر جس میں انھوں نے اپنے نائب مسٹر اٹیلے کی تردید کی تھی اتنی پریشانی کیوں ہوئی۔ اور پھر اتنی دیر بعد۔ پیشۂ وزارت کا ہر جگہ ایک ہی چلن ہے۔ وہ انگلستان ہو یا ہندوستان۔ بس اتنا فرق ہے کہ آزاد ملک کا وزیر اپنی قوم کے مفاد میں دوسری اقوام کو بیچ دیتا ہے اور غلام ملک کا وزیر اپنے ذاتی مفاد میں اپنی ہی قوم کے مخلصین کو۔ سر سکندر غلام قوم کے نہایت ہی تجربہ کار وزیر اعظم ہیں وزارت کی راہوں سے جیسی اچھی واقفیت انھیں ہے کسی کو کم ہوگی۔ لہٰذا انھیں مسٹر چرچل کی تقریر کے متعلق نہ کوئی غلط فہمی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ اس سے پہلے کہ مسٹر چرچل کی تقریر بھول میں پڑے اور اس کا اثر بالکل زائل ہو انھوں نے اس سے تھوڑا فائدہ اٹھالیا۔ ڈیفنس کونسل کی کرسیٔ نیز

اس کے مستعفی ہونے کے سلسلے میں لوگوں کو یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی کہ وزیر اعظم پنجاب اس قسم کے آدمی ہیں جسے ہندوؤں کی سیاسی اصطلاح میں فرقہ پرست کہتے ہیں۔ لوگوں کا ایسا گمان عہدۂ وزارتِ عظمیٰ کے لئے نہایت درجہ مضر ہے۔ لہٰذا وہ مسٹر چرچل پر پھر بڑے کہ انھوں نے ایسی تقریر کر کے ہندوستانیوں کو کیسے مایوس کیا اور انھیں چاہئے کہ فوراً ایک اعلان کریں کہ جنگ کے بعد دو یا تین برس کے اندر اندر ہندوستان کو مرتبہ نو آبادی مل جائے گا۔ اب وہ ہندوؤں کی ہر پارٹی کی نظر میں اس وقت تک کے لئے قوم پرور ہیں جب تک کہ بحیثیت وزیر اعظم نہیں بلکہ بحیثیت سر سکندر حیات وہ مسلم لیگ کی کھلی ہوئی تائید اور حمایت کو ضروری نہ سمجھیں۔ ہر وزیر خواہ وہ چرچل ہو یا سکندر اس سے خوب واقف ہے کہ عوام کا حافظہ بہت کمزور ہے۔ اُن کے جذبات میں آسانی سے اشتعال پیدا کیا جا سکتا ہے اور اپنے اس علم سے پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ وزیر اعظم پنجاب نے مسٹر چرچل پر جس انداز سے نکتہ چینی کی ہے اس پر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ ٹھیک وہی ہے جو پرانی ماما کبھی بیگم کو ڈانٹنے کے لئے اختیار کرتی ہے۔ یعنی بچے کی حمایت کا بہانہ رکھ کر۔ اہتمام وسعیِ جنگ کے مفاد کے بہانہ سے وائسرائے کو، حکومتِ ہند کو، حکومتِ برطانیہ کو، اس کے کسی وزیر کو جتنا جی چاہے ملامت کیجئے بہت پسندیدہ ہے۔ پھر ایسے موقع پر قوم پرستی کا بھی امتیاز کیوں نہ حاصل کر لیا جائے۔

اس بیان میں وزیر اعظم پنجاب نے بہت سی ایسی باتیں کہی ہیں جو مسلم لیگ کے نقطۂ نظر سے نہایت ہی درجہ قابلِ اعتراض ہیں۔ مگر وہ یقیناً انھوں نے مسلم لیگ کے ممبر کی حیثیت سے نہیں بلکہ وزیر اعظم پنجاب کی حیثیت سے کہی ہونگی۔ لہٰذا ان باتوں پر اگر کوئی سزاوار ملامت ہے تو وہ وزیر اعظم پنجاب یقیناً ہے۔ سر سکندر ہرگز نہیں۔ پھر یہ بھی سر سکندر ہی کے خیال کے مطابق۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ وزیر اعظم کی حیثیت سے ایک بات کر سکتے ہیں اور مسلم لیگ کے ممبر کی حیثیت سے دوسری بات۔ کچھ مضائقہ نہیں کہ دونوں باتیں اور دونوں عمل ایک دوسرے کی ضد ہوں۔

کون لیڈر ہے جو یہ کہہ سکتا ہے کہ ہندو مسلم مسئلہ کا تصفیہ اور ہندوستان کے آئندہ دستور پر ان دونوں کے اتفاقِ رائے سے قبل یہ تعین کر دیا جائے کہ ہندوستان کو درجۂ نوآبادیات فلاں وقت دے دیا جائے! اور اس پر کہ مسلم لیگ تو مرتبۂ نوآبادی کی قائل بھی نہیں۔ وہ مکمل آزادی چاہتی ہے۔ کون لیڈر ہے جو اپنی طرف سے یہ خواہش کر سکتا ہے کہ اگر حکومتِ برطانیہ کی مقرر کی ہوئی ہندوستان کے مختلف مفادوں کی نمائندہ مجلس جس میں حکومتِ برطانیہ کے نمائندے بھی ہوں ایک معینہ مدت کے اندر کسی دستور پر متفق نہ ہو جائیں تو حکومتِ برطانیہ ان عناصر کے مشورے سے جو ہندوستان کے تحفظ میں شریک ہوں (اس کے باوجود کہ حکومت برطانیہ انھیں اعتماد کے ساتھ ذمہ داری اور اختیار کے ساتھ شریک کرنے سے انکار کر دے) جو دستور مناسب سمجھے بنا دے! کون لیڈر ہے جو اپنی پوری قوم اس کی نمائندہ انجمن مسلم لیگ اور اس کے لیڈر کو نظر انداز کر کے یہ کہیگا کہ ہندوستان کو آزادی تنہا ان لوگوں کی وجہ سے ملیگی جو مختلف محاذہائے جنگ میں (بلا اپنی قومی مرضی کے دخل کے) قربانیاں کر رہے ہیں اور شجاعتیں دکھا رہے ہیں! کون لیڈر ہے جو یہ جاننے اور دیکھنے کے باوجود کہ مسلمانوں نے مسلم لیگ کی وساطت سے ہندوستان کے لیے ذمہ داری اور اختیار کی شرط کے ساتھ اپنی خدمات پیش کیں اور حکومتِ برطانیہ نے انھیں مسترد کر دیا یہ کہے کہ "برطانیۂ عظمیٰ اور ہندوستان کے ساتھ انصاف یہ ہے کہ یہ بات بلور کی طرح صاف کر دی جائے کہ اس جنگ میں جو ہمارے ساتھ نہیں ہے وہ ہمارا مخالف ہے"! ہمارے ساتھ سے مراد کون؟ سوائے حکومتِ برطانیہ کے اور صوبۂ پنجاب کے اس وزیرِ اعظم کے جو بلا کسی قومی پابندی کے حکومتِ برطانیہ کا جزو ہونے پر نازاں ہے۔

یہی نہیں۔ مسلم لیگ کے نو وارد۔ انگریزی ہفت وار اخبار "ڈان"[1] (طلوعِ سحر) نے اپنی پہلی اشاعت میں لکھا ہے "سر سکندر حیات خاں صاحب عوام میں کچھ کہتے وقت اس بات کو قطعاً بھول جاتے ہیں کہ مسلم لیگ کی اطاعت شعاری بھی ان پر لازمی ہے۔ پنجاب کے وزیرِ اعظم کی یہ روش سب کے لئے پریشان کن بن جاتی ہے اور اس میں کوئی وقار نہیں رہتا۔ انھوں نے گذشتہ اکتوبر کے

---

[1] طلوعِ اسلام اس طلوعِ سحر کا دلی استقبال کرتا ہے اور اسے آفتابِ نصف النہار ہونے کی دعا دیتا ہے۔

اپنے بیان میں اس امر کا مطالبہ کیا ہے کہ حکومت اس بات کا فوری اعلان کر دے کہ جنگ کے بعد ایک مدتِ معینہ کے اندر ہندوستان کو درجۂ نوآبادیات دے دیا جائے گا۔ یہ بیان مسلم لیگ کی قرارداد لاہور اور مدراس کی روح کے منافی ہے۔ اور یہی قراردادیں دراصل مسلم لیگ کا نصب العین ہیں۔ درجۂ نوآبادیات یا کوئی اور درجہ۔ پاکستان کے بغیر۔ ہندوستان میں ہندو راج کے مرادف ہے۔"

ہم اس باب میں پہلے دن سے کہتے چلے آئے ہیں کہ لیگ کی موجودہ روش خود لیگ کے مقاصد کیلئے بے حد نقصان دہ ثابت ہو رہی ہیں۔ ہمیں کسی کی ذلت سے کوئی تعرض نہیں۔ ہمارے نزدیک ہر وہ شخص جو ملّتِ اسلامیہ کی حیاتِ اجتماعیہ کو تقویت پہنچانے کے لئے ایک قدم بھی آگے بڑھائے واجب الاحترام ہے خواہ اس کی دنیاوی حیثیت کچھ بھی نہ ہو اور اس کے برعکس تمام وہ لوگ جو مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کو کسی قسم کا نقصان پہنچائیں کسی رعایت کے مستحق نہیں ہیں۔ خواہ ثروت اور وجاہت کے موجودہ پیمانوں کی رو سے ان کی قدر و قیمت کتنی ہی کیوں نہ ہو ہم ایک مرتبہ پھر لیگ کے اربابِ بست و کشاد کے گوش گذار کرنا چاہتے ہیں کہ دو کشتیوں میں پاؤں رکھنے والے لوگوں کو مسامحت اور چشم پوشی سے ساتھ رکھے جانا مقاصدِ ملّت کو بے حد نقصان پہنچا رہا ہے۔ غیروں کی مخالفت کے اثرات اس درجہ ضرر رساں اور دور رس نہیں جتنے اس قسم کے "اپنوں" کی بظاہر حمایت کے اثرات۔ اس سے قوم کی حالت مضحکہ خیز بن رہی ہے۔ جماعت میں ایسے عناصر کی موجودگی نہ صرف دوسروں کی نگاہوں میں ہی ذلت کا موجب ہوتی ہے بلکہ خود ان لوگوں کے دلوں میں جو خلوص و صدق دلی سے جماعت کے ساتھ ہوں بسا اوقات تذبذب و تنزل کا باعث بن جاتی ہے۔ اور جب ایک مرتبہ یقین میں ارتیابی کیفیت پیدا ہو جائے تو پھر کسی مرحلہ میں بھی کامیابی نہیں ہو سکتی۔

بڑے بھائی

یہ تو جناب سر سکندر حیات خاں صاحب کی اندوہناک روش کی حدیث الم تھی۔ ان کے بعد جناب فضل الحق صاحب کی یاد بھی کچھ کم جگر خراش نہیں۔ ان کے متعلق ہم نے اکتوبر کی اشاعت میں جو کچھ عرض کیا تھا اس پر ایک نگہ بازگشت ڈال لیجئے۔ تاکہ حوادث و کوائف کی یاد

تماشا ہوجائے۔ ہم نے گذارش کیا تھا کہ اس قسم کے لوگوں کو۔ جو جوشِ غضب میں اپنا اعصابی توازن کھو بیٹھیں زیادہ غصہ نہیں دلانا چاہیئے۔ انھیں جب نرمی سے سمجھایا جائے (یعنی ٹھنڈا پانی پلایا جائے) تو ان کا غصہ فرو ہوجاتا ہے۔ چنانچہ اس کی دونوں مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ کلکتہ سے شملہ کے سفر میں جناب فضل الحق صاحب کے خلاف مظاہرے ہوئے اور (بقول ان کے) انھوں نے شملہ میں چھپ چھپ کر دن کاٹے۔ نتیجہ یہ کہ انھوں نے کلکتہ پہنچکر فیصلہ کر لیا کہ ایک روزانہ اخبار نکالنا چاہیئے جو ان کی حمایت میں پروپیگنڈہ کرے۔ چنانچہ اس اخبار کے دفتر کی رسمِ افتتاح پر انھوں نے اپنی تقریر میں صاف صاف کہدیا کہ پچھلے دنوں جو واقعات رونما ہوئے ہیں ان میں بنگال کے مسلم پریس نے خلافِ توقع ان کی مخالفت کی ہے اس لئے اس نئے اخبار کی ضرورت ہے؛

(ہندوستان ٹائمز ۱۵-۷-۴۴)

مسلمانوں میں تشتت و انتشار کے لئے یہی چیز کچھ کم نہ تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ اخبار کے ایڈیٹر قاضی ندرالاسلام تجویز کئے گئے ہیں۔ جو اپنے "برہمو سماجی اسلام" (یعنی انقلاب کی آڑ میں الحاد) کے لئے مشہور ہیں انھوں نے اپنی تقریر میں پہلے ہی کہدیا کہ اخبار "فرقہ وارانہ" مسلک سے مجتنب رہیگا (ایضاً) مولوی فضل الحق صاحب کا اخبار۔ اور مسلکِ اسلامیت (اسی کو قومیت پرستوں کی اصطلاح میں فرقہ پرستی کہا جاتا ہے) سے احتراز!

بک رہا ہوں جنوں میں۔ کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی (غالب)

یہ تو تھا شعلہ مزاجی کا مظاہرہ۔ اب زود پشیمانی ملاحظہ ہو۔ کابینۂ بنگال کے مسلمان وزراء نے (جن کے خلاف جناب فضل الحق صاحب کو شکایت تھی کہ انھوں نے ان کے خلاف سرزنش کی قرارداد میں حصہ لیا تھا) اپنی پوزیشن کو واضح کرکے جناب وزیرِ اعظم کو ٹھنڈا پانی پلا دیا۔ جس سے ان کا تمام غصہ فرو ہوگیا۔ اور انھوں نے تحریر فرمایا

"جہاں تک اس چٹھی کا تعلق ہے جو میں نے مسلم لیگ کے سکریٹری۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب کو لکھی تھی۔ میں مناسب اقدام کر رہا ہوں۔ جس سے میرے ان مسلمان بھائیوں کے

شکوک رفع ہو جائینگے جنھیں میرے مفہوم کے متعلق غلط فہمی پیدا ہو گئی۔ میں نہیں سمجھتا کہ میری طرف سے کسی خاص وضاحت کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ یہ چیز تو میرے حیطۂ خیال میں بھی نہیں آسکتی کہ میں مسلمانانِ بنگال اور مسلمانانِ ہند کے درمیان کسی قسم کا انتشار پیدا کروں اور اس کی وجہ بالکل بین ہے یعنی مجھ سے زیادہ مسلمانان ہند میں اتحاد و یگانگت کا اور کون متمنی ہو سکتا ہے؟ میری تو انتہائی خواہش ہے کہ تمام مسلمان ایک ملّتِ واحد بن کر اپنی سیاسی۔ معاشرتی۔ ثقافتی اور معاشی ترقی کے لئے ایک مرکز کے ماتحت کام کریں۔ نہ ہی میں اس امر کی ضرورت سمجھتا ہوں کہ میں اس الزام کی بھی تردید کروں جو میرے خلاف عائد کیا جاتا ہے کہ میں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے کسی حکم سے سرتابی کی ہے۔ اس لئے کہ میں نے اپنی چٹھی میں کہیں یہ نہیں لکھا کہ مسلم لیگ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ مسلمانانِ ہند (جن میں مسلمانانِ بنگال بھی شامل ہیں) کے اہم معاملات میں حکم بنے (یعنی اسی کا فیصلہ ان معاملات میں قولِ فیصل ہے)۔"

(ہندوستان ٹائمز ۱۴ اپریل ۴۱ء)

دیکھ لیجئے ہم نے نہیں کہا تھا کہ

عادت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں

دراصل (جیسا کہ پہلے بھی ہم لکھ چکے ہیں) یہ لوگ اعصابی مریض ہوتے ہیں۔ ان کی تلوّن مزاجی اور طفلانہ حرکات پر غم و غصہ کی بجائے ہمدردی کا اظہار ہونا چاہئے۔ جیسے مریضوں سے ہمدردی کا اظہار ہوتا ہے۔ افسوس تو صرف اس قدر ہے کہ قوم کی قحط الرجال کی مجبوری ہے کہ ایسے معذور لوگوں کے ہاتھ میں قوم کی باگ ڈور دینی پڑتی ہے۔ ان لوگوں کا صحیح مقام "سپاہی" کا مقام ہے۔ جہاں فیصلے کسی اور دماغ کے ہوں اور ان کا کام ان فیصلوں کو بروئے کار لانا ہو۔ لیکن مجبوری کا کیا علاج۔

دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمان وفا ہے

لیکن اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ یہ مجبوریاں اس وقت تک گوارا کی جا سکتی ہیں جب تک کسی اصول کی متعرض نہ ہوتی ہوں۔ اگر ان سے کسی اصول پر زد پڑتی ہے تو پھر ایسے "سہاگ سے رنڈاپا اچھا"

نعرۂ حق

نعرۂ حق سے جہاں میں انقلاب آنیکو ہے
دل کے ظلمت خانہ میں اک آفتاب آنیکو ہے

پردۂ باطل کو الا اللہ سے کر دو چاک چاک
اب جنونِ عشق پر گویا شباب آنیکو ہے

داستانِ بزمِ ہستی کسقدر بے کیف تھی
لیکن اب اس داستاں میں انقلاب آنیکو ہے

مضطرب میری جبیں تھی آستاں کے واسطے
آستاں سے اس تڑپ کا اب جواب آنیکو ہے

ہر رگِ گل تھرتھراتی ہے وفورِ شوق سے
گلشنِ ہستی میں کوئی بے نقاب آنیکو ہے

تشنہ لب مشرق کے میخانوں میں تھے صدیوں سے ہم
اب شراب آنیکو ہے اور بے حساب آنیکو ہے

خونِ دہقاں سینچتا تھا خواجگی کا گلستاں
اب اسی کے خوں میں جوشِ التہاب آنیکو ہے

خون کے آنسو رُخِ مزدور پر بہتے رہے
اب انہیں اشکوں سے رُخ پر آب و تاب آنیکو ہے

کانپتا ہے آنے والے دَور سے سرمایہ دار
دستِ دہقاں میں مقدر کی کتاب آنیکو ہے

منتظر جس دَور کے صدیوں سے تھے اہلِ نظر
رحمتِ باری سے وہ دورِ شتاب آنیکو ہے

اک قلندر کہہ رہا تھا مرقدِ اقبالؒ پر
تو نے دیکھا خواب اب تعبیرِ خواب آنیکو ہے

(تاجؔ)

بیادگارِ حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیات اجتماعیہ کا

ماہوار مجلہ

طلوع اسلام

دہلی

دورِ جدید

مرتب
اخوندزادہ حسین امام

بدل اشتراک
سالانہ پانچ روپیہ 5/
ششماہی تین روپئے 3/
فی پرچہ آٹھ آنے ۸/

جلد (۴) شمارہ (۱۲)

۱۵ ذیقعدہ ۱۳۶۰ھ مطابق دسمبر ۱۹۴۱ء
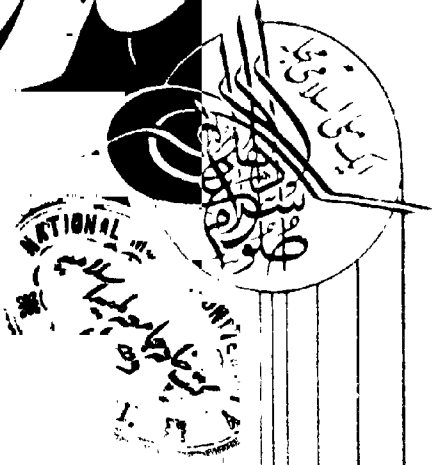
فہرست مضامین

(اس دفعہ کاپیوں کی ترتیب کی فنی دقت کے بناء پر لمعات شروع کے بجائے چند صفحات بعد میں درج ہیں) ۔

شاہ ولی اللہ اور قرآن و حدیث

جب کوئی قوم اپنے مرکز سے ہٹ جاتی ہے تو چونکہ اس کے سامنے زندگی کا کوئی بلند مقصد نہیں رہتا اس لئے رفتہ رفتہ اس کے فکر و عمل کی قوتیں مضمحل ہوتی چلی جاتی ہیں اور بالآخران پر جمود و تعطل اور سکنت کا عذاب اس طرح مسلط ہو جاتا ہے کہ زندگی کے کسی شعبہ میں حرکت باقی نہیں رہتی سہل انگاری کی زندگی ان کی فطرت ہو جاتی ہے نہ ذہن میں سوچنے کی صلاحیت باقی رہتی ہے نہ دل میں کوئی ولولہ - نہ بازؤں میں قوتِ عمل ہوتی ہے نہ پاؤں میں چلنے کی ہمت - اس سہل انگاری اور آرام پسندی کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس ڈگر پر چلتے آرہے تھے اسی پر چلے جا رہے ہیں - قرآن کریم نے امم سابقہ کے احوال و کوائف سے بار بار اس طرف توجہ منعطف کرائی ہے کہ حق کی دعوت کو سب سے پہلے ہمیشہ ان لوگوں نے ٹھکرایا جن میں آرام طلبی اور سہل انگاری پیدا ہو چکی تھی - انھوں نے یہ کہکر اپنے آپ کو فریب دے لیا کہ ہمیں سوچنے سمجھنے کی کچھ ضرورت نہیں ہمارے آباء و اجداد جس روش پر چلے آرہے تھے وہی روش ہم نے اختیار کر رکھی ہے - اب اس میں تبدیلی پیدا کرنا گویا راہ راست سے ہٹکر گمرہی اختیار کرنا ہے، حالانکہ ان کا تجزیہ نفس کیا جائے تو یہ حقیقت فوراً سامنے آجائے کہ وہ آباء و اجداد کی روش سے اسلئے نہیں ہٹنا چاہتے تھے کہ ان میں جمود و تعطل آچکا تھا - وہ اس قدر آرام طلب ہو چکے تھے کہ جہاں بیٹھ گئے تھے وہاں سے اٹھنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا. اسی سہل انگاری کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے "حصول نجات" کے لئے بھی بڑی بڑی آسان راہیں وضع کر رکھی تھیں - ذرا غور فرمائیے - اگر ایک شخص یہ سمجھے بیٹھا ہو کہ اپنے مکان کے ایک گوشے میں نرم و نازک قالین کے مصلے پر بیٹھ کر - (سردیوں کے موسم میں) نہایت نفیس و لطیف شال اوڑھے ادھر ادھر تکئے لگائے آتشدان میں آگ سلگائے اور آگ میں لوبان چھڑکائے تسبیح کے دانوں پر چند الفاظ دہرا لینے سے سیدھا جنت میں پہنچ سکتا ہے - تو وہ بھلا ایسے شخص کی آواز پر کیسے کان دھر سکتا ہے جو یہ کہے کہ جنت کا راستہ یہ نہیں جنت کی راہ اللہ کا نام بلند کرنے کے لئے بیوی بچے - گھر بار یہ تمام عیش و عشرت کے سامان چھوڑ کر - کوہ و دشت و بیاباں میں سر بکف پھرنا - بھوک اور پیاس کی مشقتیں برداشت کرنا اور پھر عند الضرورت جان جیسی متاعِ عزیز قربان کر دینا ہے - یہ مثال جسمانی سہل انگاری کی ہے - اسی طرح ذہنی سہل انگاری کی

کیفیت ہے۔ جو یہ سمجھے بیٹھا ہو کہ علم کی تکمیل ان چند کتابوں کے ازبر کر لینے میں ہے جو آج سے کچھ عرصہ پہلے اسلاف نے لکھدی ہوں اور ان پر کسی قسم کا اضافہ یا تنقید گناہِ عظیم ہے وہ اس شخص کی کیوں سنے جس کی پکار یہ ہو کہ صحیح علم اپنی ذہنی قوتوں کو بروئے کار لانے سے حاصل ہوتا ہے اور اس کے لئے عمر بھر کی دیدہ ریزی اور جگر کاوی ضروری ہے اس کی ذہنی سہل انگاری اسے اس طرف آنے کی اجازت ہی نہ دے گی۔ لیکن وہ اس کا اعتراف نہیں کریگا کہ وہ سہل انگاری اور آرام طلبی کی وجہ سے اس طرف نہیں آتا۔ نفسِ انسانی بڑا حیلہ تراش واقع ہوا ہے۔ وہ یہ کہکر فریب دے گا کہ نہیں! حق کی راہ وہی ہے جس پر میں چل رہا ہوں اور اس کی سند یہ ہے کہ میں نے اپنے آبا و اجداد کو اسی راہ پر چلتے دیکھا ہے۔ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ (خواہ ان کے آبا و اجداد کچھ بھی نہ جانتے ہوں اور وہ راہ راست پر بھی نہ ہوں)

مسلمانوں پر ایک عرصہ سے یہی جمود و تعطل مسلط ہے جس نے ان کے افکار و اعمال کی قوتوں کو یکسر بیکار کر رکھا ہے۔ اب ان کی حالت یہ ہے کہ اگر کوئی اللہ کا بندہ انھیں ان کے مرکز کی طرف دعوت دیتا ہے تو ان کے اربابِ سیادت اس سے گھبرا اٹھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اس آواز کا گلا گھونٹ دیا جائے تاکہ ان کی نیند میں فرق نہ آنے پائے۔ پھر یہ لوگ اپنی ذہنی سہل انگاری کی وجہ سے دعوت دینے والے کے دعوے کا جواب بھی دلیل و حجت سے نہیں دیتے بلکہ اتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں کہ اس پر ایک ایسا لیبل چسپاں کر دیا جائے جس سے عوام مشتعل ہو جائیں، اور یوں اسے نکو بنا دیا جائے۔ اگلے دنوں ہمارے ایک دوست نے اسی قسم کے "لیبل" کی ایک بڑی دلچسپ بات سنائی آج سے کچھ عرصہ پہلے جب جماعتِ اہلِ حدیث نے جہالت و توہم پرستی کی رسوماتِ قبیحہ کے خلاف آواز بلند کی تھی تو ان کے لئے "وہابی" کا لیبل وضع کیا گیا تھا اور عوام میں یہ مشہور کر دیا گیا تھا کہ دنیا میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت "وہابی" ہوتا ہے۔ سرحد کے ایک گاؤں میں ایک ہندو دکاندار تھا۔ ایک دفعہ مولوی صاحب اس سے کسی بات پر بگڑ بیٹھے اور اسے چیلنج دیدیا کہ دیکھ! میں تجھے کس طرح سیدھا کرتا ہوں جمعہ کی نماز میں مولوی صاحب نے اعلان کر دیا کہ یہ دوکاندار وہابی ہو گیا ہے اس لئے اس سے کوئی مسلمان خرید و فروخت نہ کرے۔ بس پھر کیا تھا۔ چار ہی روز میں لالہ جی کے ہوش ٹھکانے لگ گئے اور اس نے مولوی صاحب کو راضی کر لیا۔ دوسرے جمعہ میں مولوی صاحب نے اعلان کر دیا کہ اب خیر فضل ہے لالہ پھر دیوان (ہندو) ہو گیا ہے "وہابی" نہیں رہا۔ اب اس کا بائیکاٹ ختم ہو گیا۔ یہ ہے لیبل کا اثر۔ آپ دیکھیں گے کہ ہر دور میں اس قسم کے لیبل وضع ہوتے چلے آئے ہیں آج اسی قسم کا ایک لیبل "منکرِ حدیث" کا ہے۔ اور

ہمارا خیال ہے کہ علم النفس کی رُو سے اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو اس لیبل کے وضع کرنے میں اس جذبۂ انتقام کا بھی بڑا ہاتھ دکھائی دے گا جو "وہابی" کے لیبل سے اس سے پیشتر پیدا ہو چکا تھا) اگر کسی شخص نے یہ کہا کہ میں قرآن کریم کو دین کی مکمل کتاب مانتا ہوں یعنی میرا ایمان ہے کہ یہ صحیفۂ مقدس تکمیل شرفِ انسانیت کے لئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے نجات و سعادت کا یہی ایک ذریعہ ہے۔ اسی کتابِ عظیم پر حضور سرورِ کائنات صلعم نے عمل کیا اور اسی کے مطابق اس حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہوا جس میں اللہ کے یہ قوانین، انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے عملاً نافذ ہوئے۔ تو چونکہ یہ آواز قرآن و عمل کی طرف دعوت دینے والی آواز ہے۔ اس لئے سہل انگاری اور آرام طلبی نے فطرتی طور پر اس کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور اپنی عادتِ مستمرہ کے مطابق دلائل و براہین کے بجائے لیبل تراشی سے کام لیا۔ چنانچہ اس کے لئے "منکرِ حدیث" کا لیبل وضع کر کے عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے کا فلیتہ چھوڑ دیا گیا اور اس کے بعد خود پھر اسی میٹھی نیند میں سو گئے جس میں مدتوں سے سوتے چلے آ رہے تھے۔ اس قسم کی "لیبل تراشی" جہاں ایک طرف ان لوگوں کے آرام و سکون (یعنی جمود و تعطل) میں خلل اندازی کے فتنے سے انہیں کچھ وقت کے لئے محفوظ کر دیتی ہے۔ دوسری طرف بہت سے بے علم مدعیانِ علم و دین کی جہالت کے لئے عارضی نقاب پوشی کا بھی کام دیتی ہے۔ کس قدر آسان ہے یہ کہہ دینا کہ یہ آواز اس لئے حق کی آواز نہیں کہ جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے اس کے خلاف ہے!

طلوعِ اسلام، مسلمانوں کو انسانوں کے بنائے ہوئے دین سے ہٹا کر اس دین کی طرف دعوت دینے کا مدعی ہے جو اللہ نے انسانوں کے لئے بنایا اور نبی اکرمؐ کی وساطت سے انسانوں تک پہنچا۔ چونکہ یہ آواز مدتوں کے آرام طلب اور سہل انگار مسلمان کی نیند میں خلل اندازی کا موجب تھی۔ اسلئے اس پر بھی ایک لیبل لگ جانا ضروری تھا۔ وہی لیبل جو آج کل "منکرِ حدیث" کے نام سے معروف ہے۔ اربابِ سیادت نے یہ لیبل لگایا اور پھر اپنی گہری نیند میں سو گئے اور عوام سے کہہ گئے کہ ہاں! ذرا ہوشیار رہنا۔ اس لیبل والا مسلمان بڑا خطرناک قسم کا ڈاکو ہوتا ہے۔ وہ تمہارے متاعِ ایمان و عقیدت کو جھپٹ کر لے جائے گا۔ اس کے قریب نہ پھٹکنا۔ ان اشتعال دلانے والوں میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو دل میں اپنے مسلک کی کمزوری کو جانتے ہیں لیکن بعض وجوہ کی بناء پر اس کا علانیہ اعتراف نہیں کر سکتے۔ کچھ حسد و عداوت کی بناء پر۔ کچھ عوام کی طرف سے جھوٹی عزت کی خاطر بعض اپنی سیادت کی مسند کو قائم رکھنے کے لئے۔ اور بعض معاش کی مجبوریوں کی وجہ سے۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ان لوگوں کی سب سے بڑی دلیل یہ ہوتی ہے کہ یہ بالکل نئی نئی باتیں ہیں۔ ہم نے اپنے اسلاف میں تو کسی سے اِس قسم کی باتیں دیکھی نہیں! حالانکہ اگر یہ لوگ کبھی غور و فکر کی ہمت کرتے تو ہو سکتا تھا کہ خود اسلاف میں بھی اس قسم کی باتیں مل جاتیں۔ اس لئے کہ انہی میں سے جنھوں نے غور و فکر اور تحقیق و تدقیق سے کام لیا۔ انھیں ایسی باتیں مل ہی گئیں۔ اسی قسم کی ایک مثال ہم آج پیش کر رہے ہیں دنیائے مذہب میں شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کا اسم گرامی کسی تعارف کا محتاج نہیں نہ ہی جناب عبید اللہ صاحب سندھی کا نام نامی۔ اوّل الذکر متقدمین میں ا۔ ثانی الذکر متاخرین میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں جناب سندھی حکمتِ ولی اللہی کے بہت بڑے مفکر اور مبلغ سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے شاہ ولی اللہؒ کے متعلق ایک بسیط مقالہ سپردِ قلم فرمایا تھا جو رسالہ الفرقان کے "ولی اللہ نمبر" میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ مقالہ قرآن۔ حدیث فقہ وغیرہ کے متعلق شاہ صاحبؒ کے اہم خیالات پر مشتمل ہے۔ ہم اس مقالہ سے جستہ جستہ مقامات نقل کرتے ہیں جن سے واضح ہو جائے گا کہ ان اصولی مباحث میں حضرت شاہ صاحبؒ اور جناب سندھی کا مسلک کیا ہے۔ یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ ہم ان حضرات کے خیالات کو بطور سند پیش نہیں کر رہے۔ اسلاف اور اپنے ہم عصر حضرات کی پوری تعظیم و تکریم کے جذبات کے ساتھ ساتھ ہم اس حقیقت کا بھی اعلان کر دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک دین کے معاملہ میں کسی انسان کی رائے یا عقیدہ حجت نہیں قرار دیا جا سکتا۔ جو رائے یا عقیدہ قرآن کریم کے مطابق ہوگا وہ قابل قبول ہوگا۔ ورنہ ہم کہدیں گے کہ ان حضرات نے غلط سمجھا۔ اسی اصول کا ہم اپنے اوپر بھی اطلاق کرتے ہیں۔ ہماری جو بات کتاب اللہ کے خلاف ہو اسے آپ ایک ثانیہ کے لئے بھی درخور اعتناء تصور نہ فرمائیے۔

جناب سندھی نے مولہ صدر مقالہ مختلف صحبتوں میں املا فرمایا اور ایک دوسرے صاحب نے اسے قلمبند کیا تھا۔ بنا بریں مقالہ میں خاص طور پر ربط قائم نہیں رہ سکا۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ اقتباسات میں ربط ملحوظ رکھا جائے۔ نیز بعض مقامات پر تھوڑی بہت تشریح کی بھی ضرورت محسوس کی گئی ہے جناب سندھی کے مقالہ کے اقتباسات واوین ("......") میں درج کئے گئے ہیں۔ واوین سے باہر کی عبارت ہماری اپنی ہے۔ آپ ان اقتباسات کو غور و تعمق سے مطالعہ فرمائیے اور استیعاب کے لئے اصل مقالہ کی طرف رجوع کیجئے۔ وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ۔

۱۔ فقہ اور قرآن | جناب سندھی فرماتے ہیں :۔

"فقہائے عظام نے قرآن عظیم کو اپنی اصولِ فقہ میں پہلے درجہ پر رکھا ہے مگر اس سے مراد ان کے یہاں چند آیات احکام ہیں جو اوامر و نواہی کی شکل میں قرآن حکیم میں مدون ہیں۔ اس تخصیص کا یہ اثر پیدا ہوا کہ ایک عالم سارا قرآن سمجھنا ضروری نہیں جانتا۔ پھر اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کی تفسیر واعظوں اور قصہ گو، افسانہ طراز لوگوں کے ہاتھ آگئی اور فقہا کا اس میں دخل نہ رہا۔ . . . . . . جن لوگوں نے یہ خیال بنایا تھا کہ فقیہ بننے کے لئے قرآن کریم کے فقط اوامر و نواہی کافی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ قرآن کو مس تک نہیں کرسکتے۔ جب مسلمانوں کی مرکزی جماعت کا قرآن عظیم کے متعلق یہ خیال ہو تو عوام بیچارے اس بارے میں کہاں تک قابل ملامت قرار دئے جاسکتے ہیں" (ص۲۴۳ و ص۲۴۶)

یہ ان فقہا کی کیفیت تھی جنھوں نے فقہ کی تدوین کی۔ بعد میں آنے والے حضرات نے قرآن کریم کی طرف اتنا سا رجوع بھی ضروری نہ سمجھا۔ کیونکہ ان کے نزدیک دین۔ تمام و کمال۔ فقہ کے اندر آچکا تھا جس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل جائز نہ تھا۔ چنانچہ آج حالت یہ ہے کہ ہمارے دینی مدارس میں اور سب کچھ پڑھایا جاتا ہے لیکن قرآن پڑھانے کی ضرورت بالکل نہیں سمجھی جاتی۔ قرآن کی تلاوت محض ثواب کی خاطر رہ گئی ہے۔

۲۔ شانِ نزول | جناب سندھی فرماتے ہیں :۔

"ائمہ فقہا نے اپنے اصول میں بالاتفاق یہ مسئلہ درج کیا ہے کہ اگر قرآن شریف میں ایک آیت بلفظ عموم نازل ہوئی ہو اور مفسرین اس کا کوئی خاص واقعہ سبب بتاتے ہوں تو قرآن فہمی میں عموم الفاظ ہی مدنظر رہے گا۔ خصوصیتِ محل کو اس میں دخل نہیں ہوگا۔ اس قاعدے پر اتفاق کرتے ہوئے آپ جس تفسیر کو اٹھا کر دیکھیں گے ہر آیت کے ماتحت ایک جزئی واقعہ پائیں گے۔ مثلاً یہ آیت ابوجہل کے حق میں ہے۔ یہ عبداللہ بن ابی منافق کے بارہ میں نازل ہوئی۔ یہ حضرت ابوبکر صدیق کی فضیلت میں اتری۔ اس میں اہلِ بیت کے فضائل کا بیان ہے؟ عام اساتذہ اور طلبہ کو آپ انہیں جزئی چیزوں میں غور کرتا ہوا پائیں گے۔ شاہ صاحبؒ نے "الفوز الکبیر" کی ابتداء میں اس غلطی کو نہایت وضاحت سے بیان کردیا ہے اور آیات احکام کا مطلب یہ بتلایا کہ اجتماعی طور پر انسانوں میں جو بد اخلاقیاں اور بداعمالیاں موجود ہیں ان کو ان آیات کا سبب نزول سمجھنا چاہئے۔ عرب۔ یا عجم زمانے کے تقدم یا تاخر سے ان کا کوئی تعلق نہیں"۔ (ص۲۴۳)

یہ اس لئے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ وہ کسی ایک ماحول۔ ایک زمان یا ایک مکان کے لئے نہیں بلکہ ہر

احول، ہر زمان ۔ اور ہر مکان کے لئے ہے ۔ اور کسی شانِ نزول ۔ موقع نزول یا واقعہ نزول کا پابند نہیں ۔ وہ قیامت تک کے لئے دینی نصاب ہے اور ہر زمانہ میں اس سے نئی روشنی نکالی جا سکتی ہے ۔ اس لئے فہم قرآن کو کسی ایک زمانہ سے وابستہ کر دینا بھی درست نہیں (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو جناب پرویز کی معرکتہ الآرا کتاب "معارف القرآن" کا بصیرت افروز مقدمہ ۔ از علامہ اسلم جیراجپوری)

۳۔ عقل اور قرآن | جناب سندھی فرماتے ہیں :۔

" عام مفسرین نے روح کے علم کو متشابہات میں داخل کر رکھا ہے ۔ کوئی مفکر اس کے قریب نہیں جا سکتا اس لئے تمام مسائل بعد الموت ۔ تحت اللفظ ترجمہ پڑھنے سے زیادہ قابلِ غور نہیں سمجھے جاتے ۔ یہاں تک کہ عقائد کی کتابوں میں توحید اور نبوّت کا مسئلہ تو عقلی مانا جاتا ہے اور عذاب القبر سے لیکر آگے کی تمام بحثیں نقلی سمجھی جاتی ہیں ۔ عذاب القبر کو صرف اس لئے مانا جاتا ہے کہ حدیث شریف میں اس کا ذکر موجود ہے ۔ شاہ صاحبؒ نے اپنی تالیفات میں مسلمانوں کو اس غلطی سے بچایا ہے ۔ ما بعد الموت جو زندگی قرآن ثابت کرتا ہے ان کے یہاں مسلسل عقلی نتائج کا مجمل بیان ہے ۔ عقل صریح کی پوری تائید کے بغیر کوئی چیز قرآن منوانے کی خواہش نہیں رکھتا " (۳۵-۱۳۴)

ہم اس مقام پر روح کے مسئلہ میں الجھے بغیر اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم اپنے آپ کو نور کہتا ہے جو خود بھی روشن ہوتا ہے اور اپنے اردگرد کی چیزوں کو بھی روشن کر دیتا ہے ۔ وہ عقل کو مخاطب کرتا ہے اور اس کے دعاوی بصیرت پر مبنی ہیں اس لئے جہالت اور توہم پرستی کو اس میں کوئی دخل نہیں ۔ وہ سراپا حکمت ہے اور ہر صاحبِ بصیرت کو تفکر و تدبر کی بار بار دعوت دیتا ہے اس لئے جوں جوں انسانی علم و عقل ترقی کرتے جائیں گے ۔ قرآنی غوامض بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے (مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "مقدمہ" جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے)

جناب سندھی نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "عذاب القبر کو صرف اس لئے مانا جاتا ہے کہ حدیث شریف میں اس کا ذکر موجود ہے" ۔ یہ بالکل درست ہے ۔ قرآن کریم میں عذاب قبر کا کہیں ذکر نہیں ۔ (اس کی تفصیل کے لئے علامہ اسلم جیراجپوری کی بصیرت افروز کتاب "تعلیمات قرآن" ملاحظہ فرمائیے ۔)

۴۔ متشابہات | جناب سندھی ارشاد فرماتے ہیں :۔

"قرآن حکیم نے آیات قرآنی کی تقسیم محکمات اور متشابہات میں کر دی ہے۔ عموماً اہل علم تشابہات میں بحث کرنا ناممکن سمجھتے ہیں۔ پھر متشابہات کی ایسی واضح تعریف و تفسیر جس سے تمام ایسی آیتیں تحقیقی اور تحدیدی طور سے جدا کر لی جا سکیں۔ کوئی متفقہ علیہ موجود نہیں ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک تو قرآن تمام ناقابل فہم ہو گیا اور متشابہات میں غور نہ کرنا ایک اصول اور عقیدہ مقرر ہو گیا۔ ایک کتاب کی نسبت جب یہ عقیدہ بن جائے کہ اس کے بعض حصے (جس کا پورا تعین بھی نہیں) فہم سے بالاتر ہیں تو انسانی متوسط عقول کے لئے ساری کتاب مشتبہ بن جاتی ہے طبیعت میں خدشات اور اوہام اٹھتے ہیں کہ فلاں فلاں آیت کا جو مفہوم ہم نے معین کیا ممکن ہے کہ اس کی نقیض ان آیات میں موجود ہو جن کو ہم نہیں سمجھ سکتے۔ اس غلط فکر نے عمل کے لئے قرآن کی طرف سے مسلمانوں کے التفات کو یکسر ہٹا دیا۔ . . . . جو لوگ ان اصطلاحات کے پابند ہیں جن سے ان مسائل (تقدیر وغیرہ) پر غور کرنا کسی راسخ فی العلم کے لئے بھی جائز نہیں ہو سکتا (اور ان ہی سے مدارس و مکاتب بھرے پڑے ہیں) میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ اس زمانہ میں اسلام کے لئے کس قدر مفید ہو سکتے ہیں" (صفحہ ۲۵ و صفحہ ۲۵۵)

صرف متشابہات ہی نہیں۔ بلکہ یہاں تو یہ حالت ہے کہ سارے قرآن کریم کے متعلق جو کچھ پچھلی تفاسیر میں آ چکا ہے۔ اس میں مزید تدبر و تفکر گناہِ عظیم سمجھا جاتا ہے۔

۵۔ ناسخ و منسوخ | جناب سندھی کا ارشاد ہے۔

"قرآن عظیم میں فکری انتشار کا ایک اور باعث مسئلہ ناسخ و منسوخ کی بحث بھی ہے۔ اہل علم منسوخ آیات کو متفقہ طور پر محدود و محصور نہیں کرتے۔ یعنی ایسی آیات کی تحدید میں وہ خود باہمی مختلف ہیں۔ اس کا اثر قرآن کریم پڑھنے والے پر یہ پڑتا ہے کہ وہ ہر عملی معاملہ (حکم) میں اس کے منسوخ ہونے کا شبہ پیدا کر کے اپنے آپ کو فارغ الذمہ بنا لیتا ہے۔ . . . . شاہ صاحبؒ اس اصطلاح پر قرآن میں منسوخ نہیں مانتے۔ لیکن واضح رہے کہ شاہ صاحبؒ کا بیان اس فصل میں حکیمانہ ہے قوم کی عام حالت کو مدنظر رکھ کر انھوں نے اس مسئلہ کو تدریجاً سمجھانے کی سعی کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ پہلے اہل علم پانچسو آیتیں منسوخ مانتے رہے لیکن شیخ جلال الدین سیوطی اتقان میں بیس سے زیادہ آیتیں منسوخ تسلیم نہیں کرتے۔ . . . . شاہ صاحبؒ مذکورہ بالا بیس آیتوں میں بھی تطبیق دیکر نسخ کو پانچ آیتوں میں منحصر کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد ہماری رائے یہ ہے کہ جس شخص نے ان پندرہ آیتوں کی تطبیق غور سے پڑھی وہ باقی ماندہ پانچ آیتوں میں بھی بآسانی تطبیق

دے سکتا ہے۔ شاہ صاحبؒ صراحتہً یہ نہیں کہتے کہ قرآن شریف میں کوئی آیت منسوخ نہیں اور وہ اس طرح صراحتہً لکھتے تو بعض معتزلہ کے قول سے تشابہ ہوجاتا اور عام اہل علم اس پر غور کرنا ہی چھوڑ دیتے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ مشکل آیتوں کو تو انھوں نے حل کر دیا اور نہایت آسان آیات میں نسخ مان لیا۔ اگر اسلوب حکیمانہ پر ان کے بیان کو محمل کیا جائے تو ہمارا مذکورہ بالا نتیجہ اخذ کرنا بعید نہ ہوگا" (صلا۵۶۔۲۵۵)

قرآن کریم میں کوئی آیت منسوخ نہیں۔ شاہ صاحبؒ نے جس بنا پر صراحتہً ایسا نہیں لکھا۔ وہ دوسرے الفاظ میں وہی ہے جسے ہم نے شروع میں "تلبیل" سے تعبیر کیا ہے (ناسخ و منسوخ کی بحث کے لئے معارف القرآن کا محولہ صدر "مقدمہ" ملاحظہ فرمائیے)

۶۔ تفاسیر قرآن

جناب سندھی مختلف (مشہور و معروف) تفاسیر کے تذکرہ کے بعد فرماتے ہیں کہ

" ان سے ہمیں اپنی استطاعت کے مطابق سوائے تحیر کے کچھ نصیب نہیں ہوا .... ہم مانتے ہیں کہ پہلے زمانہ میں مسلمانوں نے انہی کتابوں سے قرآن سمجھا تھا جب وہ قرآن کی حکومت مجتہدانہ طور پر قائم کر رہے تھے مگر اس قسم کی تفسیروں سے قرآن فہمی ہمارے لئے ناممکن ہے" (صلا۲۴۴) اس سے آگے حاشیہ میں مذکور ہے "دور حاضر کے طلباء اور علماء کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ وہ کتاب الٰہی کی تعلیم کے وقت متن کو چھوڑ کر شرح (تفاسیر) پر زور دیتے ہیں۔ اور فن حدیث میں صحاح کی شرح حجۃ اللہ البالغہ سے پوری پوری غفلت برت کر صرف متون پر اکتفا کرنا شعار بنا لیا گیا ہے۔ یہ دونوں چیزیں غیر طبعی ہیں" (صلا۲۵۰)

قرآن کریم اپنی تفسیر آپ کرتا ہے اور اس کے لئے کسی خارجی ذریعہ کا محتاج نہیں۔ ہماری تفاسیر در اصل قرآن فہمی کی تاریخ ہیں۔ یعنی ان سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ فلاں فلاں دور میں قرآن کریم کس طرح سمجھا گیا۔ قرآن کی تفسیر خود قرآن ہی سے ہو سکے گی۔ یہی وہ اصول ہے جس پر جناب پرویز نے اپنی کتاب معارف القرآن کو ترتیب دیا ہے جو قرآن کو قرآن ہی کے رنگ میں پیش کرتی ہے تفاسیر کے متعلق تفصیلی معلومات اس کتاب کے محققانہ مقدمہ سے مل سکیں گی۔

۷۔ مکمل کتاب

جناب سندھی رقمطراز ہیں۔

" اس کا اثر یہ ہوا کہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے متن قرآن کی حقیقت اپنے اشراق سے اس طرح معین

کرلی کہ یہ کتاب بجائے خود ایک کامل مکمل نصاب ہے اس پر اضافہ کی کوئی ضرورت نہیں" (صفحہ ۱۴۹)

یہ ہے وہ سب سے بڑا الزام جو ہمارے خلاف عائد کیا جاتا ہے یعنی ہم قرآن کریم کو مکمل کتاب کیوں مانتے ہیں اور اس میں کسی اضافہ کی ضرورت کیوں نہیں سمجھتے! ہمارا دعوٰی یہ ہے کہ دین قرآن میں منحصر ہے اور قرآن ہی دین کا قانون اساسی ہے۔ قرآن رسول اللہؐ کی وساطت سے امت کو ملا۔ یہ حضورؐ کا منصب رسالت تھا۔ قرآن کا منشاء یہ ہے کہ زمین پر خدا کی حکومت قائم ہو یعنی قرآن کا قانون دنیا میں عملی طور پر نافذ ہو۔ امت تک قرآن پہنچانے کے ساتھ ساتھ حضورؐ پر حکومت الٰہیہ کے قیام کا فریضہ بھی عائد ہوا۔ اور یہ ایک بالکل فطری شی تھی۔ قرآن کاغذوں میں لکھے جانے اور زبان سے دہرائے جانے کے لئے نہیں نازل ہوا تھا بلکہ دنیا میں ایک نیا لیکن فطرت انسانی کے مطابق نظام زندگی قائم کرنے کے لئے نازل ہوا تھا۔ یہ نظام زندگی سب سے پہلے حضورؐ کے عہد سعادت مہد میں قائم ہوا۔ اور خلافت راشدہ تک جاری رہا اس میں قرآن کریم قانون اساسی تھا۔ کوئی چیز اس سے باہر نہ تھی اسی کی روشنی میں جزئی معاملات کے لئے فرعی قوانین مرتب ہوتے تھے اس کے بعد یہ سلسلہ گم ہو گیا اب (بتوفیق ایزدی) جس وقت پھر وہی نظام قائم ہو گا۔ اس میں قرآن قانون اساسی کی حیثیت رکھے گا اور دور اولٰے کے فرعی قوانین۔ نئے نئے مباحث و معاملات کے تصفیہ کے لئے قوانین مرتب کرنے میں مدد و معاون ثابت ہونگے۔ یہ ہے دین کی عملی شکل۔ ملاحظہ فرمائیے کہ اس باب میں جناب سندھی کا کیا ارشاد ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

۸۔ قرآن و سنّت و اجماع

"عام اہل علم قرآن شریف کے ساتھ سنت اور اجماع کو اولہ شرعیہ (یعنی دینی حجت۔ طلوع اسلام) میں شمار کرتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ سنت کو قرآن سے مستنبط چیز مانتے ہیں۔ لیکن اس استنباط کا طریقہ وہ نہیں ہے جو ائمہ فقہا میں مروج ہے۔ بلکہ حکمت کے اصول پر استنباط کرنے کے طریقے اور ان کے اصول شاہ صاحب کے یہاں علیحدہ مقرر ہیں خیرالکثیر میں اس مسئلہ کی انھوں نے تفصیل لکھدی ہے اس طرح پر اگر سنت کو مانا جائے تو قرآن کے استقلال پر کوئی زد نہیں پڑے گی۔ رسول اللہ (صلعم) کے عہد سے خلافت راشدہ کے آخری وقت تک یعنی

صلے یعنی قرآن کریم میں حکم موجود ہو۔ اور رسول اللہ نے اس پر عمل کر کے دکھایا ہو۔ اس طرح دین کا مستقل نصاب قرآن کریم ہی رہیگا۔ طلوع اسلام

شہادت حضرت عثمانؓ (۳۵ھ) تک شاہ صاحبؒ کی تحقیق میں مسلمانوں میں کبھی اختلاف نہیں ہوا۔ اس دور کو وہ دور اجماع کہتے ہیں۔ اس کی تفصیل ازالۃ الخفاء میں مذکور ہے شہادت حضرت عثمانؓ کے بعد اختلاف شروع ہوا۔ اب اجماع وہی مستند ہوگا جو مذکورہ دور اول کے تتبع میں منعقد ہو۔ شاہ صاحبؒ اس دور کو خیر القرون قرار دیتے ہیں۔ اس کی تفصیل ازالۃ الخفاء میں موجود ہے۔ اسے ساری دنیا جانتی ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کا مستند سوائے قرآن عظیم کے کوئی لکھی ہوئی چیز نہ تھی۔ اس پر یہ جماعت اپنے پارٹی پالیٹکس کے نظام کو استوار رکھتے ہوئے عمل کرتی تھی۔ اس پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کی طرف اشارہ ہے قرآن حکیم کی ذیل کی آیت میں۔ السّابقون الاوّلون من المہاجرین والانصار، والذین اتبعوھم باحسان رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ رسول اللہ کی صحبت اور تعلیم سے جو جماعت قرآن پر عمل کرنے کے لئے تیار ہوئی۔ اس کا وہ مرکزی حصہ جس کا ہر قول و فعل خدائے تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہے۔ وہ مہاجرین اور انصار کا پہلا طبقہ تھا۔ اس کی اتباع قرآن پر عمل کرنے کے لئے قیامت تک مسلمانوں کے لئے ضروری ہے۔ (یعنی قرآن کے اصولوں میں نہ کہ فرعی قوانین میں جس کے متعلق خود جناب سندھی نے اگلی سطروں میں فرمایا ہے کہ وہ ہر زمانہ میں قابل تغیر ہو سکتے ہیں۔ طلوع اسلام) جو چیز اس زمانہ میں متعین ہوگئی۔ اس کو اس شکل میں اور اسی معنی میں قائم رکھنا اتباع بالاحسان ہے۔ (اسی شکل سے مراد غالباً نماز۔ روزہ وغیرہ کی شکلیں ہیں جسے ہم عمل متواتر یا تعامل سے تعبیر کرتے ہیں۔ ورنہ فرعی معاملات کی شکلیں تو ہر زمانہ میں بدلتی رہیں گی۔ طلوع اسلام) زمانے کے تغیرات سے جو نئی چیز قابل بحث پیش آئے وہاں اس جماعت متبعین بالاحسان کا فیصلہ ماننا ضروری ہوگا (یعنی حکومت الٰہیہ قائم کرنے والی جماعت کی سنٹرل کمیٹی۔ طلوع اسلام) یہ اس دور کے مابعد کے اجماع کا حاصل ہے۔ اس طرح اجماع قرآن کی حکومت قائم کرنے والی جماعت کے متفقہ فیصلے یا اغلبیت کے فیصلوں کا نام ہوگا۔ لہذا اجماع قرآن سے علیحدہ کوئی چیز نہیں۔ بلکہ اجماعیات، قرآنی اصول کے تشریحی بائی لاز ہوں گے۔ اس سے کوئی ترقی کن جماعت۔ جو زمانہ کے طویل عرصہ میں کام کرے۔ خالی نہیں ہو سکتی۔ اس طرح اجماع بھی قرآن کے مقابل ایک مستقل اصل نہ رہا بلکہ قرآن کی حکومت قائم کرنے والی جماعت کے اتفاق کا نام ہوا۔ اس طور سے مسلمانوں میں قرآن کے

۳۵ھ۔ یعنی حکومت الٰہیہ کا قیام ہو اور اس میں مسلمانوں کی مرکزی جماعت متفقہ طور پر یا بالاکثریت کسی فیصلے پر پہنچے۔

(طلوع اسلام)

مستقل درجہ کا تعارف کرانے والی شخصیت امام ولی اللہ دہلوی ہیں۔ (ص۲۹۲-۲۹۳)

اسی چیز کو جناب سندھی نے حاشیہ میں اور بھی واضح فرمایا ہے۔ اقتباس سے پیشتر (عام قارئین کے سمجھنے کے لئے) ایک بات تمہیداً کہدینا ضروری ہے۔ متشدد فی الحدیث طبقہ کا مسلک یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم نے جو کچھ بھی ارشاد فرمایا وہ وحی (یعنی خدا کی طرف سے نازل شدہ) ہے اس کا ایک حصہ قرآن ہے۔ اور دوسرا حصہ احادیث۔ اس کی سند میں وہ قرآن کی یہ آیت پیش کرتے ہیں کہ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ اِنْ هُوَ الاَّ وَحیٌ یُّوحیٰ" (یعنی یہ رسول اپنی ذاتی خواہش سے کچھ نہیں کہتا بلکہ یہ تو وحی ہے جو اس پر بھیجی جاتی ہے) حالانکہ اس آیت کا مطلب بالکل واضح ہے کہ قرآن ایک وحی ہے جو حضور پر نازل کی گئی ہے۔ حضور اسے اپنی طرف سے وضع کر کے (معاذ اللہ) پیش نہیں کر رہے۔ اس کے بعد جناب سندھی کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیے۔ آپ لکھتے ہیں :-

" علمائے اصول فقہ لکھتے ہیں کہ اصولِ دین چار ہیں۔ کتاب و سنت و اجماع و قیاس۔ درحقیقت یہ تعبیر صحیح نہیں۔ کیونکہ قیاس تو وہی معتبر ہے جو اصول ثلاثہ سے مستنبط ہو۔ باقی رہے تین اصول۔ سو ہمیں بڑی محنت کے بعد معلوم ہوا کہ ساری سنت قرآن سے مستنبط ہے۔ خیر کثیر ص۸۷ میں اس کی تصریح موجود ہے (یعنی قرآن سے باہر سنت کہیں نہیں ہے: طلوع اسلام) پھر آنحضرت صلعم اور خلفاء ثلاثہ کے متفقہ فیصلہ کے بغیر کوئی عمل مستند نہیں ہے (یعنی اس دور میں اجماع انہی کے متفقہ فیصلوں کے نام تھا۔ طلوع اسلام) کیونکہ حضرت علیؓ کے عہد میں خیر الامم سے مشورہ کا جوہر کھو گیا تھا۔ لہذا اجماع کا مدار بھی کتاب و سنت پر ہوا۔ بناءِ علیہ اصل ہے فقط کتاب اللہ۔ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ، ای ماینطق بالقرآن عن الھویٰ ہمارا رسولؐ دین کے معاملہ میں کوئی ہوئی کی بات نہیں کہتا۔ ذاتی خواہش کو اس میں کچھ دخل نہیں۔ اور دین قرآن میں منحصر ہے اور قرآن ہی دین کا قانون اساسی ہے۔ یہاں ماینطق سے مطلق نطق (یعنی رسول اللہ کی ہر ایک بات طلوع اسلام) مراد رکھ کر وحی متلو اور غیر متلو کو ملا دیا گیا ہے۔ ہمارے یہاں یہ پسندیدہ نہیں۔ بلکہ مطلق نطق بالقرآن (یعنی قرآن کی بات۔ طلوع اسلام) مراد ہے۔"

اوپر کی عبارت چونکہ زیادہ واضح نہیں اس لئے اس سے شبہ ہو سکتا ہے کہ جناب سندھی کے نزدیک (یعنی شاہ صاحبؒ کی تعلیم کے مطابق) قرنِ اولیٰ کے مسلمانوں کے فیصلے (سنت) ناقابلِ تغیر ہیں اور انہیں اسی شکل میں قائم رکھنا اور اسی طرح ان کی اتباع کرنا ضروری ہے۔ ذیل کی تشریح میں جناب

سندھی نے اپنے مفہوم کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان فرما دیا ہے۔ وہ ارشاد فرماتے ہیں۔

"واضح رہے کہ جب اساسی قانون پر عملدرآمد شروع ہوتا ہے تو مخاطبین کی حالت کے مطابق چند تمہیدی قوانین بنائے جاتے ہیں۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ قانون اساسی غیر متبدل ہوتا ہے اور تمہیدی قوانین ضرورت کے وقت بدل سکتے ہیں۔ ہم سنت ان تمہیدی قوانین کو کہتے ہیں جو رسول اللہ صلعم اور آپ کے بعد خلفاء ثلاثہ نے مسلمانوں کی مرکزی جماعت کے مشورہ سے تجویز کئے۔ خلافت عثمانیہ کے بعد یہ نظام ٹوٹ گیا کہ تمام کام مشورے سے کئے جائیں۔ .... سنت کو ہمارے فقہا رحنفیہ رسول اللہ صلعم اور خلفائے راشدین میں مشترک مانتے ہیں اور یہی ہماری رائے ہے۔ اور یہ سنت قرآن ہی سے پیدا ہوگی۔ آج کل کی اصطلاح میں اس کو بائیلاز کہا جاتا ہے۔ .... اصل قانون اساسی متعین ہے۔ بائیلاز اس وقت اور تھے اس وقت اور ہونگے جن میں زمانہ کے اقتضا آت کے مطابق فروعی تبدیلیاں ہونگی۔ نئی نئی پیش آمدہ صورتوں کے متعلق تفصیلی احکام کا استخراج ہوگا۔ اور اس کا نام فقہ ہے" (صفحہ ۲۶)

یعنی رسول اللہ صلعم اور خلفائے راشدین نے حکومت الٰہیہ کے قیام میں باہمی مشاورت سے قرآن کریم کی روشنی میں جو تمہیدی قوانین (بائیلاز) مرتب فرمائے ان کا نام سنت ہے۔ یعنی اُس زمانہ کی فقہ۔ یہ بائیلاز ہر زمانہ میں بدلتے رہیں گے۔ لیکن اصل قانون (قرآن کریم) اپنی جگہ پر قانون اساسی کی حیثیت سے مستقل رہے گا۔

۹۔ قرآن اور حدیث

جناب سندھی کی مذکورہ صدر تصریحات کے بعد حدیث کی حیثیت واضح ہو جاتی ہے لیکن مزید جمع و تالیف کی رو سے احادیث کے مجموعوں کی کیا حیثیت ہے!

اس کے متعلق وہ مزید وضاحت فرماتے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ

"سورۃ النجم کی آیت ان ھو الا وحی یوحیٰ کی دو طرح تفسیر کی جاتی ہے۔

(۱) شاہ صاحبؒ کے طریقے پر تحقیق یہ ہے کہ ضمیر ھو قرآن کی طرف راجع ہے۔ اور ومَا ینطقُ عَنِ الھویٰ میں بھی نفس قرآنی کے متعلق بحث ہے۔

(۲) مگر اہل علم کی دوسری جماعت اس آیت کو قرآن سے مخصوص نہیں مانتی اور رسول اللہ صلعم کے تمام تر اقوال کو ایک طرح کی وحی ثابت کرنے پر زور دیتی ہے۔ ان کے نزدیک وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی

قرآنی نقل سے مقید نہیں ہے بلکہ رسول اللہ صلعم کا ہر قول وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی میں داخل ہے اور اسی کو اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی میں وحی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۱) ان حضرات کے نزدیک حدیث کی اصل بھی وحی ہی سے ثابت ہے فقط الفاظ کا فرق ہے۔ قرآنی الفاظ وحی سے معین ہوئے اور حدیث کے الفاظ رسول اللہ صلعم کے اپنے طبعی ملکہ سے صادر ہوتے ہیں مگر معنی سب کے سب وحی ہیں۔

(۲) پھر ان کے نزدیک یہ فرق بھی موجود ہے کہ قرآن خود رسول اللہ صلعم کے سامنے ایک مصحف میں کتابتہً محفوظ کر دیا گیا اور اس کی روایت بالتواتر قائم رہی لیکن حدیث میں جو وحی آئی ان کے نزدیک بھی نہ تو حضور کے زمانہ میں اس کی کتابت ہوئی اور نہ اس کے لئے تواتر ضروری ہے۔

ان لوگوں کی اصطلاح پر اگر کتب مقدسہ سابقہ کو کتب حدیث کا درجہ دیا جائے تو بطریق اولےٰ اس کو مستبعد نہیں سمجھنا چاہیئے۔ اگر یہ لوگ اس بات کو تسلیم کرلیں تو تمام اشکال حل ہو جائیں (۱) ہماری کتب حدیث میں بالاتفاق غیر صحیح روایات بھی موجود ہیں۔ (۲) نیز ان کتب حدیث میں ایک واقعہ کو مختلف طریقوں سے بھی روایت کیا گیا ہے۔ (۳) ہماری بہت سی کتب حدیث میں کاتبوں سے غلطیاں ہوتی رہتی ہیں جن کو محققین علماء درست کرتے رہتے ہیں۔ اسکے بعد اگر اناجیل اربعہ کو ہماری صحاح اربعہ (صحیحین - ابوداؤد- ترمذی) کے درجہ پر رکھدیا جائے تو ذرہ برابر اختلاف نظر نہیں آئے گا۔ (ص ۲۶۶-۲۶۵)

یعنی وحی تمام کی تمام قرآن کریم کے اندر محصور ہو چکی ہے اسکے باہر کہیں نہیں پھر جس طرح حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں نے آپؑ کی سیرت لکھی جس میں آپؑ کے اقوال و اعمال کو اپنی انفرادی کوشش سے جمع کیا اسی طرح سلمان ائمہ تاریخ و روایات نے نبی اکرمؐ کی سیرت اور حضورؐ کے عہد مبارک کی تاریخ مدون کی تاریخ و سیرت کی ان کتابوں کا نام جو اس طرح کی روایات پر مشتمل ہیں۔ کتب احادیث ہیں۔ نہ یہ وحی ہیں۔ نہ وحی (قرآن) کی طرح محفوظ اور اس لئے یقینی نہیں ہیں جس طرح کتب اناجیل یقینی نہیں ہیں (ان امور کی تفصیل کے لئے علامہ اسلم جیراجپوری کا مضمون "علم حدیث" اور جناب پرویز کا مضمون "شخصیت پرستی" ملاحظہ فرمائیے)۔

جناب سندھی کے مضمون کے حاشیہ میں خود شاہ صاحب کی عبارت درج ہے جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:
(عبارت فارسی میں ہے)

"کتاب الٰہی کے لئے دو چیزیں لازم ہیں۔ اول ملکوت کی برکتیں اور ملاء اعلیٰ کی خوشنودگی اور پسندیدگی

ہر اس شخص کے لئے جو کتاب کی تلاوت کرے اور اس کی اشاعت میں کوشش کرے۔ دوسرے طویل زمانوں کے گذر جانے پر بھی اس کتاب کا باقی رہنا اور امت کے لئے اس کے حفظ کرنے کی توفیق حاصل ہونا۔ اگر یہ دو باتیں نہ پائی جائیں تو وہ کتاب کتاب الٰہی نہ ہوگی بلکہ انسانوں میں سے کسی فرد کی تالیف ہوگی جس نے اپنے ارادہ سے علم پیغمبر کو جمع کیا۔ جیسے ہمارے دین میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم ہیں۔" (صفحہ ۲۶۵)

جناب سندھی کے الفاظ میں "اس طرح انبیاء کی سیرتوں کو جمع کرنا پہلے زمانہ میں بھی رائج رہا ہے" (صفحہ ۲۶۵)

لہٰذا کتب احادیث درحقیقت کتب تاریخ ہیں۔ اور کتب تاریخ میں ہر طرح کی روایات درج ہوتی ہیں۔

صحاح ستہ میں غلط روایات کا اختلاط

چنانچہ جناب سندھی فرماتے ہیں۔

"میں نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۰۵۲ھ) کے مقدمہ مشکوٰۃ میں جب یہ مضمون دیکھا کہ پچاس کے قریب حدیث کی کتابیں ہیں جن میں صحیح اور غیر صحیح احادیث جمع کی گئی ہیں اور شیخ صاحب نے ان سب کو ایک درجہ پر رکھا ہے۔ وہ صحاح ستہ میں بھی غلط روایات کا اختلاط اسی طرح مانتے ہیں جس طرح باقی کتب میں تو میرے دماغ پر ایک پریشانی طاری ہوگئی" (صفحہ ۲۶۵)

آگے چل کر جناب سندھی نے فرمایا ہے کہ یہ پریشانی حجۃ اللہ البالغہ کے مطالعہ کے بعد رفع ہوئی۔

ضعیف روایات متواتر کیسے بن جاتی ہیں

جناب سندھی مختلف طبقات کی کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"ان کے سوا بعض ایسے محدثوں نے بھی کتابیں تصنیف کیں جن کی لیاقت علمی بھی مسلم نہیں ہے۔ متاخرین محدثین نے .... ان غیر معتبر کتابوں کی روائتیں زوائد کے نام سے جمع کر دیں جس سے علم حدیث میں فتنے کا دروازہ کھل گیا۔ اس ذخیرہ میں کافی سے زیادہ روائتیں ایسی موجود ہیں جن کو دوسرے طبقہ کا مصنف ضعیف قرار دیتا ہے اور ان طبقات (یعنی تیسرے چوتھے اور پانچویں) میں پہنچ کر ان متاخرین کے نزدیک وہ حدیث متواتر بن جاتی ہے" اس کے بعد آپ نے ایک حدیث کی مثال دے کر لکھا ہے "ترمذی نے اس حدیث کی تضعیف کر دی۔ اب مستدرک حاکم کو دیکھئے۔ وہ اس جملہ مضاعفہ کو تیس چالیس سندوں سے روایت کرتا ہے۔ ایک غیر محقق عالم اس کثرت اسانید سے متاثر ہو کر اس کی صحت یا اس کے درجۂ شہرت اور تواتر پر یقین کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے ہم نے حاکم کی ان روایات کی تنقید فتح الباری کی امداد سے شروع کی تو ان میں سے ایک اسناد بھی صحیح نہ نکلی۔"

(صفحہ ۲۷۵)

صحیح بخاری کی ضعیف روایات

اس کے بعد آپ تحریر فرماتے ہیں۔ "تھوڑی تھوڑی غلطیاں ہر مصنف سے ہوتی رہیں چنانکہ امام بخاری جو سب سے زیادہ متقن مانے جاتے ہیں ان کی کتاب میں حافظ ابن حجر چالیس کے قریب ایسی احادیث مانتے ہیں جن کی اسانید ضعیف ہیں اور حافظ صاحب کے پاس بھی ان کا کوئی حل نہیں"۔ (ص۲۴۹) حاشیہ میں ہے "یوں تو حافظ ابن حجر نے صحیح بخاری میں سو کے قریب معلل روائتیں نکالی ہیں۔ پھر ان خدشات کے جوابات بھی بیان کئے ہیں مگر چالیس کے قریب روایات کا ضعف ان کے نزدیک اس درجہ کا ہے کہ بہ اعتراف حافظ اس کا کوئی جواب نہیں بن پڑتا"

صحیح اور ضعیف احادیث کا معیار

متشددین فی الحدیث طبقہ کا مسلک یہ ہے کہ موجودہ مجموعہ احادیث میں حدیثوں کی جو تقسیم ہو چکی ہے وہ اٹل ہے۔ اس پر کسی قسم کی تنقید نہیں کی جا سکتی۔ جسے صحیح قرار دیا جا چکا ہے وہ صحیح۔ جسے ضعیف کر دیا گیا ہے وہ ضعیف۔ یعنی اسے تقلیدًا ماننا پڑیگا قرآن کریم کی روشنی میں اپنی سمجھ سے آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ جناب سندھی فرماتے ہیں۔

"یہ خرابی جو عام اذہان پر مستولی ہے اس کی تہ میں یہ مرض پنہاں ہے کہ حدیث کے فن کو خصوصًا تصحیح اور تضعیف کو تقلیدًا اخذ کیا جاتا ہے۔ ایک ایسا عالم جو اپنی سمجھ سے صحیح حدیثوں کو صحیح سمجھتا ہو آج پیدا ہونا متعذر ہو گیا ہے۔[1] اسماء الرجال میں توثیق و تضعیف کا اختلاف پھر صحیح حدیث کی تعریف میں مختلف آراء۔ طالب العلم میں یکسوئی سے کوئی ملکہ پیدا ہونے نہیں دیتیں۔ آخر مجبور ہو کر۔ فقہا کا جو متوارث مسلک ہے اسی میں راجح و مرجوح کی تمیز پیدا کرنے کے بعد جو حدیث اس مسلک کے موافق ہو اسے صحیح اور جو مخالف ہو اس کو ضعیف بنانے کی استعداد حاصل ہونے پر طالب العلم اپنا سفر ختم کر دیتا ہے"۔ (ص۲۴۹) اور اس کے بعد دین کا واحد ٹھیکہ دار بن جاتا ہے جسے چاہے مسلمان سمجھے جسے چاہے کافر قرار دیدے۔

صحیح بخاری کی بعض احادیث

جیسا کہ طلوع اسلام کے صفحات پر کئی مرتبہ آ چکا ہے۔ ہماری کتب احادیث میں ایسی ایسی احادیث موجود ہیں جنہیں نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کرتے ہوئے دل کانپ اٹھتا ہے۔ ان مقامات کی تصریح سے ہم مجتنب رہے ہیں اس لئے کہ ان کا ذکر کرنا بھی بڑا مشکل ہے۔ دیکھئے جناب سندھی اس باب میں کیا فرماتے ہیں:۔

---

[1] جو اس کا دعوے کرتے ہیں ان پر کفر کے فتوے عائد کر دیئے جاتے ہیں۔

"جس قدر میری توجہ قرآن کی طرف بڑھتی گئی اور نوجوانوں کو بخاری کی بعض احادیث کا سمجھانا مشکل ہوتا گیا اسی قدر میرے سابقہ یقین میں تزلزل پیدا ہونے لگا۔ میں اس کا کبھی قائل نہیں ہوا کہ دینی تعلیم اگر عربی مدارس کے طلباء کو دی جائے تو اطمینان بخش ہو اور اگر وہی تعلیم کالج کے طلباء کو دی جائے تو اطمینان پیدا نہ کر سکے۔ اگر ایسا ہو تو وہ تعلیم حقیقی اسلام کی تعلیم نہیں ہوگی اس لئے کہ قرآن ساری دنیا کے لئے نازل ہوا ہے۔ اگر کالج کے طلبہ کو ہم قرآن کی تعلیم اسی طریقے پر (جو عربی مدارس میں کامیاب ثابت ہو) نہیں دے سکتے تو غیر مسلم لوگوں کو ہم کیا پڑھا سکتے ہیں.. ..... رہا یہ کہ بخاری میں میرے اشکالات کیا ہیں اور میں ایک یورپین نو مسلم کو وہ کتاب کیوں نہیں پڑھا سکتا۔ ان تفاصیل پر میں مجالس عامہ میں گفتگو کرنے کا روادار نہیں۔ اہلِ علم تو تکمیل کر چکے ہیں۔ یا تکمیل کے قریب ہیں۔ ان سے میں مذاکرات میں سب کچھ کہہ دوں گا" (صفحہ ۲۸۵)

علامہ حمید الدین فراہیؒ مرحوم اور حدیث

ہمارے زمانہ میں علامہ حمید الدین فراہیؒ ایک ایسے بزرگ عالم گذرے ہیں جنھیں قرآن کریم سے عشق تھا۔ ان کی تفاسیر کے مختلف ٹکڑے جو دائرہ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڈھ کی سعی و کاوش سے وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں۔ قرآن سے ذوق رکھنے والوں کے لئے بڑی قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ جناب سندھی نے اس مقام پر جناب فراہیؒ کا ایک واقعہ بھی نقل فرمایا ہے۔ آپ لکھتے ہیں۔

"مولانا حمید الدین مرحوم میرے بہت پرانے دوست تھے۔ قرآن شریف کے تناسق آیات میں ہمارا ذوق متحد تھا...... جب تک ہندوستان میں ان سے ملتا رہا۔ حدیث شریف کے ماننے نہ ماننے کا جھگڑا کبھی ختم نہیں ہوا۔ اتفاقاً جس سال میں مکہ معظمہ پہنچا ہوں۔ اسی سال وہ بھی حج کے لئے آئے۔ ہماری باہمی مفصل ملاقاتیں رہیں۔ انکار میں بے حد توافق پیدا ہو گیا تھا مگر وہاں بھی حدیث کے ماننے نہ ماننے پر بحث شروع ہو گئی۔ ہم نے سختی سے ان پر انکار کیا اور کہا کہ حدیث کو ضرور ہی ماننا پڑے گا۔ تنگ آ کر فرمانے لگے۔ آخر آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں میں نے کہا موطا مالک! فرمایا ہم اس کو مانتے ہیں۔ میں نے کہا بس آج سے ہمارا نزاع ختم ہے۔ ہم آپ کو صحیح بخاری ماننے کے لئے مجبور نہیں کرتے" (صفحہ ۲۸۶)

جناب حمید الدین فراہیؒ کی کتاب نظام القرآن شائع ہو چکی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب سے حدیث کے متعلق چند اقتباسات پیش کر دئے جائیں تاکہ ان کا مسلک بھی سامنے آ جائے۔ ان اقتباسات کے لئے ہم رسالہ البیان کے لئے شکر گذار ہیں۔ جناب فراہیؒ تحریر فرماتے ہیں۔

"یاد رہے کہ احادیث کی اکثریت ضعیف اور اقلیت صحیح ہے ...... حدیث۔ اجماع اور صحفِ اولےٰ یہ تینوں ظن و شبہ سے خالی نہیں...... میں نے بعض روائتیں دیکھی ہیں جو آیتوں کو جڑ سے اکھیڑ دیتی ہیں۔ اور ان کے نظام کو پارہ پارہ کردیتی ہیں...... ان لوگوں پر تعجب ہے جو آیت کی تاویل تو کر لیتے ہیں لیکن روایت کی تاویل کا حوصلہ نہیں رکھتے ...... تعجب پر تعجب ہے ان لوگوں پر جو ایسی روایتیں تسلیم کر لیتے ہیں جو نص قرآن پر بھی ہاتھ صاف کر دیتی ہیں۔ مثلاً کذب ابراہیم علیہ السلام اور نبی اکرم کا نطق قرآن بغیر وحی کے ایسی روایتوں کے تسلیم کرنے میں کوئی حرج نہیں جو اگرچہ اصول روایت پر پوری نہ اتریں۔ لیکن درایت کی کسوٹی پر کھری ثابت ہوں...... حدیث اور تواتر قرآن کو منسوخ نہیں کرسکتے ...... ہم اس عقیدہ سے خدا کی پناہ چاہتے ہیں کہ رسول خدا کے کلام کو منسوخ کرسکتا ہے۔ ایسا خیال یقیناً راویوں کا وہم و خطا ہے...... میں کہہ چکا ہوں کہ اختلاف احادیث میں قرآن حاکم ہے۔ یہاں اس قول کی وضاحت کیجاتی ہے میں بعض لوگوں کے طعن سے ڈرا کرتا تھا۔ لیکن حدیث کے متعلق ان کا مبالغہ یہاں تک پہنچ گیا کہ انھوں نے حدیث کو اس آیت کے تحت داخل کر لیا (انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون) یعنی حدیث کو بھی اللہ نے نازل فرمایا ہے اور وہی اس کی حفاظت کرنے والا ہے۔ ان لوگوں نے اپنے قول کے نتائج پر غور نہیں کیا۔ پس وقت آگیا کہ میں سچائی کا علم بلند کر دوں اور قطعاً پرواہ نہ کروں۔ چاہے میرا سر کاٹ ڈالا جائے اور میرا بند بند الگ کر دیا جائے ...... اکثر اہل حدیث کے دلوں میں یہ بات سما گئی ہے کہ بخاری اور مسلم نے جو کچھ روایت کر دیا۔ اس میں شک کی گنجائش نہیں پس ہم بعض قابل اعتراض مقامات لکھتے ہیں تاکہ تم سمجھ سکو کہ اللہ تعالےٰ نے علماء کو رب ٹھہرانے کی شناعت فرمائی ہے۔ پس ہم ان کے غیر معقول نکر و فہم پر ایمان لانے کے لئے تیار نہیں ...... پس ان متضاد روایات میں اطمینان کی کوئی صورت نہیں۔ ان سے اور زیادہ قلق و تشنگی کے سوا کوئی امید نہ رکھو طریق واضح اتباع لغت[ا] اور تدبر فی القرآن ہے۔ اور بس"

قرآن اور فقہ کی کتاب

جناب سندھی فرماتے ہیں:۔

"قرآن عظیم ہماری دانست میں اپنے موضوع کی مستقل کتاب ہے۔ گذشتہ

[ا] لغت کو بھی قرآن کے تابع ہونا چاہیئے۔

فصول میں ہم نے اس کی توضیح کرنے کی سعی کی ہے۔ مگر آیاتِ احکام پر عمل کرنے کے لئے ہمیں دورِ نبوت اور خلافتِ راشدہ کا طرزِ عمل معلوم ہونا ضروری ہے۔ اس کے لئے ہمیں ایک فقہ کی کتاب درکار ہے جس میں تصریح ہو کر رسول اللہ صلعم یوں نماز ادا کرتے تھے مسلمانوں سے زکوٰۃ اس طرح وصول کرتے تھے۔ بیع و شریٰ کے معاملات اس طرح طے ہوتے تھے غرض جمیع آیاتِ احکام کی تفصیل رسول اللہ صلعم اور خلفائے راشدین کے وفاقی دور (یعنی شہادت عثمانؓ تک) سے معلوم ہونی چاہیئے۔ اور یہ چیز موطا میں ملتی ہے۔ .... امام ولی اللہ قرآن عظیم کے معانی کو علیحدہ علیحدہ ابواب میں تقسیم کر چکے ہیں اور ان کے نزدیک ہر ایک باب ان میں سے اپنے افادے میں مستقل ہے۔ نہ تو کسی پہلی کتاب کا محتاج ہے اور نہ کسی بعد کے علم و عمل سے متاثر ہوتا ہے۔ البتہ فنِ احکام عملی طور پر آنحضرت صلعم کا اسوہ سمجھنے کا محتاج ہے۔ خیر القرون میں جس طرح قرآن شریف پر عمل کیا گیا وہ اہلِ مدینہ کے یہاں محفوظ تھا اور موطا اس کا ایک نصاب ہے اس لئے قرآن پڑھنے کے بعد موطا کی ضرورت بہر حال باقی رہے گی۔ شاہ صاحبؒ کی تقسیم میں احکام کے سوا جو فنون ہیں ان میں قرآن حکیم کسی فن (مثلاً مغازی و تفسیر اور فتن و ملاحم) کا محتاج نہیں ہے۔ اب ایک ایسے امام کے لئے جو اسلام کو قرآن شریف میں مکمل پاتا ہو موطا جیسی فقہ کی کتاب کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوگی۔" (صفحات ۱۰۶)

یعنی قرآن کریم کے بعد ضرورت صرف اس قدر باقی رہ جاتی ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ جن احکام کا ذکر قرآن میں موجود ہے ان پر رسول اللہ صلعم نے عمل کس طرح سے کیا۔ مثلاً قرآن کریم میں اقامت صلوٰۃ (نماز) کا حکم موجود ہے۔ اب دیکھنا یہ ہوگا کہ حضورؐ نے اس حکم پر عمل کس طرح کیا۔ چونکہ احکام پر عمل محسوس شکل میں ہوتا ہے اور یہ محسوس شکلیں امت میں متواتر نسلاً بعد نسلٍ چلی آ رہی ہیں اس لئے عمل متواتر قرآن کے احکام کی تفصیل ہے۔ اور ضروری موطا امام مالکؒ ایک مختصر سی کتاب ہے جس میں پانچ چھ سو سے زیادہ احادیث نہیں اور ان کا بھی بیشتر حصہ احکامات پر مشتمل ہے۔ اس لئے کتب احادیث میں فی الجملہ زیادہ صحیح ہے۔ قرآنی احکام کی عملی تفصیل کے لئے اگر اس کی طرف رجوع کر لیا جائے تو فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ لیکن بایں ہمہ یہ بھی جیسا کہ جناب سندھی نے فرمایا ہے۔ فقہ (بائیلاز) کی کتاب ہوگی۔ ان بائیلاز میں سے جو ایسے ہیں جن پر زمانہ کا تغیر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اسی شکل میں قائم رکھے جائیں گے (جیسے نماز روزہ وغیرہ) لیکن جو مقتضیاتِ زمانہ سے متاثر ہو جاتے ہیں ان کی جگہ ہر زمانہ میں دوسرے بائیلاز مرتب کئے جائیں گے۔ اس لئے کہ جناب سندھی کے الفاظ میں۔

"جب اساسی قانون پر عمل درآمد شروع ہوتا ہے تو مخاطبین کی حالت کے مطابق چند تمہیدی قوانین بنائے جاتے ہیں۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ قانون اساسی غیر متبدل ہوتا ہے اور تمہیدی قوانین ضرورت کے وقت بدل سکتے ہیں۔ ہم سنت ان تمہیدی قوانین کو کہتے ہیں جو رسول اللہ اور آپ کے بعد خلفائے ثلاثہ نے مسلمانوں کی جماعت کے مشورہ سے تجویز کئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ سنت قرآن ہی سے پیدا ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اصل قانون اساسی متعین ہوتا ہے۔ بائیلاز اس وقت اور تھے اس وقت اور ہونگے جن میں زمانہ کے اقتضاآت کے مطابق فروعی تبدیلیاں ہوں گی نئی نئی پیش آمدہ صورتوں کے متعلق تفصیلی احکام کا استخراج ہوگا اور اس کا نام فقہ ہے" (صفحہ ۲۶)

مرکزیت اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان بائیلاز میں تبدیلیاں پیدا کرنے کا حق کسے حاصل ہوگا؟ ظاہر ہے کہ اس کا حق حکومت الٰہیہ کی مرکزی جماعت کو ہوگا۔ جناب سندھی فرماتے ہیں۔

اس کے بعد میرے دماغ پر یہ اثر پیدا ہوا کہ قرآن عظیم دنیا کی تمام اقوام میں انٹرنیشنل انقلاب کا پروگرام ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر قرآن عظیم کی تعلیم کو انٹرنیشنل انقلاب کا پروگرام مان لیا جائے تو اس کے لئے تین چیزوں کی تعین ضروری ہے (الف) اس کا آئیڈیا (ب) اس کا پروگرام (ج) اس پروگرام کو چلانے والی سنٹرل کمیٹی کوئی انقلابی تحریک، پارٹی یا پالٹیکس کے سوا کامیاب نہیں ہوتی۔ اور ہر پارٹی پالٹیکس میں ان تین چیزوں کی تعین ضروری ہے۔

(۱) میں نے قرآن عظیم میں غور کر کے اس کا آئیڈیا اس آیت کو مقرر کیا ھُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ [۵۷]

(۲) پروگرام کے لئے پہلے حزب اللہ کی تعین و تحدید ضروری ہے۔ حزب اللہ اس پارٹی کا نام ہے جو قرآن عظیم کے انٹرنیشنل پروگرام کو کامیاب بنانا اپنا مقصد حیات قرار دیتی ہے۔ حزب اللہ کی ضروریات پر قرآن عظیم کی مختلف صورتوں میں کافی ہدایتیں دی گئی ہیں جہاں جہاں یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وغیرہ سے مومنین کو خطاب کیا گیا کہ وہ کفار اور منافقین کے راستے پر نہ چلیں بلکہ فلاں فلاں حکم کی اس اس طرح پابندی کریں۔ ان تمام مواقع کو حزب اللہ کا پروگرام سمجھنا چاہیئے۔ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے پہلے مخاطب حزب اللہ کے افراد ہی ہوتے ہیں

[۵۷] اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حقہ کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ دین تمام ادیان (نظامہائے حیات) پر غالب آجائے۔ خواہ یہ چیز مشرکین کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گذرے۔

اس میں مرد و عورت، عرب و عجم سب شامل ہیں۔ اس کا پہلا نمونہ (السّٰبقون الاوّلون من المھاجرین والانصار) اور ان کے بعد (والّذین اتبعوھم باحسان) قیامت تک کی جمیع اقوام مسلمہ کو شامل ہے۔ اس طرح یہ پروگرام قیامت تک جاری رہے گا۔" (ص ۲۹۴)

تصریحات بالا پر غور کیجئے اور پھر یہ دیکھئے کہ طلوع اسلام گزشتہ چار برس سے کس مسلک کی طرف دعوت دیتا چلا آرہا ہے؟ جو کچھ گذشتہ اوراق میں درج کیا گیا ہے اس کا ملخص یہی ہے کہ ۔

(۱) قرآن کریم مکمل کتاب ہے اور اپنی تفسیر میں کسی خارجی ذریعہ کا محتاج نہیں (۲) دین قرآن کریم کے اندر محصور ہے ۔ (۳) احکام قرآنی (مثل نماز۔ روزہ وغیرہ) کی عملی تشکیل نبی اکرمؐ نے متعین فرمائی جس کی پابندی امت کے لئے لازمی ہے۔ یہ عمل محسوس متواتر ہم تک پہنچا ہے ۔ (۴) نبی اکرمؐ کا ایک فریضہ تبلیغ رسالت (یعنی انسانوں تک قرآن کا پہنچانا) تھا اور دوسرا فریضہ حکومت الٰہیہ کا قیام (۵) حکومت الٰہیہ میں معاملات کے فیصلے قرآن کے قانون اساسی کی روشنی میں ہوتے ہیں۔ قانونِ اساسی متعین اور غیر متبدل ہے۔ لیکن اس کی روشنی میں مرتب شدہ فروعی قوانین (بائیلاز) زمانہ کے اقتضاآت کے مطابق بدلتے رہتے ہیں ۔ (۶) فروعی قوانین کی ترتیب و تدوین حکومت الٰہیہ کے اربابِ حل و عقد کی مرکزی جماعت کا فریضہ ہے جسے قیامت تک جاری رہنا چاہئے تھا

(۷) خلافت راشدہ کے بعد یہ نظام برہم ہوگیا اور دین میں انفرادیت اور ملوکیت آگئی ۔ (۸) اب پھر دین کو اپنی اصلی شکل میں قائم کرنے کے لئے حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی ضرورت ہے جس میں قانون اساسی قرآن کریم ہوگا۔ اور تمہیدی قوانین (بائیلاز) قرآن کی روشنی میں اپنی ضروریات کے مطابق مرتب کئے جائیں گے اس میں قرنِ اولیٰ کی فقہ (بائیلاز) سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے اس طرح امت کے تمام اختلافات مٹ جائیں گے۔

(۹) کتب احادیث تاریخ کی ان کتابوں کا نام ہے جن میں عہد نبویؐ اور عہد صحابہؓ کے احوال و کوائف درج ہیں۔ انسانوں کی انفرادی کوشش کا نتیجہ ہے اس لئے ظن و تخمین اور شک و شبہ سے بلند نہیں ہے نہ ہی تنقید سے بالا جس طرح کتب اناجیل وغیرہ احادیث کے صحیح اور ضعیف ہونے کا معیار قرآن کریم ہے۔ جو احادیث اس معیار پوری اتریں۔ ان سے ہم اپنے زمانہ کے بائیلاز مرتب کرنے میں مدد لے سکتے ہیں۔ (۱۰) نبی اکرمؐ کا منصبِ رسالت پیغمبری حضورؐ کی ذات گرامی تک ختم ہوگیا۔ اب کوئی نبی اور رسول نہیں آسکتا۔ لیکن منصب امامت (حکومت الٰہیہ کا قیام و بقا) خلافتِ راشدہ میں منتقل ہوگیا اگر وہ نظام قائم رہتا تو یہ منصب آج تک جاری رہتا۔ اس منصب کے احیا میں ہی اصل دین کے احیاء کا راز مضمر ہے ۔

نقد و نظر

ایران بعہد ساسانیاں

ڈاکٹر آرتھر کرسٹن سین کی تصنیف بزبان فرانسیسی کا اردو ترجمہ۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی۔ مترجم ڈاکٹر محمد اقبال پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور۔ ۸۰۲ صفحات۔ قیمت مجلد عـــہ۔ غیر مجلد عـــہ

مصنف ۱۹۱۹ء سے جامعہ کوپن ہاگن (ڈنمارک) میں السنۂ ایرانی کے پروفیسر ہیں۔ ۱۹۳۴ء میں فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے موقعہ پر وہ ڈنمارک کی طرف سے نمائندہ بن کر ایران گئے تھے۔

"کتاب ساسانی خاندان کے تمدن کی تاریخ ہے۔ اس خاندان کی بنا اردشیر اوّل نے ۲۲۶ء میں ڈالی اور ۶۶۱ء میں عربوں کی تلوار نے اس کا خاتمہ کیا" اس خاندان کی سب سے بڑی اہمیت دنیا کی تاریخ میں یہ ہے کہ انہوں نے مسلسل چار سو سال تک رومیوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکے رکھا، ورنہ سارا مغربی ایشیا، اور شاید ہندوستان بھی اب سے سترہ سو برس پہلے یوروپ کا محکوم ہو چکا ہوتا"

اور بالخصوص مسلمانوں کے لئے یہ کہ "خاندانِ ساسانی کے وارث و جانشین عرب بنے، ساسانیوں کے تمدن نے عربوں پر بہت گہرا اثر ڈالا .... عباسیوں نے تو سر سے پاؤں تک ساسانی شعار اختیار کر لیا۔ وہی آئینِ دربار، وہی عہدے، وہی طرزِ حکومت، وہی رسم و رواج، وہی روایات، حتیٰ کہ ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ساسانی خاندان دوبارہ زندہ ہو کر عباسی خاندان کہلایا" پھر یہی روایات دارالخلافت بغداد سے نکل کر تمام عالم اسلامی میں سرایت کر گئیں اور "یہ کہنا غلط نہیں کہ اکبر اور شاہجہاں کا دربار، نوشیرواں اور خسرو پرویز کا دربار تھا"

اس کتاب میں واضح کیا گیا ہے کہ زرتشت کے اصلی مذہب پر کن کن افکار و عقائد کا اثر پڑا۔ مثلاً مانیت ایشیائے کوچک کے پراسرار مذاہب، یہودیوں کے قبالائی اور باطنی عقائد، عرفانیت، مزدکیت، فلسفۂ یونان، وغیرہ، ان سب اثرات کا نتیجہ یہ ہوا کہ

"وہ ابتدائی خوش بینی جو محنت اور کام کی محرک تھی اور جس پر مذہب زرتشت کی بنیاد تھی، جدید خیالات کے

نیچے دب گئے، زہد اور ترکِ دنیا کی طرف میلان ...... رفتہ رفتہ زرتشتیوں کے تصور میں بھی داخل ہوگیا اور اُن کے مذہب کی بنیاد کو کھوکھلا کرتا گیا۔"

ان کے علاوہ ساسانیوں کے عقائد و افکار پر نہ صرف آریاؤں کے قدیم مذہب کا اثر تھا بلکہ ہندوستان کے عقائد بھی اثر انداز ہوتے رہے۔ چنانچہ فاضل مصنف لکھتا ہے کہ

"زہد و ریاضت زرتشتی اصول کے بالکل خلاف ہے لیکن عیسائیوں، عرفانیوں، عانیوں، اور مزدکیوں نے ترکِ دنیا اور زہد کی ایسی رٹ لگائی کہ بالآخر اس کے اثرات متعدی ہو کر مزدائیوں میں بھی پھیل گئے ان اثرات بر ہندوستانی عقیدوں کا اور اضافہ ہوا جن کا برزویہ (خسرو اوّل کے شاہی طبیبوں کا رئیس) سب سے بڑا نمائندہ تھا۔"

تقدیر کا غلط مفہوم کہ جس نے مسلمانوں جیسی ہمہ تن ہمت قوم کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا۔ اس کی داغ بیل اسلام سے سو سال پیشتر خسرو اوّل کے عہد میں ڈالی جا چکی تھی۔"

"زروانی عقائد جو ساسانیوں کے عہد میں مروّج تھے اس زمانے میں جبر کا عقیدہ پیدا کرنے میں ممد ہوئے جو قدیم مزدائیت کی روح کے لئے سمِ قاتل تھا۔ خدائے قدیم زروان جو اہورمزد اور اہرمن کا باپ تھا نہ صرف زمانِ نامحدود کا نام تھا بلکہ "تقدیر" بھی وہی تھا۔ کتاب دادستان مینوگ خرد میں ...... "عقلِ آسمانی" (یا روحِ عقل) حسب ذیل اعلان کرتی ہے

انسان خواہ کتنا ہی طاقتور، ذہین اور ذی علم کیوں نہ ہو تقدیر کا مقابلہ نہیں کر سکتا کیونکہ تقدیر جب نیکی یا بدی کرنے پر آتی ہے تو عاقل کام کرنے سے عاجز رہ جاتا ہے اور بدمنش میں کام کی اہلیت پیدا ہو جاتی ہے بزدل دلیر اور دلیر بزدل ہو جاتا ہے، کاہل محنتی اور محنتی کاہل ہو جاتا ہے۔"

باوجودیکہ دینِ زرتشتی حکومت کا مذہب تھا۔ یہ ملکی سیاست سے بالکل الگ تھا اور مذہبی پیشواؤں کے فرائض جو ایک خاص قبیلۂ مغان سے منتخب کئے جاتے تھے مندرجہ ذیل تھے۔

"مراسمِ تطہیر کا ادا کرنا۔ گناہوں کے اعترافات کا سننا اور ان کو معاف کرنا، کفاروں کا تجویز کرنا ولادت کی مقررہ رسوم کا انجام دلوانا، رشتۂ مقدس یعنی زنّار (کستیگ) کا باندھنا، شادی اور جنازہ

اور مختلف مذہبی تہواروں کے مراسم کی نگرانی ۔ ۔ ۔ ان کے لئے ضروری تھا کہ سونے اور جاگنے اور نہانے اور زنار باندھنے اور کھانے اور چھینکنے اور بال یا ناخن ترشوانے اور قضائے حاجت اور چراغ جلانے کے وقت خاص خاص دعائیں پڑھیں .... جو شخص میت یا زچہ کو چھو جائے اس کی ناپاکی کو دور کرنے کے لئے جو رسم و قواعد تھے ان کا پورا کرنا "...

یہ وہ مباحث ہیں جو مسلمانوں کے افکار و عقاید کی تاریخ کے طالب علم کے لئے خالی از دلچسپی نہ ہوں گے۔ ان سے واضح ہوتا ہے کہ ہمارے موجودہ افکار و عقاید کے بیشتر حصہ کا سرچشمہ کیا ہے ۔ یہ وہ عجمیت تھی جن کے متعلق علامہ اقبالؒ نے لکھا ہے کہ :-

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد ‏ ‏ ‏ محبت میں یکتا حمیت میں فرد!

عجم کے خیالات میں کھو گیا ! ‏ ‏ ‏ یہ سالک مقامات میں کھو گیا

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے! ‏ ‏ ‏ مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

کتاب زیادہ تر عہد ساسانی میں ایرانیوں کے تمدن پر مشتمل ہے اور یہی چیز ہے جس کو زیادہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ جنگوں کے واقعات بہت کم لکھے ہیں ۔ مجموعی حیثیت سے کتاب دلچسپ اور پر از معلومات ہے۔ فاضل مصنف نے بہت محنت سے لکھی ہے ۔ ترجمہ بھی عمدہ ہے ۔

مترجم نے شجرۂ نسب خاندان ساسانی اور متعدد مقامات پر مفید حواشی کا اضافہ کیا ہے فحش مقامات حذف کر دیئے ہیں تاکہ کتاب طالب علموں کے لئے بھی قابل مطالعہ اور مفید ہو سکے ۔ اردو زبان میں اس موضوع پر شاید ہی کوئی کتاب موجود ہو ۔ انگریزی میں بھی صرف راؔلنسن کی "تاریخ ساسانیاں" ہے لیکن وہ اس میں صرف لڑائیوں کے حالات ہیں "۔ اس کتاب کی اشاعت میں انجمن ترقی اردو نے بھی بڑی ہمت سے کام لیا ہے ورنہ اہل ذوق جانتے ہیں کہ اس قسم کی علمی کتابوں کی اشاعت جن کا کوئی گاہک نہیں کس قدر دشوار ہے "

معارف قرآنیہ جناب مشتاق احمد خاں صاحب کے نام سے قارئین طلوع اسلام ناواقف نہیں سلسلۂ اصلاح میں آپ کے قابلِ قدر مضامین رسالہ میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں جن سے آپ کا نظریہ اور مسلک واضح ہے آپ قرآن کریم کو مکمل ضابطہ حیات مانتے ہیں اور قرآن کو قرآن ہی سے

سمجھنے کے قائل ہیں۔ اس انداز سے قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ قرآنی تعلیم کو مختلف عنوانات کے ماتحت یکجا جمع کیا جائے اور اس طرح قرآن کریم کی مختلف آیات سے قرآن کا مفہوم متعین کیا جائے۔ آپ نے قرآن کریم کو اس نہج سے سمجھا ہے اور اسی نہج سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے پیشتر ان کی ایک کتاب جذبات توحید کے نام سے شائع ہوئی تھی جس کا تذکرہ طلوع اسلام کے صفحات میں آچکا ہے۔ اب زیر نظر کتاب اس سلسلہ کی ایک اور کڑی ہے۔ اس میں جناب مؤلف نے حروف تہجی کے لحاظ سے چند عنوانات کو یکجا جمع کیا ہے۔ ہر عنوان کے ماتحت قرآنی آیات اور ان کی مختصر سی تشریح ہے۔ جس سے مفہوم سامنے آجاتا ہے۔ جناب مؤلف اپنی اس مبارک کوشش میں کامیاب ہیں اور درخورِ تحسین ضلع مظفر گڈھ کی "بے برگ و گیاہ" زمین میں ایسی شادابی قرآن ہی کا اعجاز ہے۔ کتاب متوسط تقطیع کے ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور اس گرانی کے زمانہ میں جو کاغذ لگایا گیا ہے۔ از بس غنیمت ہے۔ جماعت المسلمین۔ لیہ ضلع مظفر گڈھ سے ایک روپیہ میں (علاوہ محصول ڈاک) مل سکتی ہے۔

ایک شکایت ہمیں بعض احباب سے ایک جفائے دفا نما کا گلہ ہے جس کا تذکرہ ضروری ہے۔ معارف القرآن کسی صاحب کی خدمت میں بذریعہ وی۔ پی نہیں بھیجی جاتی تاوقتیکہ ان کی طرف سے واضح الفاظ میں فرمائش نہ پہونچ جائے۔ لیکن دو تین احباب نے صاف صاف الفاظ میں خطوط لکھنے کے بعد وی۔ پی واپس کر دئے اور جب ان کی خدمت میں شکایت نامہ لکھا گیا تو خاموش ہوگئے! اب وہ اپنی اس روش کے متعلق خود ہی فیصلہ فرمالیں۔ ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔

نظریۂ ارتقاء اور قرآن کریم

(از جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز)

[طلوع اسلام بابت اکتوبر [illegible]ء میں جناب پرویز کا بصیرت افروز مضمون نجات کا قرآنی نظریہ شائع ہو چکا ہے۔ اس میں نظریۂ ارتقاء کا ضمنی طور پر ذکر آگیا تھا چونکہ یہ موضوع بجائے خویش بہت اہم ہے۔ اس لئے ہماری درخواست پر انھوں نے اس عنوان پر الگ مقالہ تحریر فرمایا ہے۔ یہ دونوں مضامین فی الحقیقت ایک ہی اصل کی دو شاخیں ہیں۔ دونوں کو سامنے رکھنے سے انسان کی موجودہ اور آئندہ زندگی کے متعلق قرآن کریم کی تعلیم اس قدر واضح ۔۔۔ دلنشین اور مدلل طریق پر سامنے آجاتی ہے جس سے ذہن میں جلا ۔ نگاہوں میں روشنی اور قلب میں نور ایمان جگمگا اٹھتا ہے۔ جناب پرویز نے ہمارے سامنے فہم قرآن کی ایک نئی راہ کھول دی ہے جس سے اس قسم کے نظری مسائل بھی زندگی کے عملی شعبوں کی حیثیت سے سامنے آجاتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ ہمیں ان کے تدبر فی القرآن کے نتائج سے مستفیض ہونے کا تا دیر موقعہ عطا فرمائے۔ طلوع اسلام]

انسانی بچہ کی پیدائش آج ہمارے نزدیک ایک ایسا ہی عادی اور معمولی واقعہ بن چکی ہے جیسے سورج کا اپنے وقت معینہ پر طلوع۔ لیکن اسباب وعلل کی کڑیوں میں جکڑا ہوا انسان جب اس کتاب تخلیق کے اوراق کو پیچھے کی طرف الٹتا ہے تو اس کی نگہ استعجاب کا اس مقام پر جا کر رک جانا ضروری ہے جسے وہ انسانی تخلیق کے سلسلہ کی ابتداء سمجھتا ہے۔ وہاں پہنچکر وہ ششدر کر رہ جاتا ہے کہ سب سے پہلا انسان کس طرح وجود میں آگیا اس کا تحیر بجا اور اس کا تعجب درست ہے انسانی تحقیق وتفتیش کا ماحصل، اس کے تمام انکشافات وایجادات کی لم صرف اس قدر ہے کہ وہ کارگہ عالم کے مختلف پرزوں کی علت ومعلول کی کڑیوں کو دریافت کر لیتا ہے لیکن جہاں اس سلسلہ دراز کی آخری کڑی آجاتی ہے اس کے بعد اس کی نگہ تجسس کے سامنے حیرت کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ یہ مقام تحیر انسانی

(Theory of Organic Evolution)

علم وتحقیق کی نسبت سے متعین ہوتا ہے۔ یعنی جس قدر علم وبصیرت میں اضافہ ہوتا جائے گا اسی قدر یہ مقام آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچکر ایک خدا فراموش مادہ پرست اور حق شناس عبدِ مومن کا فرق نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے۔ اول الذکر اس مقام سے اگلی منزل کو اپنی ذہنی قیاس آرائیوں کی آماجگاہ بناتا ہے اور اس طرح خود بھی سیدھے راستے سے بھٹکتا ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے لیکن ایک حکیم مومن وہاں پہنچکر بلا تامل پکار اٹھتا ہے کہ اس سلسلۂ دراز کی ابتداء اس فاطرِ مطلق کی مدد و فراموش مشیئت اور نیوز ناآشنا تدبیر کی رہین منت ہے جو تمام اسباب وعلائق سے بے نیاز اور جملہ علل وذرائع سے مستغنی ہے۔ وہ علی وجہ البصیرت اس حقیقت عظمیٰ کا اعلان کرتا ہے اور اس طرح حیرت واستعجاب کی وہ وادی جو اس خدافراموش محقق کی قیاس آرائیوں سے تیرہ وتار ہو چکی تھی، اس مردِ خود آگاہ وخدامست کی مشعلِ ایمان ویقین سے جگمگا اٹھتی ہے۔

"سب سے پہلا" انسان کس طرح وجود میں آگیا؟ یہ ہے وہ مقامِ تحیر جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے جب ذہن انسانی ہنوز اپنے عالم طفولیت میں تھا تو وہ بھلا اس پیچیدہ معمہ کو کیسے سلجھا سکتا تھا! وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا تھا کہ یہ کہہ کر اپنے دل کو اطمینان دے لے کہ سب سے پہلے ایک مٹی کا پتلا بنا ہوگا جس میں اللہ نے کسی طرح جان ڈال دی۔ اور پھر اس کی "پسلی چیر کر" اس میں سے اس کے لئے ایک بیوی پیدا کردی اور یوں یہ سلسلہ آگے بڑھا۔ لیکن جب انسان اور آگے بڑھکر اپنے شعور کی دنیا میں آیا تو اس کے عہد طفولیت کی توجیہ اس کے لئے وجہ تسکین نہیں ہو سکتی تھی اس کے اضطراب نے کاوشِ تجسس طلبِ تحقیق کی صورت اختیار کی اور اس علم الاشیاء کی مدد سے جو اس کی فطرت میں ودیعت کرکے رکھدیا گیا تھا اس نے ان پیچ در پیچ رموز کی گرہ کشائی کی کوشش شروع کی اور رفتہ رفتہ اس کی تحقیقات نے اس نتیجہ کی صورت اختیار کرلی جسے اس نے نظریۂ ارتقاء سے تعبیر کیا۔ اس نے معلوم کیا کہ کائنات میں نہایت منظم ومربوط طریقہ سے ایک سلسلۂ تدرج وتحول جاری وساری ہے۔ ہر شے خاص قوانین کے ماتحت۔ بتدریج نشو وارتقاء کے مراحل طے کر رہی ہے اور یوں ایک سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتی چلی جا رہی ہے۔ یہ تحول وتقلب ایسے غیر محسوس انداز سے عمل میں آرہا ہے کہ گہری تحقیق وکاوش کے بغیر نگاہ اس تک پہنچ نہیں سکتی۔ اور پھر یہ تبدیلی اتنے اتنے لمبے عرصہ میں ظہور پذیر ہوتی ہے کہ انسانی یادداشت کے لئے اس کا ریکارڈ رکھنا مشکل ہے اس لئے ان تدریجی تبدیلیوں کے لئے خود صحیفۂ فطرت کے اوراق اور خزائن ودفائن ارضی کے نقوش وآثار کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔

سائنس نے مذہب کو اپنا حریف سمجھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عصرِ حاضرہ میں سائنس کا مسکن دیارِ مغرب ہے اور علمی دنیا کی بدبختی کہ مغرب کے سامنے مذہب وہ تھا جو علم و بصیرت کا دشمن تھا اس لئے مذہب و سائنس کی آویزش کے متعلق اہلِ مغرب کا یہ فتویٰ کچھ غلط نہ تھا۔ غلطی صرف اتنی تھی کہ انھوں نے مذہب کی تخصیص کی اور جب انھوں نے تخصیص کی تو پھر ہر جگہ یہی مشہور ہو گیا کہ نفسِ مذہب ہی علم و بصیرت کا حریف ہے۔ اسی تعمیم کا نتیجہ تھا کہ اسلام جیسے سراپا علم و بصیرت پر مبنی اور عقل و دانش کے مؤید مذہب کے متعلق بھی یہی غلط فہمی پھیل گئی۔ وہ دن ارتقائے انسانیت کے لئے انتہائی شوریدہ بختی کا تھا جب اسلام کے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا کہ یہ سائنس کا حریف اور توہم پرستی و جہالت کا حامی ہے۔ اس سے بڑا جھوٹ کبھی نہیں بولا گیا۔ اس سے بڑی حماقت "اہلِ علم و عقل" نے کبھی نہیں کی۔ اس وقت ہم اس سے بحث نہیں کرنا چاہتے کہ اس جرم میں خود مسلمانوں کا کتنا بڑا حصہ ہے۔ صرف یہ واقعہ بتلانا چاہتے ہیں کہ دنیائے عقل و بصیرت اپنے اس غلط فیصلے کی وجہ سے کس قدر عظیم المرتبت نور سے محروم رہ گئی۔ ورنہ اگر مغرب کے متلاشیانِ حقیقت کے سامنے قرآن آجاتا تو نہ معلوم دنیا کیا سے کیا ہو جاتی! زیرِ نظر موضوع میں سائنس کا معرکتہ الآرا کارنامہ نظریۂ ارتقاء یعنی اشیائے فطرت میں تدریجی نشو و عروج کی تحقیق ہے۔ ذرا قرآن کریم کے اوراق کو کھولئے اور دیکھئے کہ اس باب میں اس کا کیا ارشاد ہے۔ ہم دیگر اشیائے کائنات سے ہٹ کر اس وقت اپنی توجہ صرف تخلیقِ انسانی کے گوشہ پر مرکوز رکھنا چاہتے ہیں اس لئے کہ سرِدست اس عظیم الشان نظریہ کا یہی پہلو ہمارے پیشِ نظر ہے یہ بھی واضح رہے کہ قرآن کریم تو سائنس کی تحقیقات کی کتاب نہیں۔ اس کا اصل موضوع تو تکمیلِ شرفِ انسانیت ہے اس موضوع کی تائید و تبیین کے سلسلہ میں ضمناً اور تبعاً دوسری چیزوں کا بھی ذکر آجاتا ہے لیکن یہ ذکر چونکہ اس خدائے علیم و حکیم کی طرف سے ہے جو فطرت کا خلاق اور کائنات کا پروردگار ہے اس لئے ہو نہیں سکتا کہ اس کی طرف سے ضمناً کوئی اشارہ آجائے اور وہ تحقیق و تفتیش کے بعد (معاذ اللہ) غلط ثابت ہو۔ مسئلہ زیرِ نظر میں بھی اسی طرح قرآن کریم میں ضمنی اشارات آئے ہیں لیکن ان اشارات ہی سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ کیا قرآن کریم جہالت اور توہم پرستی سکھاتا ہے یا اس کی تعلیم علم و دانش کی ان بلندیوں سے بھی آگے لیجاتی ہے جہاں اب تک عقلِ انسانی جا سکی ہے اور اس کے بعد جہاں تک پہنچنا اس کے لئے ممکن ہے۔

اشیائے کائنات کی ابتداء، تدریجی مراحل اور تکمیل کے متعلق قرآن کریم نے ایک اصول بیان فرمایا ہے۔ جو

جو اس تمام بحث و نظر کا نقطۂ ماسکہ ہے (اور جس کا ذکر ہم اپنے مضمون "نجات کا قرآنی نظریہ" مطبوعہ طلوع اسلام بابت اکتوبر ۱۹۴۲ء میں کر چکے ہیں) ارشاد ہے۔

یدبر الامر من السماء الی الارض ثم یعرج الیہ فی یوم کان مقدارہٗ الف سنۃ مما تعدون ۝ ذالک عالم الغیب والشھادۃ العزیز الرحیم ۝ ۳۲

اللہ ایک امر (اسکیم) کی تدبیر آسمان سے زمین کی طرف کرتا ہے۔ پھر وہ اسکیم (اپنے ارتقائی مراحل طے کر کے) اس کی طرف بلند ہو جاتی ہے ایک دن (منزل) میں جس کی مقدار تمہاری گنتی کے اعتبار سے ہزار سال ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ ذات جو غیب و حاضر کی جاننے والی غالب اور رحیم ہے۔

مشیت ایزدی کے سامنے ایک اسکیم ہوتی ہے جسے اس کی انتہائی پستی یعنی نقطۂ اولیں سب سے نچلی منزل سے شروع کیا جاتا ہے۔ پھر وہ اسکیم ان خاص قوانین کے ماتحت جو اس کے لئے متعین کئے جاتے ہیں۔ نشو و ارتقاء کے مراحل طے کرتی ہوئی اپنی تکمیل کے نقطۂ آخرین تک جا پہنچتی ہے۔ یہ مراحل بڑے بڑے طویل المیعاد "ایام" (Periods) میں طے ہوتے ہیں۔ ہزار ہزار سال۔ اور دوسری جگہ ہے کہ بعض اوقات پچاس پچاس ہزار سال بیج کو درخت۔ قطرے کو گہر۔ خاک کے ذرے کو انسان بننے کے لئے ان طویل المیعاد مراحل میں سے گذرنا پڑتا ہے۔ کارگہ مشیت کے ان عظیم المرتبت امور (Schemes) میں سے ایک اہم اسکیم انسان کی تخلیق ہے۔ اس اسکیم کا نقطۂ آغاز طین (درجۂ جمادات) بتایا گیا ہے۔ یہ پہلی سٹیج ہے۔ وبدا خلق الانسان من طین ۝ ۳۲ (انسانی تخلیق کی ابتدا مٹی سے کی)

طبقۂ جمادات، زندگی کے اس جوہر خصوصی سے عاری ہے جو نشو و نما کا کفیل ہے۔ حیات کا سرچشمہ پانی ہے

وجعلنا من الماء کل شیء حی ۝ ۲۱

اور ہم نے ہر شئے کو پانی (الماء) سے حیات عطا فرمائی۔

زندگی نے اپنی آنکھ پانی کی گہرائیوں میں کھولی۔ سائنس کی یہی تحقیق ہے کہ حیات کے جرثومۂ اولیں (Protoplasm) کی ابتدا سمندر میں ہوئی ہے اس لئے کہ اس میں اسی نوعیت اور اسی تناسب کے املاح (Salts) پائے جاتے ہیں جیسے سمندر کے پانی میں۔

"پانی اور مٹی کے" امتزاج سے اس جرثومہ نے خلیہ[۱] (Cell) کی شکل اختیار کی جس کے ہیولیٰ کو

---

[۱] خلیہ (Cell) مادۂ خمیر (Nucleus) اور پیکر (Cell-Body) سے مرکب ہوتا ہے۔

ن کریم میں طین لازب (چپکتی مٹی) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اِنَّا خَلَقْنٰھُمْ مِّنْ طِیْنٍ لَّازِبٍ ﴿۳۷/۱۱﴾

ہم نے انھیں طین لازب سے پیدا کیا ہے

طین لازب ہے جو تالابوں کی تہ میں اور جوہڑوں کے کنارے دکھائی دیتی ہے۔ جب پانی سوکھ جاتا ہے تو یہ
یاہ رنگ کی مٹی بڑی سخت ہو جاتی ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۱۵/۲۶﴾ (۵۵/۱۴)

اور بلاشبہ یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو خمیر اٹھے ہوئے گارے سے بنایا جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے
دریانی کی اس آمیزش سے حیات کی ابتدا ہوئی۔ ان خلیات (Cells) میں ایک لیسدار مادہ
(Nucleus) زندگی کے تمام عظیم المرتبت امکانات اپنے اندر لئے ہوتا ہے۔ جیسے ایک ننھا
ایک تناور درخت کو اپنے اندر سمیٹے نمو و شگفتگی کے لئے ہمہ تن اضطراب ہو۔ حیات کا یہ نقطۂ آغاز وہ
واحدہ ہے جس سے شجرِ زندگی کی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ ایک خلیہ (Cell) خاص مقدار تک پہنچکر
س نمو سے خود بخود دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے جنھیں (Daughter Cells) کہا جاتا ہے
نس واحدہ سے وحدت خلق کا عظیم الشان اور محیر العقول فلسفہ متجسس نگاہوں کے سامنے بے نقاب ہو جاتا
وحدتِ خالق اور وحدتِ خلق قرآنی تعلیم کے وہ بنیادی ستون ہیں جن پر انسانی تمدن۔ بلکہ یوں کہئے کہ
انیت کی ساری عمارت قائم ہے اس نفس واحدہ سے مخلوق کی شاخیں پھوٹیں اور ایک طویل القامت
کی طرح ساری دنیا میں پھیل گئیں۔ ہر شاخ، مخلوق کی ایک الگ نوع (Species) ہے
پھولتی۔ پھلتی۔ اپنی اپنی سمت میں نشو و ارتقاء کی منازل طے کرتی جا رہی ہے۔ ان تمام شاخوں میں سب
رلبند۔ انسان کی شاخِ زندگی ہے جو اس نفس واحدہ کے ننھے سے بیج سے مختلف مراحل طے کرتی۔
بدرجہ۔ قدم بقدم اس بلندی تک آ پہنچی ہے۔

مَا لَکُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰہِ وَقَارًا ۝ وَقَدْ خَلَقَکُمْ اَطْوَارًا ۝ ..... وَاللّٰہُ اَنْۢبَتَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ﴿۱۷-۱۳/۷۱﴾

ا ہو گیا ہے کہ تم اللہ سے وقار کے آرزو مند نہیں ہوتے! اور یقیناً اس نے تمہیں مختلف مراحل سے گذار کر پیدا کیا ہے۔ اللہ نے تمہیں

قرآن کریم کا معجزانہ انداز بیان ملاحظہ فرمائیے! سلسلۂ ارتقاء کی طرف اشارہ کر کے وقار و تمکن کی آرزوؤں کو
ابا گیا۔ وقار اسے ہی نصیب ہوتا ہے جو اپنے قدم جما کر آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا کرے۔

زمین سے (درخت کی طرح) اگایا ہے۔

درجہ بدرجہ۔ طبقاً طبقاً یہاں تک پہنچا دیا۔ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ [۸۴] (تم یقیناً ایک حالت سے دوسری میں تبدیل (سوار) ہوتے جاؤ گے)۔ اس خوردبینی نفسِ واحدہ سے سلسلۂ تخلیق انسانی آگے بڑھا اس نشأۃ اول کے بعد وہ نفسِ واحدہ مختلف منازل میں ٹھہرتا ہوا آگے بڑھتا گیا حتیٰکہ وہ اس مستقل مکان میں آپہنچا جو بشریت کا پیکر ہے مستقل اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ حیاتِ ارضی (یعنی ہماری موجودہ زندگی) کی آخری قیامگاہ ہے۔ ورنہ حیات تو ایک جوئے رواں ہے جسے ابھی اور آگے بڑھنا ہے۔

وهو الذی انشاکم من نفس واحدۃ فمستقر ومستودع ۔ قد فصلنا الآیات لقوم یفقھون ○ [۹۸]

وہی ہے جس نے تمہیں نفسِ واحدہ سے نشوونما دی ۔ پھر تمہارے لئے قرار پانے کی جگہ (مستقر) اور سپردگی کا مقام (مستودع) ہے بلاشبہ ہم نے اپنی آیات سمجھ بوجھ رکھنے والوں کے لئے تفصیل کے ساتھ بیان کر دئے ہیں۔

غور فرمائیے۔ قرآن کریم اس آخری جائے قرار کو بھی صرف امانت گاہ (مستودع) قرار دیتا ہے۔ یعنی وہ پیکر جس میں حیات بطور امانت کے رکھی گئی ہے۔ جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے۔ اس انتقال مکانی۔ یعنی ایک مکان استقرار (ٹھہرنے کی جگہ) سے دوسری منزل تک پہنچنے میں قریباً قرن (الف سنۃ) گذر گئے۔ اور یوں ابتدائی مرحلہ (Life Cells) کے بعد وہ مقام آ گیا جہاں تخلیق کا سلسلہ بذریعۂ تناسل شروع ہوا

ثم جعل نسلہ من سللۃ من ماء مھین [۲۳]

پھر اس کی (انسان کی) نسل کو حقیر پانی کے خلاصہ سے بنایا۔

یعنی ان تمام سابقہ طبقات سے گذر کر (ثم) ہزار ہا سال کی تشکیل و تدبیر کے بعد۔ اس کا سلسلہ ایک حقیر پانی کے نچوڑ سے جاری رکھا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں نر اور مادہ کا امتیاز محسوس طور پر ہمارے سامنے آ گیا۔

واللہ خلقکم من تراب ثم من نطفۃ ثم جعلکم ازواجاً۔ [۳۵]

اور اللہ نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نطفہ سے۔ پھر تمہیں جوڑے بنا دیا۔

یعنی اس مقام پر خلیاتِ حیات (Life Cells) میں جنسی تخلیق (Sexual Reproduction) کا جوہر نمایاں ہو گیا۔ یہ جرثومے (Germ Cells or Gametes) دو حصوں میں

تقسیم ہو گئے۔ ایک (Ovum) یعنی مادہ کا خلیہ اور دوسرا (Spermatozoon) نر کا خلیہ (ثم جعلکم ازواجاً) ۔ اس مقام (Stage) میں جو مخلوق پیدا ہوئی ان میں رینگنے والے اور پاؤں کے بل چلنے والے حیوانات سب شامل ہیں۔

واللہ خلق کل دابۃ من ماءٍ فمنھم من یمشی علی بطنہ ومنھم من یمشی علی رجلین
ومنھم من یمشی علی اربع ۲۴/۴۵

اللہ نے ہر جاندار حیوان کو پانی سے پیدا کیا۔ ان میں سے وہ ہے جو اپنے پیٹ کے بل چلتا ہے اور ان میں وہ بھی ہے جو دو پاؤں پر چلتا ہے اور ان میں وہ بھی ہے جو چار پاؤں پر چلتا ہے۔

صرف رینگنے اور پاؤں پر چلنے والے ہی نہیں بلکہ پرندے بھی یعنی وہ تمام مخلوق جس کا سلسلۂ تخلیق بذریعہ تناسل آگے بڑھتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ زندگی کی اس شاخ سے بہت سی چھوٹی چھوٹی شاخیں ادھر ادھر پھوٹیں۔ اس لئے یہ مختلف اقسام کی مخلوق دراصل ایک ہی نوع کی مختلف شکلیں ہیں اس لئے فرمایا۔

وما من دابۃٍ فی الارض ولا طٰئرٍ یطیر بجناحیہ الا امم امثالکم
ما فرطنا فی الکتٰب من شیءٍ ثم الیٰ ربھم یحشرون ۝ ۶/۳۸

اور زمین میں چلنے والا کوئی حیوان اور ہوا میں پروں سے اڑنے والا کوئی پرندا ایسا نہیں جو تمہاری ہی طرح گروہ (امت) نہ ہو۔ اور ہم نے نوشتہ (الکتاب) میں کوئی بھی بات فروگذاشت نہیں کی پھر (سب) اپنے رب کے حضور جمع کئے جائیں گے۔

اس نفسِ واحدہ نے اس جائے قرار میں بھی قرنہا قرن گذارے اور ان تمام مختلف شاخوں میں سے ایک شاخ اوپر کو ابھری یہ پیکرِ انسانی کی شاخ تھی ثم سواہ ونفخ فیہ من روحہ ۳۲/۹ (پھر اسے درست کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی) یعنی اس "شاخ" کو ہر طرح سے درست کیا۔ اس میں مناسب صلاحیت واستعداد پیدا کی۔ اسے حشو وزوائد سے پاک کیا۔ سنوارا اور آگے بڑھایا۔ جب اس میں یہ صلاحیتیں پیدا ہو گئیں تو اسے درجۂ حیوانیت سے آگے بڑھا کر اس میں صفاتِ الٰہیہ کا شمہ ڈالا۔ اور اب وہ دیکھنے سننے اور سمجھنے سوچنے والا انسان بن گیا وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ قلیلاً ما تشکرون ۳۲/۹ (اور اس نے تمہارے لئے سمع وبصر اور قلب بنایا۔ لیکن تھوڑے ہیں جو شکر گذار ہیں) یہ ہے وہ انسان جو زمین (مٹی) سے پیدا ہوا اور زمین پر بسایا گیا۔

ھو انشاکم من الارض واستعمرکم فیھا... ۱۱/۶۱

وہی ہے جس نے تمہیں زمین (مٹی) سے پیدا کیا اور پھر اسی میں تمہیں بسا دیا۔

ان حقائق پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ کیا قرآن کریم کی تعلیم علم وبصیرت اور سائنس کے انکشافات کے خلاف (معاذ اللہ) توہم پرستی اور افسانہ طرازی پر مبنی ہے! حقیقت یہ ہے کہ (جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے) سائنس کے نظریات جب کسی یقینی درجہ پر پہنچ جائیں گے تو ہو نہیں سکتا کہ وہ ان اشارات کے خلاف ہوں جو قرآن کریم میں اس باب میں ضمنی طور پر آ گئے ہیں۔ اس کے بعد اس امر کا بھی اندازہ فرمائیے کہ جس صاحب علم وبصیرت محقق کے سامنے قرآن جیسی روشنی ہو اسے اپنی تحقیقات کے میدان میں کس قدر آسانیاں ہو سکتی ہیں! یورپ کا محقق اگر وادی تحقیق میں... قدم رکھتا ہے تو اسے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے اس لئے اسے محض اپنے قیاس کی مدد سے راستہ تلاش کرنا پڑتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ برسوں ایک راہ پر چلتا رہے اور بعد میں جا کر معلوم ہو کہ قدم غلط اٹھ رہے تھے اس طرح اس کی تمام محنت رائگاں اور سعی وکاوش برباد چلی جائے گی۔ اس کے برعکس جب ایک حکیم مومن اس وادی میں آئے گا تو قرآن کریم اس کے سامنے منزل بھی نمایاں کر رہا ہوگا اور نشانِ راہ بھی متمیز۔ اس لئے کہ اسے اپنی قیاس آرائیوں سے کام نہیں لینا پڑے گا بلکہ وہ پورے حتم ویقین کے ساتھ جادہ پیما ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان حکماء[۱] نے جس زمانے میں اشیائے فطرت کی تحقیق وتدقیق کی طرف توجہ کی تو یورپ جن منازل کو باپں ہمہ اسباب وذرائع۔ کہیں صدیوں کی محنت شاقہ سے طے کر سکا ہے۔ انھوں نے بڑی آسانی سے قلیل ترین عرصہ میں ان مراحل کو عبور کر لیا۔ لیکن جب مسلمانوں کی نگاہوں سے قرآن اوجھل ہو گیا تو تسخیر فطرت (علم الاشیاء) جیسا اہم شعبہ جس کی بناء پر انسان مسجودِ ملائک

---

[۱] سائنس کے میدان میں مسلمان حکماء کے کارنامے ایک جداگانہ موضوع ہے۔ اسکے لئے میرا مضمون "سائنس اور اسلام" مطبوعہ طلوع اسلام بابت مارچ ۱۹۳۸ء ملاحظہ فرمائیے میں نے اپنے سابقہ مضمون "نجات" میں مسئلہ ارتقاء کے متعلق مسلمان حکماء کا بھی ذکر کیا ہے مزید تفصیلات مغربی مصنفین کی کتابوں سے بھی مل سکتی ہیں مثلاً (norganic Chemistry ...lmyard) کا مقدمہ دیکھئے اسی مصنف نے مسلمان اور سائنس کے عنوان پر ایک مستقل کتاب بھی لکھی ہے۔ نیز آرنلڈ کی مشہور کتاب (Legacy of Islam) بھی اس باب میں مفید ہے۔

قرار پایا تھا۔ "دنیاداری" کافروں کے حصہ کی چیز سمجھ لی گئی جس کا نتیجہ آج ساری دنیا کے سامنے ہے۔

لیکن اس مقام پر ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کو سامنے لے آیئے جس کا ذکر ابتدا میں کیا جا چکا ہے یعنی قرآن کریم تاریخ وجغرافیہ۔طبیعیات وکیمیا۔حیاتیات وطبقات الارض کی کتاب نہیں وہ تو ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے جس سے انسانیت نشو وارتقار کے مراحل طے کرکے اس مقام پر پہنچ جائے جو اس سفر زندگی کا مقصود ہے۔ اس میں اگر ان علوم وفنون کے متعلق اشارات پائے جاتے ہیں تو ان سے مقصود اس منزل کی طرف راہ نمائی اور اس نصب العین کی طرف توجہات کا مرتکز کرنا ہے۔ مثلاً اسی نظریۂ ارتقار کو لیجئے۔ یورپ کے محققین نے جب یہ دریافت کرلیا کہ خاک کا ذرہ کس طرح اپنی ارتقائی منازل طے کرکے انسان کے مقام تک آپہنچا ہے تو انھوں نے اس باب (Chapter) کو ختم کردیا اور سمجھ لیا کہ انسان کا موجودہ پیکر اس سلسلۂ دراز کی آخری کڑی ہے اس کے بعد کچھ نہیں۔ لیکن قرآن کریم نے اس سلسلۂ دراز کی مختلف کڑیوں کی طرف توجہ دلانے کے بعد فوراً نگہ تجسس کو اس طرف پھیر دیا کہ انسان کی موجودہ زندگی اس سلسلہ کی آخری کڑی نہیں بلکہ اسے ابھی قانونِ ارتقار کے مطابق آگے بڑھکر کسی اور منزل تک پہنچنا ہے۔ اس کی موجودہ منزل سے اگلی منزل کا نام حیات اخروی ہے۔

وہ قانونِ ارتقار کو بیان ہی اس انداز سے کرتا ہے کہ حیاتِ آخروی یا نشأۃِ ثانیہ ایک منطقی نتیجہ (Logical Inference) کی حیثیت سے خود بخود سامنے آجائے۔ غور فرمایئے کہ اس منطقی نتیجہ تک بے اختیار پہنچنے کے لئے قرآن کریم نے کس اسلوب سے صغریٰ وکبریٰ قائم کیا ہے۔ اس کی تعلیم ہے کہ

(۱) کائنات کی کوئی شے بلا مقصد پیدا نہیں کی گئی کہ کسی حکیم کا کوئی فعل عبث نہیں ہوتا۔

(۲) ہر شے کو اپنی ابتدار سے انتہا (منزل مقصود) تک پہنچنے کے لئے مختلف مدارج طے کرنے ہوتے ہیں۔

(۳) یہ تدریجی مراحل ایک محکم تدبیر (Well-Thought-of-Scheme) کے مطابق طے پاتے ہیں۔

(۴) قانون ارتقاءِ حیات (Law of Organic Evolution) کے ماتحت۔ اس قسم کی ایک اسکیم اپنے تدریجی مراحل طے کرتی ہوئی مقام بشریت تک پہنچی ہے۔

(۵) اس اسکیم کی منزلِ مقصود یہی مقام نہیں بلکہ اسے ابھی آگے بڑھنا ہے۔

(۶) اس اگلی منزل کا نام حیاتِ اخروی ہے۔
اب دیکھئے کہ قرآن کریم کس طرح ان تدریجی مراحل کے "کرہ کے بعد ذہن انسان کو نشاۃ ثانیہ کی طرف منتقل کرتا ہے۔ فرمایا۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ۝	اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا (یعنی زندگی کی ابتدا اس طرح ہوئی)
ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۝	پھر ہم نے اسے "نطفہ" بنایا۔ ایک ٹھہر جانے اور جماؤ پانے کی جگہ میں۔
ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً۔	پھر نطفہ کو ہم نے "علقہ" بنایا (جونک کی شکل)
فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً۔	پھر "علقہ" کو ایک گوشت کا ٹکڑا کر دیا۔
فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا۔	پھر اس "مضغہ" کو ہڈیوں کا ڈھانچا بنایا
فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا۔	پھر ڈھانچے پر گوشت کی تہ چڑھا دی
ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ	پھر (دیکھو) اسے کس طرح ایک دوسری ہی طرح کی مخلوق بنا کر نمودار کر دیا۔
فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ۝	تو کیا ہی برکتوں والی ہستی ہے اللہ کی، پیدا کرنے والوں میں سب سے بہتر پیدا کرنے والا
ثُمَّ إِنَّكُم بَعْدَ ذَٰلِكَ لَمَيِّتُونَ ۝	پھر دیکھو! ان مراحل کے بعد (تم سب کو ضرور مرنا ہے۔
ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُونَ ۝ [۲۳/۱۰۶-۱۱]	پھر مرنے کے بعد ایسا ہونا ہے کہ قیامت کے دن اٹھائے جاؤ

سطح بین نگاہوں کو انسان کی نشاۃ ثانیہ کے خلاف یہ اعتراض نظر آتا تھا کہ جب اس عناصری ترکیب کا شیرازہ بکھر جائے گا تو اس کے بعد ایک ترتیب جدید کیسے ہو سکے گی! اور صرف "سطح بین" نگاہوں پر ہی کیا موقوف ہے۔ آج یورپ کے حکما جنہیں دنیا علم و بصیرت کی انتہائی بلندیوں پر خیال کرتی ہے۔ اسی جہالت میں گرفتار ہے اس لئے کہ جس طرح وہ پہلے راستوں میں محض اپنے ذہن کی قیاس آرائیوں کی مدد سے چلے تھے اور قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے تھے۔ وہ اس منزل سے آگے بھی اپنے تصورات کی ہی روشنی میں بڑھنا چاہتے ہیں اور ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ جس طرح ایک مدت کی صحرا نوردیوں کے بعد یہ لوگ حقیقت کے ایک گوشہ تک

پہنچے ہیں۔ بالآخر انھیں نشاۃ ثانیہ کے متعلق بھی وہیں آنا پڑے گا جہاں قرآن دعوت دیتا ہے۔ کہ قرآن کی دعوت جہل اور توہم پرستی کی دعوت نہیں۔ علم و بصیرت کی دعوت ہے حتم ویقین کی دعوت ہے وہ اس مشکل کو ایک نقطہ میں حل کرکے رکھدیتا ہے۔

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ ۳۱/۲۸

تمہاری (موجودہ) پیدائش اور نشاۃ (ثانیہ) ایک نفس واحدہ کی مثل ہے۔

جو خدا زندگی کے اولیں جرثومہ (Life Cells) سے موجودہ ہیئت کا انسان بنا سکتا ہے اس کے لئے اسے اس کے بعد ایک دوسری زندگی عطا کرنے میں کیا مشکل ہوسکتی ہے۔

لیکن قرآن کریم صرف اتنا بتا دینے پر ہی اکتفا نہیں کرتا کہ اس زندگی کے بعد آیندہ زندگی بھی ہے۔ بلکہ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے۔ قرآن ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جس کا مقصد انسان کو یہ بتانا ہے کہ وہ کس طرح موجودہ دور کی ارتقائی منازل طے کرکے آگے بڑھ سکتا ہے۔ سارا قرآن اسی اصولی مقصد کی تشریح ہے۔ جس کے لئے وہ ایک مکمل نظام عطا کرتا ہے وہ اقوام سابقہ کے عروج و زوال کی داستانیں پیش کرتا ہے تو اس لئے نہیں کہ وہ ایک تاریخ کی کتاب ہے۔ بلکہ اس لئے کہ ان کے اعمال کے انجام و عواقب سے قانونِ فنا و بقا پر شہادت لائے۔ اس نے کھلے کھلے الفاظ میں بتادیا کہ

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۶۷/۲

اس نے موت اور حیات کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش ہوسکے کہ تم میں سے کون اچھے کام کرتا ہے

یعنی فنا و بقا (موت و حیات) کا قانون اس لئے متعین کیا گیا ہے کہ وہ دیکھ لے کہ تم میں سے کون ایسے کام کرتا ہے جو اس قانون کے مطابق زندہ رہ سکے اور کون ایسا ہے جو ہلاک ہو جائے۔ وہ برملا کہتا ہے کہ یہ واضح اور غیر مبہم قانون اس لئے کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے تاکہ

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ۸/۴۲

جسے ہلاک ہونا ہے وہ بھی کھلی ہوئی دلیل کے ساتھ ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی کھلی ہوئی دلیل کے ساتھ زندہ رہے۔[1]

---

[1] ان اشارات کی تفصیل "معارف القرآن" کی آیندہ جلدوں میں اپنے اپنے مقامات پر ملے گی۔ انشاء اللہ

وہ قانونِ ارتقاء کے اس بنیادی اصول کو مختلف گوشوں اور متنوع پہلوؤں سے دل نشین کراتا ہے کہ صرف وہ نوع باقی رہ سکتی ہے جس میں باقی رہنے کی صلاحیت ہو۔ آگے وہی بڑھ سکتی ہے جو اپنے اندر آگے بڑھنے کی استعداد پیدا کر لے اس طرح وہ دیگر انواع سے خود انسانوں پر استشہاد کرتا ہے۔ ان سے کہتا ہے کہ ارتقاء کے اس عظیم الشان درخت کو دیکھو اور غور کرو کہ کتنی شاخیں تھیں جو سوکھ سوکھ کر گر گئیں۔ کتنے پھول تھے جو مرجھا مرجھا کر زمین پر آ لئے اور راستہ چلنے والوں کے پاؤں کے نیچے آ کر مسلے گئے۔ اس کے برعکس کتنی شاخیں ہیں جو سرسبز و شاداب ہوئیں۔ کیسے کیسے شگفتہ و بشاش پھول لائیں اور کیسے کیسے نفیس و لطیف پھل دئے۔ وہ کہتا ہے کہ فطرت کے اس قانون پر نگاہ ڈالو اور پھر سوچو کہ اقوام سابقہ اور ملل گذشتہ کا کیا حشر ہوا۔ اس کا ارشاد ہے کہ مختلف انواع کی طرح قوموں کی موت و حیات کا بھی یہی قانون ہے۔ جو قوم زندگی کی اہل نہیں رہتی۔ فنا ہو جاتی ہے۔ اسے کوئی رعایت نہیں دیجاتی۔ اس فیصلہ (یعنی ان کے اعمال کے نتائج کے وقتِ معینہ پر برآمد ہونے) میں ذرہ برابر بھی تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿٣٤﴾

اور (دیکھو) ہر امت کے لئے ایک معینہ وقت ہے جب کسی امت کا وہ وقت آ گیا تو پھر نہ تو ایک گھڑی پیچھے رہ سکتی ہے نہ ایک گھڑی آگے۔

اس اصولی نکتہ کو بیان فرما دینے کے بعد اگلی آیت میں یہ بتا دیا کہ زندہ اور باقی رہنے کے لئے کیا قانون مقرر ہے فرمایا۔

يَا بَنِي آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي ۙ فَمَنِ اتَّقَىٰ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٣٥﴾

اے اولادِ آدم (نوعِ انسانی)! جب کبھی ایسا ہوا کہ میرے رسول تم میں پیدا ہوں اور میری آیات (قانون) تمہیں پڑھ کر سنائیں تو جو کوئی (اس قانون کے مطابق) اپنے آپ کو اللہ کی حفاظت میں رکھے گا (تقویٰ) اور اپنے میں (باقی رہنے کی) صلاحیت پیدا کرے گا (اصلح) تو اس کے لئے (فنا ہونے کا) کسی قسم کا اندیشہ ہوگا نہ غمگینی۔

یہ تو وہ ہیں جو باقی رہیں گے۔ آگے بڑھیں گے جنھیں ہلاکت و بربادی کا کوئی اندیشہ نہ ہوگا۔ برعکس ان کے۔

وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٣٦﴾

لیکن جو لوگ ہماری آیات (قانون) کی تکذیب کریں گے اور ان (آیات۔ قانون) سے سرکشی اختیار کرینگے
تو وہ اہل جہنم ہونگے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

غور فرمائیے! پہلی آیت میں قوموں کی موت وحیات کا ایک اصولی قانون بیان فرمایا۔ اس کے بعد اس کی وضاحت فرمادی کہ ہلاکت سے امون اور بربادی سے بے خوف رہنے کا کیا طریقہ ہے اور وہ کونسا نظام ہے جس پر چل کر انسان امن وسلامتی کی جنت میں پہنچ سکتا ہے۔ اس وقت اس نظام کی تشریح کا موقعہ نہیں۔ یہاں تو صرف اتنا دیکھئے کہ قرآن کریم کی رو سے اس نظام کا اصل الاصول یہ ہے کہ اس ضابطہ کو نصب العین حیات بنایا جائے جو منجانب اللہ۔ اس کے انبیاء علیہم کی وساطت سے انسانوں کو ملا ہے۔ اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنے کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان میں وہ صلاحیت پیدا ہو جائیگی جس سے وہ فنا وبرباد کر دینے والی مخالف قوتوں کا مردانہ وار مقابلہ کر سکے گا۔ اور یوں انسان ہلاکت نفس سے بچنے کے لئے اپنے آپ کو اللہ کی حفاظت میں لے آئے گا (اصلح وتقویٰ) جب یہ صورت پیدا ہو جائے گی تو پھر انسان ہلاکت سے محفوظ ومصئون ہو جائیگا پھر اسے کسی قسم کا خوف وحزن نہیں رہے گا (لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ) اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو خدا کا قانون استخلاف واستبدال (Law of Succession and Substitution) اپنا اٹل فیصلہ صادر کردیگا اور اس قوم کی جگہ دوسری قوم آجائے گی۔

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۚ إِن يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِن بَعْدِكُم مَّا يَشَاءُ كَمَا أَنشَأَكُم مِّن ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ آخَرِينَ ﴿۱۳۴﴾ (۶ : ۱۳۴)

اور تمہارا پروردگار بے نیاز اور رحمت والا ہے اگر وہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق) چاہے تو تمہیں ہٹادے اور تمہارے بعد جس کو (اپنے قانونِ مشیت کے ماتحت) چاہے تمہارا جانشین بنادے جس طرح ایک دوسری قوم کی نسل سے تمہیں اٹھا کھڑا کیا۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے۔ قانونِ ارتقاء کی اصل یہ ہے کہ وہی نوع باقی رہ سکتی اور آگے بڑھ سکتی ہے جس میں حفظِ نفس اور بقائے نوع کی صلاحیت واستعداد موجود ہو۔ جو ان تمام مخالف قوتوں کا مقابلہ کر سکے جو اسے مٹانے پر آمادہ ہوں۔ جو ناسازگار ماحول، ناسامد فضا اور ہلاکت آفریں اسباب کی مدافعت کا سامان اپنے پاس رکھتی ہو۔ دیگر انواع کی طرح، نوعِ انسانی بھی اسی قانون کے تابع ہے۔ وہ اقوام وملل جنھوں نے سامانِ مدافعت اور قوتِ مدافعت کو کھودیا۔ ہلاک ہوگئیں جنھوں نے اس قوت کو قائم رکھا ہلاکت سے محفوظ رہیں قانونِ ارتقاء کا آشنا

حصہ انسان کی طبعی زندگی ((Physical Life)) سے متعلق ہے اور اس اعتبار سے انسان اور اس کی مکڑی (دیگر حیوانات) میں کچھ فرق نہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ انسان دیگر حیوانات سے ایک قدم آگے ہے اور یہی وہ مقام ہے جو اسے اُفقِ حیوانیت سے بلند کر کے درجہ انسانیت میں پہنچاتا ہے وہ مقام جہاں قرآن کریم نَفَخْنَا فِيهِ مِن رُوحِنَا (ہم نے اس میں اپنی روح پھونک دی) سے اسے دیگر حیوانات سے ممتاز کر دیتا ہے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جو نفسِ حیوانی سے یقیناً جداگانہ ہے۔ اسے آپ نفسِ انسانی کہئے۔ ((Mind)) کہئے۔ روح کہئے۔ خودی سے تعبیر کیجئے۔ بہر حال نفسِ حیوانی یا محض طبعی زندگی سے کچھ اور کہنا پڑے گا۔ لہذا وہ قانونِ ارتقاء جو انسان سے پیشتر تمام انواع میں محض طبعی زندگی (Physical Life) سے متعلق تھا۔ اب طبعی زندگی کے علاوہ نفسِ انسانی کو بھی اپنے احاطۂ اثر و نفوذ میں لے آیا یعنی جس طرح انسان کو اپنی طبعی زندگی کے حفظ و بقا کے لئے تمام مخالف قوتوں سے مقابلہ کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرنی ضروری ہے۔ اسی طرح اپنے نفس کی حفاظت اور نشو و ارتقاء کے لئے بھی تمام متصادم و متحارب قوتوں کے خلاف اپنے اندر قوت پیدا کرنا لازمی ہے۔ اس کا نام "استحکامِ خودی" ہے اگر انسان کی تگ و دو کا مقصود محض طبعی زندگی کا استحکام ہوتا تو ظاہر ہے کہ فرعون کے استہلاک کے لئے کسی موسےٰ (علیہ السلام) کے بھیجنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ مادی زندگی کی حفظ و بقا کی ضرورت نہیں اس لئے اس میں قوت و شدت پیدا کرنا بے معنی ہے فوج کی حفاظت کے لئے قلعہ کی دیواروں کا آہنی و سنگین ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس لئے انسان کے لئے ضروری ہے کہ نفسِ انسانی اور پیکرِ انسانی دونوں میں استحکام پیدا کرے تاکہ قانونِ ارتقاء کی رُو سے یہ ہلاک نہ ہو جائیں لہذا جس طرح محض مادی زندگی کی نشو و ارتقاء ہی منتہائے نگاہ نہیں اسی طرح کوئی ایسا قدم جس میں مادی زندگی کے استحکام سے تغافل برتا جائے۔ وجۂ استحکامِ انسانیت نہیں ہو سکتا۔ نفسِ انسانی سے چشم پوشی کر کے محض طبعی زندگی کو مقصودِ نظر سمجھ لینا کفر (یعنی غیر فطری زندگی ہے)

وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ﴿۱۲﴾

اور جو لوگ کفر (کی زندگی بسر) کرتے ہیں۔ وہ (دنیاوی متاع سے) اس طرح متمتع ہوتے اور کھاتے (پیتے) ہیں جس طرح حیوان (اسو) ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

یعنی ان کا مقصدِ زندگی محض طبعی حیات کی پرورش اور حفظ و بقا ہوتا ہے۔ اس سے آگے کچھ نہیں جو قوم تحفظ نفس یعنی ارتقائے انسانیت سے یوں غفلت برت لے۔ بھلا وہ ہلاکت و بربادی سے کیسے بچ سکتی ہے اس لئے اس

سے اگلی آیت میں فرمایا۔

وَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ هِيَ أَشَدُّ قُوَّةً مِّن قَرْيَتِكَ الَّتِي أَخْرَجَتْكَ أَهْلَكْنَاهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ۝ ۴۷/۱۳

اور کتنی ہی ایسی بستیاں تھیں (جن کے رہنے والے) تمہاری بستی والوں سے جنھوں نے تمہیں گھر سے نکال دیا کہیں زیادہ سخت قوت رکھتے تھے ہم نے انھیں ہلاک کر دیا اور انھیں کوئی مددگار نہ مل سکا۔

یہ کیوں! اس لئے کہ

أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ كَمَن زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُم ۝ ۴۷/۱۴

کیا وہ جو اپنے رب کی طرف سے واضح دلائل پر (قائم) ہو اس کی مانند ہو سکتا ہے جس کے برے اعمال اسکی نگاہوں میں مزین ہو گئے اور ان لوگوں نے اپنی خواہشات کی ہی اتباع (شروع) کر دی

یعنی جس شخص نے اللہ کے ضابطۂ حیات کے بجائے اپنے خیالات و نظریات کو شاہراہِ عمل بنالیا۔ وہ کبھی ہلاکت سے نہیں بچ سکتا اس لئے کہ وہ قانونِ ارتقاء جو انسانیت کے تحفظ اور نشوو عروج کے لئے ضابطہ ہے صرف خدا کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت ہے۔ انسانی خواہشات اور قیاسات اس ضابطہ کی جگہ نہیں لے سکتے' یہ تو تھی محض طبیعی زندگی کی حفاظت کو منتہائے نگاہ بنانے والوں کی کیفیت۔ اس کے برعکس طبیعی زندگی کے لوازم سے چشم پوشی کر کے محض "رہبانیت" کی ترقی و تصاعد کے لئے بزعم خویش سعی و کاوش میں زاویۂ نشینی اور سر زیری اختیار کر لینا بھی قانونِ ارتقاء کی رو سے غلط اندیشی ہے جس کا نتیجہ ہلاکت ہے۔ قرآن کریم نے رہبانیت کے متعلق واضح کر دیا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے متعین فرمودہ اندازِ زندگی نہیں بلکہ انسانوں کا خود ساختہ نظریۂ حیات ہے رہبانیت سے مقصود آبادیوں کو چھوڑ کر جنگلوں میں چلے جانا نہیں۔ بلکہ رہبانیت اس زاویۂ نگاہ اور روش زندگی کا نام ہے جس میں مادی دنیا سے تنفر پیدا کر لیا جائے یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جہاں نفسِ انسانی کے تحفظ و بقا اور عروج وارتقاء کے لئے تاکید فرمائی ہے اس کے ساتھ ہی طبیعی زندگی کے استحکام کے لئے مادی قوتوں کے حصول و استبقاء کو بھی جزو لاینفک قرار دیا ہے اور اس طرح قانونِ ارتقاء کے ماتحت ایک ایسا مکمل ضابطۂ حیات عطا فرمایا ہے جس میں انسان اپنی موجودہ منزل میں بھی اپنے آپ کو قائم رکھ سکے اور اس کے بعد کی منزل کی طرف بڑھنے کی صلاحیت بھی پیدا کرے مغرب نے قانونِ ارتقاء کو محض طبیعی زندگی تک محدود کر دیا۔ جس کا نتیجہ۔ جیسا کہ مذکورہ صدر آیۂ جلیلہ میں بتایا گیا ہے جہنم کے سوا اور کچھ نہ نکلا (والنار مثوی لھم) حالانکہ اسے خود اقرار ہے کہ "طبیعی ارتقاء میں نفسِ انسانی کا بہت بڑا حصہ ہے (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا) دوسری طرف عجمیت زدہ مسلمان نے قرآن کریم کے بجائے

انسانی قیاس آرائیوں کو"زین" قرار دیکر طبیعی (مادی) زندگی سے مجرمانہ تغافل برتا جس کا فطری نتیجہ ضعف و ناتوانی تھا طبیعی (مادی) زندگی میں یوں موت واقعہ ہوگئی - اور چونکہ بقائے نفس کا طریق بھی یکسر غیر فطری تھا اس لئے اس شعبہ میں بھی فریب نفس کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا خسر الدنیا و الآخرۃ وذالک الخسران المبین[1]

طبیعی زندگی کے تحفظ و بقا کا راز تسخیر فطرت میں مضمر ہے جو قرآن کریم کے ایک ایک صفحہ سے ظاہر ہے - اور نشو و ارتقائے نفس انسانی ان آئین و ضوابط کی پابندی سے مشروط ہے جو قوانین الٰہیہ کہلاتے ہیں اور یہ بھی قرآن ہی کے اندر ہیں - یورپ نے شق اول (تسخیر فطرت) کے راز کو پا لیا لیکن شق ثانی سے کفر برتا حالانکہ وہاں کے محققین کو خود اعتراف ہے کہ سلسلہ ارتقاء میں مادیات کے علاوہ اخلاقیات کو بھی کم دخل نہیں - چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ارتقاء (Evolution) کے عنوان کا مقالہ نگار اپنے مضمون کو ان الفاظ پر ختم کرتا ہے -

"حسب وطن مذہب - آرٹ سائنس اور لٹریچر کا بھی (میزان) بقا میں وزن ہے اور یہ سلسلہ ارتقاء میں بڑا مفید کام کرتے ہیں (اس سلسلہ میں) اخلاق کوئی غیر متعلق خارجی قوت کی حیثیت نہیں رکھتا جو ایک مستبد اور بیگانہ اخلاق آفاقی نظام کے خلاف برسر پیکار ہے بلکہ یہ (اخلاق) خود ارتقاء کی تخلیق ہے اور سلسلہ ارتقاء کے تدریجی تغیرات کو صحیح سانچے میں ڈھالنے کے لئے ایک اہم قوت - ہمیں امید بلکہ یقین ہے کہ وہ تہذیب جو عدل حریت - آئین و ضبط اور مستحکم اخلاقیات پر مبنی ہیں آخر الامر سب سے زیادہ کامیاب اور دیرپا ثابت ہونگے -

اے کاش یورپ کے سامنے قرآن ہوتا تو وہ دیکھتا کہ وہ کونسی تہذیب ہے جو عدل، حریت نظم و ضبط اور مستحکم اخلاقیات پر مبنی ہے! اور اگر وہ قرآن کریم کی رو سے ان الفاظ کا صحیح مفہوم سمجھ لیتا تو آج اس طرح برباد نہ ہوتا کہ اس کی بربادی بھی قانون ارتقاء ہی کے ماتحت ہو رہی ہے - انسان کے تحفظ کے لئے اس کے نفس خودی کا تحفظ ضروری ہے اور اس کا تحفظ اسی تہذیب (روش زندگی) سے ہو سکتا ہے جو عدل حریت

---

[1] یاد رکھئے کہ اقوام کی موت یہ نہیں ہوتی کہ ان میں کوئی سانس لینے والا باقی نہیں رہتا - سانس بند ہو جانے سے افراد کی طبیعی موت واقع ہوتی ہے - اقوام کی موت ان کی ...... خودی (انسانیت) کی موت ہے اور یہ وہ موت ہے جو ہم پر مدت سے مسلط ہو چکی ہے -

نظم و ضبط اور محکم اخلاقیات پر مبنی ہو۔ صرف مادی اسباب و لوازم سے نہیں ہو سکتا وَکَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَۃٍ ھِیَ اَشَدُّ قُوَّۃً مِّنْ قَرْیَتِکَ .... اَھْلَکْنٰھُمْ کتنی بستیاں ایسی تھیں جو مادی قوت میں تم سے کہیں زیادہ سخت تھیں۔ اللہ کے قانونِ فنا و بقا نے انھیں ہلاک کر دیا تو تم اس کی گرفت سے کیسے بچ سکتے ہو! اگر اس ہولناک قیامت صغریٰ کے بعد جس کا مظاہرہ آج مغرب و مشرق میں ہو رہا ہے۔ انسان نے قانون ارتقاء کی اس شق کو پا لیا کہ انسانیت کا تحفظ قوانین حیوانیت سے نہیں بلکہ "قوانین انسانیت" ہی سے ہو سکتا ہے تو پھر وہ نیا نظام (New Order) قائم ہو سکے گا جسے آج دنیا اس تڑپ اور خلش سے ڈھونڈھ رہی ہے۔ اس وقت دنیا دیکھے گی کہ یہ نظام کوئی نیا نظام نہیں بلکہ وہ پرانا نظام ہے جو آج سے چودہ سو برس پیشتر قانونِ ارتقاءِ انسانیت کی شکل میں قرآن کریم نے انسانوں کو عطا کیا تھا۔ اگر اس قدر تباہی اور بربادی کے بعد بھی انسان نے اس قانون کو پہچان لیا تو انسانیت کے لئے یہ سودا مہنگا نہیں ہوگا کہ

خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!

لمعات

اشاعتِ سابقہ میں ہم نے روزوں کے ذکر میں ضمناً اس حقیقت کو سامنے لانے کی کوشش کی تھی کہ جب تک اعمال کو اُن کے نتائج سے نہیں پرکھا جائے گا مسلمان لاکھ رسوم وظواہر کے پابند رہیں ان کا کوئی عمل نتیجہ خیز نہیں ہو سکے گا۔ ہمیں خوشی ہوئی کہ ہماری یہ آواز صدا بصحرا بن کر نہیں رہ گئی۔ اس نے بہت سے ذہنوں کو سوچنے پہ آمادہ اور بہت سے قلوب کو سمجھنے کے لئے مضطرب بنادیا۔

سمجھنے کے خواہاں حضرات کی طرف سے ایک بات اور پیش کی گئی۔ وہ کہتے ہیں کہ مذہبی اعمال وعبادات سے ثواب حاصل ہوتا ہے اور ثواب کوئی ایسی شئے نہیں جسے محسوس طور پہ ناپا اور تولا جاسکے۔ اس لئے ہمارے اعمال رائگاں نہیں جارہے ہیں۔ ان سے ثواب ملتا ہے جو آخرت کی میزان میں سامنے آجائے گا'

ثواب سے کسے انکار ہے اور کون اس کا منکر ہو سکتا ہے! لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ثواب کسے کہتے ہیں! اگر آپ اس کا مفہوم قرآن کریم سے متعین کرلیں تو پھر جو کچھ ہم کہتے ہیں اور بھی نمایاں طور پہ سامنے آجائے گا۔ اس کا مفہوم متعین کرنے سے پیشتر چند الفاظ تمہیداً عرض کرنے ضروری معلوم ہوتے ہیں۔

جس زمانہ میں کوئی قوم زندہ ہوتی ہے تو اس کی نگاہوں کے سامنے زندگی کا ایک درخشندہ نصب العین۔ اور ان کے قلوب میں اُس نصب العین کے حصول کی تڑپ ہوتی ہے۔ اس نصب العین تک پہنچنے کے لئے مختلف اسباب و ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں اور اس سفر میں اپنی ترقی کا اظہار مختلف الفاظ کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ لیکن جب اس قوم پہ زندگی کی جگہ عملاً موت چھا جاتی ہے۔ اُن کا عروج' زوال میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ قوتیں ضعف میں اور ولولے پژمردگی میں بدل جاتے ہیں تو جس طرح ان کے اعمال کی شکلیں باقی رہ جاتی ہیں اور روح مفقود ہوجاتی ہے اسی طرح اُن کے الفاظ (یعنی اصطلاحات) تو علی حالہ

وجود ہوتے ہیں۔ لیکن اُن کے معانی یکسر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ پھر جس طرح وہ قوم اِن بے روح
اعمال کی ظاہری شکلوں پر مطمئن ہو جاتی ہے اور حقائق کا سامنا کرنے سے جی چُراتی ہے۔ اسی طرح ان اصطلاحات
کو بلا سوچے سمجھے استعمال کرتی رہتی ہے اور ان کے حقیقی معانی کی طرف کبھی توجہ نہیں دیتی۔ وہ جس طرح اعمال کو
ان کے نتائج سے نہیں پرکھتی اسی طرح ان اصطلاحات کو بھی کبھی شرمندۂ معنی نہیں ہونے دیتی۔ ایسی حالت میں
حقیقت کو بے نقاب دیکھنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ ان اصطلاحات میں باتیں نہ کی جائیں بلکہ عام الفاظ میں
مطلب واضح کیا جائے۔ مثلاً جس زمانہ میں مسلمان ایک زندہ قوم تھے۔ یہی نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔ جہاد۔
سحاب ملی کی تڑپتی ہوئی بجلیاں تھیں اور ایمان۔ اعمال۔ عبادات۔ صبر۔ رضا۔ توکل۔ ثواب۔ زندگی کے اپنے
کے مختلف پیمانے۔ لیکن آج کیا حالت ہے؟ نماز۔ روزہ وغیرہ اعمال ہیں بلا نتیجہ۔ اور ایمان۔ عبادت وغیرہ
الفاظ ہیں بلا معانی۔ مثلاً ہم نے کہا کہ اعمال کو قرآنی کے معیار کے مطابق نتائج سے پرکھنا ضروری ہے۔ جب تک
اعمال ایسے نتائج مرتب نہیں کرتے جو قرآن کریم نے متعین کئے اور قرونِ اولیٰ میں محسوس شکل میں ہمارے
سامنے آگئے اُس وقت تک ہمیں کبھی باور نہیں کرنا چاہئے کہ اعمال اپنے حقیقی مفہوم میں ادا ہو رہے ہیں۔
بات بالکل واضح ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کر لینے سے ہمارے جھوٹے اطمینان کی جنت ہم سے
چھن جاتی ہے۔ اس لئے ہمارے نفس نے اپنے لئے ایک اور آڑ تلاش کر لی اور یہ کہکر اپنے آپ کو سمجھا لیا کہ
نہیں! یہ اعمال بلا نتیجہ نہیں رہتے۔ ان سے **ثواب** ملتا ہے! لیکن قرآن کریم کی روشنی میں بھلا ایسی آڑ کی
کہاں گنجائش! وہ جہاں احکام و اعمال کے متعلق واضح طور پر بتاتا ہے کہ ان سے کیا نتائج مرتب ہونے
مقصود ہیں اسی طرح ان اصطلاحات کے متعلق بھی وضاحت کر دیتا ہے کہ ان سے حقیقی مفہوم کیا ہے۔
اب دیکھئے کہ قرآن کریم کی رو سے ثواب کسے کہتے ہیں اور وہ کس طرح سے ملتا ہے۔

سورۂ آل عمران میں ہے

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝ ۳/۱۴۵

اور (دیکھو) کتنے ہی نبی (ایسے گذرے) ہیں جن کے ساتھ ہو کر اللہ والوں کی جماعت نے (خدا کی راہ میں) جنگ کی۔ لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان سختیوں کی وجہ سے جو انھیں اللہ کی راہ میں پیش آئی ہوں وہ بے ہمت ہو گئے ہوں۔ یا (میدان میں جاکر) کمزور پڑ گئے ہوں یا (دشمن سے مرعوب ہو کر) عجز و بے چارگی کا اظہار کر دیا ہو۔ اور اللہ انہی لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو (مشکلات و مصائب میں) ثابت قدم رہتے ہیں۔

یہ ایک عمومی حقیقت بیان فرمادی کہ حق و باطل کے معرکہ میں حق پرستوں کی روشِ زندگی کیا ہوا کرتی ہے۔ ان اللہ کے سپاہیوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ہجومِ مصائب اور کثرتِ مشکلات کے وقت وہ **قطعاً نہیں گھبراتے** نہ ہمت ہارتے ہیں۔ بلکہ

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ٥ ۳/۱۴۶

اور ان کی زبانوں سے اس کے سوا کچھ نہ نکلتا تھا کہ خدایا! ہماری کوتاہیوں کو معاف کر دے اور ہم سے ہمارے کام میں جو زیادتیاں ہوگئی ہوں اُن سے درگزر فرما اور ہمارے قدم جما دے۔ اور منکرین کی قوم پر ہمیں فتحمند کر۔

یہ آن انسانوں کی کیفیت تھی۔ اب ان کے ان اعمال کے بدلے میں اللہ کی طرف سے کیا ملا! فرمایا:

فَآتَاهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ٥ ۳/۱۴۶

پس اللہ نے انھیں (دونوں جہان میں) ثواب (اجر) عطا فرمایا۔ دنیا کا ثواب بھی دیا اور آخرت کا بھی بہتر ثواب دیا۔ اللہ محسنین کو دوست رکھتا ہے۔

یعنی ایمان و اعمال کا لازمی اور فطری نتیجہ یہ ہے کہ دنیا و آخرت دونوں میں ثواب ملے۔ آخرت کے ثواب کی جمالی تفاصیل بھی قرآن کریم میں موجود ہیں۔ لیکن دنیا کا ثواب ایک ایسی چیز ہے جس کی تشریح قرآن کریم نے فرمادی ہے اور اسے ہم اچھی طرح سے سمجھ سکتے اور محسوس کر سکتے ہیں۔ حضرات انبیاء کرام

اور ان کی حق پرست جماعتوں نے کس طرح کفر و باطل کے مقابلہ میں مجاہدانہ سعی و عمل سے کام لیا۔ اس کی تابندہ داستانیں قرآن کریم کے اوراق میں محفوظ ہیں اور ان اعمال کا ثواب کس طرح سے ملا۔ اس کی تفصیل بھی ساتھ ہی ساتھ دے دی گئی ہے تاکہ آنے والوں کو معلوم ہو سکے کہ ثواب سے کیا مفہوم ہے۔ ان تمام واقعات کا تفصیلی تذکرہ تو اس مقام پر مشکل ہے۔ البتہ دو چار مقامات پر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو ثوابِ دنیا کس شکل میں عطا فرمایا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آل کے متعلق فرمایا

فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ۝ ۵۴/۴

یہ واقعہ ہے کہ ہم نے آلِ ابراہیم کو کتاب اور حکمت عنایت فرمائی (اور ان کے ساتھ) عظیم الشان سلطنت بھی عطا فرمائی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے تذکرہ میں فرمایا:-

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِى الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ط

اور اس طرح ہم نے سرزمین (مصر) میں یوسف کو متمکن کر دیا کہ جہاں چاہے اپنے اختیارات کو چلائے۔

حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم کی تو تمام داستان ہی اس ثواب الدنیا کی تشریح و تفسیر ہے۔ ان کی لمبی چوڑی داستان کا خلاصہ یہ تھا کہ

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِىْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ ڏ بِمَا صَبَرُوْا ۭ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ۝ ۱۳۷/۷

اور جس قوم کو (فرعون وغیرہ کے استبداد نے) کمزور بنا دیا تھا ہم نے اسی (کمزور) قوم کو اس بابرکت ملک کے مشارق و مغارب کا وارث بنا دیا۔ اور تیرے پروردگار کا فرمان پسندیدہ (یوں) بنی اسرائیل کے حق میں پورا ہوا۔ ان کی ثابت قدمی کی وجہ سے

اور فرعون اور اس کی قوم کا ساختہ پرداختہ اور ان کی (فلک بوس) عمارات کو
ہم نے خاک میں ملا دیا۔

بنی اسرائیل کو اس طرح ثواب الدنیا ملا۔ اس کے بعد اس عہد ہمایوں کی طرف نگاہ ڈالیے جس کی نظیر چشم فلک نے نہ اس سے پیشتر نہ اس کے بعد آج تک دیکھی۔ یعنی عہد محمد رسول اللہ والذین معہ (علیہم الصلوٰۃ والسلام) اللہ کے ان مخلص بندوں نے خدا کی زمین پر خدا کے قوانین نافذ کرنے کے لئے جن جانگسل مراحل کو طے کیا ان کا ذکر قرآن کریم کے مختلف مقامات پر موجود ہے۔ سعی و عمل کی اس درخشندہ داستان کا خلاصہ (اور نتیجہ) قرآن کریم نے ان جلیل القدر الفاظ میں بیان فرمایا ہے :-

وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَؤُهَا ۚ
وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ۝ ۳۳/۲۷

اور ہم نے تمہیں ان (تمہارے مخالفین) کی سرزمین کا - ان کے شہروں کا اور ان کے
اموال کا وارث بنا دیا اور اس زمین کا بھی جہاں تمہارے پاؤں بھی نہ پہنچے تھے اور
اللہ ہر شئے پر قادر ہے۔

ان تصریحات کو سامنے رکھئے اور پھر غور فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ حضرات انبیاء کرام اور ان کی حق پرست رحق آگاہ جماعتوں کو کس طرح ثواب دیا کرتا ہے۔ اس سے ثواب کا قرآنی مفہوم بآسانی متعین ہو جائے گا۔ اور جب یہ قرآنی مفہوم سامنے آجائے تو پھر سوچئے کہ کیا ہمارے اعمال کا ثواب بھی ہمیں مل رہا ہے۔ قرآنی ثواب کوئی ایسی چیز نہیں جسے محسوس نہ کیا جا سکے۔ جو میزانِ امروزہ میں تولا نہ جا سکے۔ قرآن کریم کی تعلیم تو اس باب میں ایسی واضح اور کھلی ہوئی ہے کہ کوئی شخص اس دھوکے میں نہیں رہ سکتا کہ اس کے اعمال، معیارِ قرآنی پر صحیح اتر رہے ہیں یا نہیں۔ صحیح اعمال کا ثواب تو لہلہاتی کھیتی کی طرح سامنے آجاتا ہے :-

كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ
يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۝ ۴۸/۲۹

اس کھیتی کی طرح جو (سب سے پہلے) اپنی سوئی باہر نکالتی ہے۔ پھر (اس کمزور سی سوئی میں) طاقت پیدا ہوتی ہے پھر وہ سوئی موٹی ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ (ایک تنا) تنا بن کر اپنی جڑ پر کھڑی ہو جاتی ہے جس سے کسان کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے اور کفار اس سے غصہ میں پیچ وتاب کھاتے ہیں۔

یہ ہے ثواب کا صحیح مفہوم۔ لیکن جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے جس قوم پر جمود وتعطل کا عذاب چھا جائے وہ ثواب کے لئے نہایت سہل راستے وضع کر لیتی ہے۔ کہیں پانی پلانے کے لئے "سبیل" لگا دی۔ دو چار دیگیں پکا کر نیاز بانٹ دی۔ جمعرات کی شام بھک منگوں میں چنے یا دھیلے تقسیم کر دیئے وغیر ذالک۔ اور اس کے بعد مطمئن ہو کر بیٹھ گئے کہ اللہ کے فضل سے بہت ثواب کما لیا ہے! لیکن ثواب وجنت کی راہیں ہماری آرزوؤں کے مطابق کشادہ نہیں ہوتیں (لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ) ان کے لئے تو قرآن کریم نے واضح اور استوار معیار مقرر فرما دیئے ہیں۔ وہ قرآن کریم جس کا ارشاد ہے کہ

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجَاهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ $\frac{9}{18}$

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ حاجیوں کے لئے پانی کی سبیل لگا دینا یا مسجد الحرام کو آباد رکھنا اس شخص (کے اعمال) کی مانند ہے جو اللہ اور آخرت پر ایمان لایا اور اس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا؟ (تمہارے خود ساختہ معیاروں کے مطابق یہ دونوں برابر ہوں تو ہوں) اللہ کے نزدیک تو یہ دونوں برابر نہیں۔ اللہ ظلم کرنے والوں پر کامیابی کی راہ نہیں کھولتا

اب پھر سورۂ آل عمران کی ان آیات کو سامنے لائیے جن سے آغاز سخن ہوا تھا۔ دیکھئے کہ وہاں ثوابُ الدُّنیا والآخرہ کے لئے جہاد ہی شرط رکھی ہے۔ مومن کا ہر عمل جو قرآنی نظام کے ماتحت سرزد ہوتا ہے اس عظیم المرتبت سلسلہ کی کڑی ہوتا ہے اور وہ اپنے جیتے جاگتے اعمال سے ہر وقت اس "کارِ ثواب" کیلئے

ہمہ تن مستعد رہتا ہے۔ ادھر سے یہ ثواب کے کام عملی پیکر میں مشہود ہوتے ہیں اور ادھر سے کامرانی و شادمانی خدائی رحمتوں کے ساتھ جلوہ بار ہوتی ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَجٰھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ
اَعْظَمُ دَرَجَۃً عِنْدَ اللّٰہِ ۭ وَاُولٰۗئِکَ ھُمُ الْفَاۗئِزُوْنَ ۝ ۹/۲۰

وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور جانوں سے جہاد کیا۔ (ان کے لئے) اللہ کے ہاں بہت بڑے مدارج ہیں۔ اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔

یہی لوگ ہیں جو سچے معنوں میں فائز المرام و کامیاب و کامران قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ دنیا میں جاہ وحشمت اور حکومت وسطوت کی زندگی اور آخرت میں سرخروئی و سرفرازی کی جنت۔ وَاُولٰئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

---

(۲)

اواخر اکتوبر کا قابلِ ذکر واقعہ مسلم لیگ کی جماعت کا ایوانِ مجلس آئین ساز (اسمبلی) سے "واک اوٹ" ہے جب لیگ کے حلقہ میں اس فیصلہ کی افواہ گرم تھی تو اطراف وجوانب سے طرح طرح کے خدشات کی بھنک کانوں میں پڑتی تھی۔ اسمبلی کی لیگ پارٹی جن مختلف النوع عناصر سے مرتب ہے ہمیں اس کا علم ہے۔ اسی علم کے پیشِ نظر ہمارا خود دل دھڑکتا تھا کہ کہیں کسی کے ذاتی مفاد اور قلبی و ذہنی امیال وعواطف اسے آمادۂ انتشار و سرکشی نہ کر دیں۔ لیکن اس فیصلہ کو عمل میں لانے کے لئے ارکانِ جماعت نے جس ہمرنگی و ہم آہنگی کا ثبوت دیا ہے اس نے ہماری امیدوں کو ایک حیاتِ نو عطا کر دی ہے۔ ہر چند اس تمام کامیابی کا سہرا جناب جناح کے سر ہے جنھوں نے اس قدر متضاد عناصر میں اس قدر یگانگت و اتحادِ عمل پیدا کر دیا ہے۔ لیکن اراکینِ جماعت نے جس اطاعت شعاری اور جذبۂ ایثار کا ثبوت دیا ہے اس کے لئے ہم ان کی خدمت میں نہ صرف اپنی طرف سے بلکہ تمام ملتِ اسلامیہ (ہندیہ) کی طرف سے دلی ہدیۂ تبریک وتہنیت پیش کرتے ہیں۔ وہ یقین مانیں کہ انھوں نے اپنے اس حسنِ عمل سے قوم کے دلوں میں گھر کر لیا ہے۔ حقیقی عزت اسی طرح سے حاصل ہوا کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے عزم میں استقلال اور جذبۂ اطاعت و ایثار میں استقامت عطا فرمائے۔ اگر انھوں نے ہر موقع پر اسی قسم کے ضبط و انضباط اور اطاعت و ایثار کا ثبوت دیا تو وہ دن دور نہیں کہ ہماری نکبت وزبوں حالی

ہم سے سرفرازی وسربلندی میں تبدیل ہو جائے گی اور ہم ساری دنیا کو بتا سکیں گے کہ
نشاں یہی ہیں زمانے میں زندہ قوموں کے

اسمبلی سے "واک اوٹ" کا واقعہ یوں تو ایک معمولی سی چیز ہے اور بعض حلقوں میں یہ کہکر بھی خوش ہو لیا جاتا ہے کہ یہ کانگرس کی تقلید ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک نہ واقعہ ایک معمولی واقعہ ہے اور نہ ہی کسی کی تقلید ہے۔ مومن کی زندگی اپنے رجحانات کے ماتحت نہیں بسر ہوتی بلکہ اس کا ہر قدم ایک اصول کے ماتحت اٹھتا ہے۔ وہ اگر کہیں جاتا ہے تو اس اصول کے استحکام کی خاطر اور اگر وہاں سے نکلتا ہے تو اس اصول کی خاطر۔ اسے تو دعا ہی یہ سکھائی گئی ہے کہ

رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْکَ سُلْطَانًا نَّصِیْرًا ○ ۱۷/۸۰

اور کہہ میرے پروردگار! مجھے (جہاں کہیں پہنچا) تو صداقت سے پہنچا۔ اور (جہاں کہیں سے نکال) تو سچائی کے ساتھ نکال۔ اور مجھے اپنے ہاں سے قوت عطا فرما۔ ایسی قوت کہ (ہر حال میں) مددگاری کرنے والی ہو۔

وہ کہیں داخل ہوتا ہے تو صداقت لئے ہوئے اور وہاں سے "واک آوٹ" کرتا ہے تو صداقت کے لئے۔ اس کا جانا اپنی مرضی کے ماتحت نہ وہاں سے آنا اپنی خواہش کے تابع۔

اور پھر ایک مردِ مومن کا کہیں سے روٹھ کر چلے آنا کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ جہاں سے وہ یہ کہکر چلا آئے لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ (جاؤ! مجھے تم سے کوئی واسطہ نہیں۔ تمھارا نظامِ حیات تمھارے لئے۔ میرا ضابطۂ قانون میرے لئے) تو ڈر ئیے اس بستی کے انجام سے! خوف کھائیے ان کے مآل سے۔ اس کا وہاں سے نکل جانا اس کی زندہ دلیل ہے کہ وہ مقام اب عذابِ خداوندی کا مہبط بننے والا ہے۔ وہ نکلتا ہی اس وقت ہے جب دیکھ لیتا ہے کہ اس کی ہلاکت مقدر اور ان پر خدا کے قانون کی گرفت مسلط ہو چکی ہے۔ وہ جن سے روٹھتا ہے ان سے ان کا خدا روٹھ جاتا ہے اور جب کسی سے اس کا خدا روٹھ جائے تو کون ہے جو اسے

پناہ دے سکے۔

اور اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک مردِ مومن جب حق و صداقت کی خاطر کہیں سے نکل جاتا ہے تو اس کا نکلنا درحقیقت فاتح و منصور واپس آنے کا اعلان ہوتا ہے۔ وہ نکلتا ہے تو بدر وحنین کی تیاریوں کے بعد خدا کے اس وعدے کو سچا کرنے کے لئے کہ

لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۝ ۲۷

تم انشاء اللہ یقیناً اس مسجد الحرام میں (جہاں سے نکل کر تم ادھر آسکے تھے) امن و امان کے ساتھ پھر سے داخل ہوگے۔

وہ نکلتا ہے تو پھر خدا کے فضل وکرم کے ساتھ بہ ہزار شکوہ و شوکت واپس بھی آتا ہے!

سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝

یہ خدائی قانون ہے جو پہلے سے نافذ و جاری ہے اور خدائی قانون ہرگز تبدیل نہیں ہوتا۔

اس میں شبہ نہیں کہ آج ہماری جماعتوں کے ایسے اقدام بالعموم اس روح کو ساتھ لئے ہوئے نہیں ہوتے جس کی جھلک اوپر کی سطور میں نظر آرہی ہے۔ لیکن اگر لیگ کا یہ اقدام ذاتی مفاد پر مبنی نہیں بلکہ حق و صداقت پر مبنی ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ کی نصرت ان کے ساتھ ہوگی۔ اور اگر انھوں نے اس اقدام کے بعد سہل انگاری سے نہیں بلکہ مستعدی اور تن دہی سے کام لیا تو وہ دن بھی دور نہیں رہ سکتا جب اللہ تعالےٰ ان کے اپنی اعمالِ حیات میں حقیقی روح بھی پھونک دے گا۔ کہ اگر اس کی راہ میں ایک قدم بھی صحیح اٹھایا جائے تو وہ دس قدم اٹھانے کی طاقت عطا فرمادیا کرتا ہے۔

خدا کرے کہ ہماری ان سیاسیات میں حقیقی روح جلوہ بار ہو جائے۔ اللہ کی رحمت سے ایسا ہوتا کیا بعید ہے۔ باقی رہے ہمارے وہ بھائی جنھوں نے اپنی جماعت کے اس متفقہ فیصلہ کے بعد اس کی خلاف ورزی کی اور اکیلے اسمبلی میں چلے گئے تو ان کا ذکر ہی بے کار ہے۔ دنیا میں جب کسی کو نیک نامی سے شہرت حاصل نہیں ہوتی تو وہ ان طریقوں سے اپنا تعارف کرالیتا ہے۔ کیا اس سے پیشتر آپ نے کبھی جناب غیاث الدین صاحب کا نام بھی سنا تھا۔

---

(۳۷)

ہمارے "نادان دوست" جناب فضل الحق صاحب کی وحشت سامانیاں پھر وجہ اضطراب و باعث تشویش ہو رہی تھیں۔ لیکن للہ الحمد کہ تیمار داروں کے حسن تدبر اور قوت برداشت نے مریض کو سنبھال لیا۔ اور اللہ نے اس کے چاک گریباں کی آبرو رکھ لی ورنہ ایسے امراض کے دورے خطرناک ہوا کرتے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ یہ واقعہ ان کے ذوقِ جنون کے لئے کافی عبرت کا موجب ہوگا۔

بہرکیف مریض اور تیمار دار دونوں مستحق مبارکباد ہیں۔

تہنیت گوئید مستاں راکہ سنگِ محتسب
بر دلِ ما آمد و این آفت از مینا گذشت

جناب جناح "ملت اسلامیہ" کی طرف سے دلی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے نہایت کشادہ ظرفی اور بلند نگہی سے کام لیتے ہوئے ملت کے مفاد کو اپنے ذاتی جذبات پر ترجیح دی۔ ان کی عظمت اسی میں تھی۔ نیز شکریہ کے مستحق ہیں وہ تمام حضرات جنھوں نے اپنی سعی و کاوش سے اس گتھی کو سلجھانے میں مدد دی۔ اور شکریہ کے مستحق ہیں جناب فضل الحق صاحب جنھوں نے دشمنان ملت کو مزید ہنسی اور شادمانی کا موقعہ نہ دیا۔

---

(۳۸)

امریکہ کے ایک دریدہ دہن اخبار نے حضور ختمی مرتبت سرورِ کائنات علیہ التحیتہ والصلوٰۃ کی ذاتِ اقدس و اعظم کے متعلق نازیبا الفاظ استعمال کئے۔ جس کے خلاف سر عبدالحلیم صاحب غزنوی نے اسمبلی میں التوا کی تحریک پیش کی۔ ہم جناب غزنوی کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے اس صدائے احتجاج سے کروڑوں مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کی۔ لیکن افسوس ہے کہ حکومت نے مسئلے کی اہمیت کا کما حقہٗ احساس نہیں کیا۔ دنیا کو شاید ابھی معلوم نہیں کہ ایک مسلمان کے نزدیک جس کے دل میں ایمان کی کوئی کرن بھی موجود ہے۔ حضور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر و منزلت کیا ہے! وہ ذاتِ گرامی (فداہ ابی و امی) جن پر ایمان ہمارے لئے باعث نجات و سعادت اور جن کی محبت سرمایۂ زندگی و متاعِ حیات ہے۔ ہمارے نزدیک معراجِ انسانیت کا مظہر اتم اور دنیا و آخرت کی بلندیوں اور سرفرازیوں کا پیکرِ مقدس ہے۔ اس ذاتِ فخر موجودات کی شان میں نازیبا الفاظ تو کجا ہم تو ان کو چھوں اور

گلیوں کی توہین بھی برداشت نہیں کر سکتے جن کے ذرات کو اس پیکرِ رفعت و عظمت کی کفش بوسی کی سعادت نصیب ہو گئی۔ خوش بخت وہ راہیں جن میں وہ شمعِ فروزاں ضیا بار و جلوہ ریز ہوئی۔ اور زہے نصیب خاک کے ان ذروں کے جو ان درخشندہ و تابناک نقوش قدم کے چومنے سے آسمان کی بلندیوں پر پہنچ گئے دُنیا کیا جانے کہ اس پیکرِ محبوبیت کے ساتھ ہمارے قلوب کا کیا رشتہ ہے! ایک زندگی کیا! ہزار بار زندگی نصیب ہو اور ہزار بار اس شاہنشاہِ کونین کی ناموس پر نچھاور ہو جائے تو بھی دل کی تمنا بر نہ آسکے۔ جس سینے میں عشقِ رسولؐ کا سوز نہیں۔ سینہ نہیں۔ بدبختیوں اور تاریکیوں کا قبرستان ہے۔ جس دل میں ناموسِ محمدؐ پر مٹنے کی تمنا نہیں۔ دل نہیں۔ بوم و کرگس کا وحشت انگیز کاشانہ ہے۔ لیکن! غلام کا عشق کیا اور محکوم کی تمنا کیسی؟ تحفظِ ناموسِ رسولؐ انفرادی کے احتجاجات سے نہیں ہو سکتا۔ جماعت کی قوت سے ہو سکتا ہے۔ وہ قوت جس کے ضعف کا باعث خود جناب عبدالحلیم صاحب غزنوی بنے! ہم اپنے اس بھائی سے ناموسِ رسالتؐ کے نام پر اپیل کریں گے کہ وہ اپنی انفرادی روش کو چھوڑ کر پھر سے جماعت میں آملیں۔ اور یوں ریت کے بکھرے ہوئے ذروں کو ایک ایسی محکم چٹان بنا دیں کہ مخالفت و نامساعدت کی جو موج اس سے ٹکرائے پاش پاش ہو جائے۔ اس وقت ہم دیکھینگے کہ کس میں یہ ہمت پڑتی ہے کہ وہ شاہنشاہِ کونین (علیہ الصلوٰۃ والسلام) تو کجا اُن کے کسی ادنیٰ غلام کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر دیکھ جائے!

افرنگ ز خود بے خبرت کرد وگرنہ
اے بندۂ مومن تو بشیری تو نذیری

معارف القرآن کے متعلق سابقہ اشاعت میں شمس العلماء محب الحق صاحب مدظلہٗ کا ایک گرامی نامہ شائع کیا گیا تھا۔ اس میں انھوں نے فرمایا تھا کہ کتاب کو ابھی استیعاباً نہیں دیکھا۔ کتاب کو استیعاباً دیکھنے کے بعد اُن کا ایک تفصیلی مکتوب گرامی موصول ہو گیا۔ جسے اشاعتِ حاضرہ میں شائع کرنے کا فخر حاصل کیا جاتا ہے۔ اس سے آپ اندازہ فرمایئے کہ معارف القرآن کیا ہے!

بے حسی

[اس دفعہ کئی برس کے بعد ماہ رمضان کے کچھ دن ملتان میں گذارنے کا موقع ملا مسلمانوں کے اس تاریخی شہر میں خاص طور پر ایامِ صیام میں کم از کم صوم وصلوٰۃ ہی کی حد تک جو سرگرمی پائی جاتی تھی اس دفعہ اس میں نمایاں کمی نظر آئی۔ ذیل کے اشعار ان احساسات کا نتیجہ ہیں جو یہ صورتِ حال دیکھ کر دل میں پیدا ہوئے۔ اسد]

سوز و گدازِ قلبِ مسلماں کو کیا ہوا
مومن کے ذوق و شوقِ فراواں کو کیا ہوا

وہ عشق و آرزو کی حرارت کہاں گئی
جوشِ حیات و جذبۂ ایماں کو کیا ہوا

چھائی ہوئی جو بے دلی اور مُردنی سی ہے
زندوں کا دل کدھر گیا اور جاں کو کیا ہوا

بندوں نے کس سبب سے خدا کو بھلا دیا
روزِ ازل کے وعدہ و پیماں کو کیا ہوا

پابندیٔ نماز نہ روزوں کا احترام
آئینِ مصطفےٰ کے نگہباں کو کیا ہوا

آتی جو نغمۂ سحری کی صدا نہیں
باغِ نبی کے مرغِ خوش الحاں کو کیا ہوا

کیوں آج لوگ دین سے غافل ہیں اس قدر
زورِ بیانِ عالمِ قرآں کو کیا ہوا

سینے ہیں سامعین کے سرد و سیاہ کیوں
واعظ کے نطقِ شعلہ بداماں کو کیا ہوا

گر پیرِ خانقہ کی کرامات ہے نہاں
شیخِ حرم کے زہدِ نمایاں کو کیا ہوا

کیا یہ بھی حبِّ جاہ کے رستے میں لٹ گئی
صاحبدلوں کی دولتِ عرفاں کو کیا ہوا

سینے میں بند رہ کے وہ بجھ ہی گئی نہ ہو
صوفی کے دل کی شمعِ فروزاں کو کیا ہوا

مانا امیر نشۂ دولت میں مست ہیں
لیکن فقیرِ بے سر و ساماں کو کیا ہوا

یوں خشک ہو رہی ہیں دلوں کی جو کھیتیاں
اہلِ نظر کے دیدۂ گریاں کو کیا ہوا

اہلِ خرد کی روشنیٔ علم کیا ہوئی
اہلِ جنوں کے چاکِ گریباں کو کیا ہوا

ویراں رہیں جو رمضان میں بھی مسجدیں!
حیراں ہوں اے اسد مرے ملتاں کو کیا ہوا

اسد ملتانی

مضمون مکتوب گرامی جناب شمس العلماء حافظ سید محب الحق صاحب مدظلہ

ـ روڈ پٹنہ

یکم نومبر ۱۹۴۱ء

مکرمی و مخلص ـــــ سلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

ے معارف القرآن بالاستیعاب پڑھا سبحان اللہ کیا کتاب لکھی گئی ہے۔ محض جزئیات میں کہیں کہیں اختلاف
ز فطرت انسانی ہے جو قابل توجہ ہے۔ اس کتاب میں چند خصوصیتیں ہیں ایک تو یہ کہ سارے خیالات و اختلافات
پیچھے پھینک کر خدا اور خدا کی صراط مستقیم نصب العین رہی ہے۔ میں کیا خدا اوسے قبول
مقبول کرے اور قوم کی نسبت اپنے ساتھ جوڑ دے جو اس کتاب کا نصب العین ہے۔ دوسرے اختلافات
ات باہمی نے جو قرآن کے معنی بدل دئے ہیں جو فطال علیہم الامد فقست قلوبہم کے
ر معانی قرآن محرف بنا دیا گیا ہے اسکی اصلاح ہوگئی ہے تیسری ضرورت اور پوری ہونے کی امید ہے کہ
ن کا صحیح ترجمہ جس کی ضرورت قوم کو شدید اور ساشد ہے وہ انشاء اللہ پوری ہو جائے گی مگر افسوس یہ ضرورت ہے
زورت کئی جلدوں میں پوری ہوگی اس لئے اگر آپ کو ساری جلدوں کی تصنیف سے فرصت ہوگی
ں کا توقع ہے کہ ساری کتاب جو ابھی غیر مطبوعہ ہے اس سے قرآنی الفاظ کے معانی کی صحت کر کے قرآن
ب شائع کیا جائے جو سارے ترجموں پر حکم ہو اور جس کی تبلیغ آسان اور عام ہو سکے اور اس انقلابی دور
ں کے مقبول اور مصلح ہونے کی فضا خدا نے پیدا کر دی ہے۔

خدا سے دعا ہے کہ آپ مع الخیر ہوں۔ میں بھی اب تک جوں توں زندہ ہوں۔

قوم نہ بدلے گی اس کا حال نہ بدلیگا جب تک اس میں روحانیت اور پاک باطنی نہ آئے گی اور یہ بغیر خدا
الص محبت کے حاصل نہیں ہو سکی ضرورت ادہر توجہ کرنے کی بھی ہے اس کی صورت یہی ہے کہ قوم کو
ن کی تلاوت معانی و مفہوم کے ساتھ کرنے کی تبلیغ کی جائے زبانی بھی عملی بھی اسٹیج سے نہیں بلکہ مسجدوں میں
چند لوگوں میں بطور مشورت پیش کرنے کا رنگ اختیار کیا جائے افسوس کہ اس کے لائق میں اب نہیں رہا۔

سید محب الحق

طرحِ نو

اس نظم کی تقریب کے لئے پہلے "حقائق و عبر" کا ذیلی عنوان "بیکاروں کے مشغلے" بر صفحہ ۵۵ ملاحظہ فرمایئے۔ (طلوعِ اسلام)

تجھے اے بلبلِ رنگیں نوا سوجھی ہے گانے کی — مگر مجھکو پڑی ہے فکر تیرے آشیانے کی

یہ تیرے آڑے ترچھے چار تنکے شاخِ گلبن پر — کبھی سے بجلیاں ہیں فکر میں ان کے جلانے کی

یہ گلچیں۔ باغباں۔ صیاد۔ یہ تیرے کرم فرما — لئے بیٹھے ہیں دل میں حسرتیں تجھکو مٹانے کی

سنبھالے اپنے پر پرزے ترے سب ہمصفیروں نے — ہر اک نے فکر کی ہے اپنے اپنے آشیانے کی

مگر اک تو ہی غافل ہے مآلِ کارِ گلشن سے — ترے حصے میں آئیں غفلتیں سارے زمانے کی

کبھی سوجھا ہے بھی ہے تجھکو کہ اب رنگِ چمن کیا ہے؟ — کبھی سوچا بھی ہے تو نے ہوا کیا ہے زمانے کی؟

نہ پھولوں کے وہ تیور ہیں نہ غنچوں کی وہ چتون ہے — خدا جانے کدھر کو اب کشش ہے آب و دانے کی

پرانے برگ و گل سب چھانٹے جائینگے خیاباں سے — لگی ہے باغباں کو دھن نیا گلشن بنانے کی

نئے پودے۔ نئے بوٹے۔ نئے گلبن۔ نئے تختے — نئی شرطیں بنیں گی اب چمن میں آنے جانے کی

قفس بھی۔ دام بھی۔ مقراض بھی۔ بالکل نئے ہونگے — نئی ترکیب ہوگی تجھکو پھندے میں پھنسانے کی

یہ لچھن ہیں تو تجھ سے باغ اب چھوٹے کا چھوٹا ہے — بنیں گی سازِ عبرت حسرتیں تیرے فسانے کی

اگر گلشن میں رہنا ہے بدل لے تو بھی ڈھنگ اپنا — سماعت اب نہیں ہوگی کسی حیلے بہانے کی

نہ بایستے ترا در باغ سازِ آشیاں کردن

چو کردی زندگی باید بحکمِ باغباں کردن

(نیرنگ)

حقائق و عبر

بے کاروں کے مشغلے

آج دُنیا میں جو ہنگامۂ رستخیز برپا ہے وہ ہر دیکھنے والی آنکھ اور ہر دھڑکنے والے دل کے لئے قیامتِ صغریٰ کا منظر پیش کر رہا ہے۔ دُنیا کا خطہ خطہ انقلاب کی آماجگاہ بن رہا ہے۔ تخت اُلٹ رہے ہیں۔ تاج چھن رہے ہیں۔ بستیاں اُجڑ رہی ہیں۔ متاعیں لٹ رہی ہیں۔ باپ کو بیٹے کا علم نہیں۔ بیٹی کو ماں کی خبر نہیں۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں کہ اس پر کل کیا گذرنے والی ہے۔ انسانوں کا لہو سمندر کے کھاری پانی سے بھی زیادہ ارزاں ہو رہا ہے۔ ہر قوم اپنے مستقبل کے متعلق لرزاں و ترساں ہے۔ ہر جماعت اپنی ہستی کو قائم رکھنے کے لئے ہمہ تن تشویش و کاوش ہے۔ لیکن اس تمام ہنگامۂ ہاؤ ہو میں۔ اس جہانِ سعی و عمل میں بے فکروں کی ایک ایسی جماعت بھی ہے جسے اس سے کچھ واسطہ نہیں کہ دُنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ اس کی کچھ فکر نہیں کہ کل خود ان پر کیا گذرنے والی ہے۔ وہ اپنے خوابوں کی دنیا میں مست۔ کہکشاں کی جوئے مرمریں میں اپنی "معصوم تمناؤں" کی کشتی حسین کھیتے۔ تاروں کی چھاؤں میں۔ دور۔ اُفق کے اُس پار۔ آکاشش کے کسی حسین طلسماتی مندر کی طرف جانے کی فکر میں غرق ہیں۔ جہاں ان کی زندگی کا مدّعا۔ لیکن دشمنِ جان۔ منجمد فشردۂ یاسمین کا بورین مجسمہ۔ رعنائیوں اور شادابیوں کی ہزار جنتیں جلو میں لئے۔ مینا بدوش ساغر بکف محوِ خرامِ ناز ہے۔ یہ ہے ہمارے شاعروں کی جماعت۔ جنھیں نہ فکرِ فردا ہے نہ غمِ دوش۔ ان کے ساتھ ساتھ بے فکروں کا ایک اور گروہ ہے جسے سخن شناس و سخن فہم حضرات کا طبقہ کہا جاتا ہے۔ ان کا کام یہ ہے کہ ایک محفلِ مشاعرہ منعقد کرائی جائے جس میں ان تمام کھوئے ہوئے انسانوں کو جمع کیا جائے اور جھوٹی واہ واہ سے ان کے فریبِ نفس کو ایسا پختہ تر کیا جائے کہ وہ حقائق کی دُنیا کی طرف کبھی آ ہی نہ سکیں۔ فریبِ نفس کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہے کہ ہر شاعر جب کسی دوسرے کو داد دیتا ہے تو جی میں

خوب سمجھتا ہے کہ میں اسے بنا رہا ہوں۔ لیکن جب خود شعر سنانے اٹھتا ہے تو دوسروں کی تحسین و آفرین کو بالکل سچی داد سمجھتا ہے اور جھک جھک کر سلام کرتا ہے۔ مسلمانوں کی بالعموم یہ حالت ہے کہ جب کبھی انھیں ملت کے اجتماعی مفاد کے کسی کام میں شرکت کے لئے کہا جائے تو ہر شخص اپنی عدیم الفرصتی کا رونا روئے گا۔ لیکن بزم مشاعرہ ہر روز منعقد کیجئے کیا مجال جو کسی کی عدیم الفرصتی شرکت یا انتظام میں مانع ہوجائے۔ پچھلے دنوں اسی قسم کا ایک اجتماع دارالسلطنت دہلی میں بھی منعقد ہوا۔ اس کی جو روئداد ہم تک پہنچی اس سے معلوم ہوا کہ عام سننے والوں کی طرف سے اچھی خاصی بدتمیزی کے مظاہرے ہوئے جو ہماری سوسائیٹی کے آداب معاشرت اور نوجوانوں کے ضبط و انضباط کے نہایت عمدہ آئینے تھے۔ باقی رہے شعراء حضرات۔ سو وہ اسی افسانوی دنیا کے تذکروں میں مست تھے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے۔ ہم ان فرضی عشاق کے فرضی قصہ ہائے ہجر و وصال کی داستانیں ریڈیو پر سن رہے تھے اور رہ رہ کر جی میں ابال اٹھتا تھا کہ کوئی اللہ کا بندہ تو ایسا اٹھے جو ان بھلے آدمیوں کو بتائے کہ خدارا! سوچو تو سہی کہ دنیا میں آج کیا ہو رہا ہے اور تم کیا کر رہے ہو؟

بارے الحمد کہ ہماری خلش ناکام نہ رہی۔ آخری وقت میں ہمارے محترم جناب میر غلام بھیک صاحب نیرنگ اٹھے اور انھوں نے ایک برجستہ نظم میں وہ سب کچھ کہدیا جو ہمارے جی میں تھا۔ جناب نیرنگ کی یہ نظم دوسرے مقام پر زینت دہ رسالہ ہے۔ ہم ان کی خدمت میں ہدیۂ تہنیت و تبریک پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے فضا کے ہنگامی طوفان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بڑی جرأت سے حق کی آواز کو بلند کیا۔ اور کہنے کی بات بڑے سلیقے اور ٹھکانے سے کہدی۔ اس نظم کا کچھ ایسا اثر تھا کہ ہمارا خیال تھا کہ جونہی میر صاحب بیٹھے اعلان کر دیا جائے گا کہ ہمیں اپنی مہمل روش کا احساس ہوگیا ہے۔ ہم جناب میر صاحب کے شکر گذار ہیں کہ انھوں نے ہمارے سامنے حقیقت کو بے نقاب کرکے ہمیں خواب سے جگا دیا۔ اب مشاعرہ ختم کیا جاتا ہے۔ لیکن ہوا کیا؟ میر صاحب کو خوب خوب داد ملی۔ اور جب وہ بیٹھے تو ان کے بعد پھر وہی صحرانوردی اور دشت پیمائی کے افسانے شروع ہوگئے۔ اور پھر اسی قسم کی داد ملنے لگی۔ توبہ۔ توبہ! ایسی دلچسپ قوم بھی دنیا میں کہیں اور نہ ہوگی یعنی جس نے

اس روش کی مذمت کی اسے بھی جی بھر کر داد دی گئی اور جنھوں نے اس کے بعد اسے پھر شروع کر دیا انھیں بھی دل کھول کر سراہا گیا۔ ان کے نزدیک زندگی اور اس کے مسائل سب شاعری ہی شاعری ہے۔ یوں ہوگیا تو کیا اور دوں ہوگیا تو کیا۔

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی۔ نغمۂ شادی نہ سہی

بھلا اس قوم کے پنپنے کی بھی کوئی صورت ہوسکتی ہے؟

---

(۲) مخالفت مسٹر منشی نے گاندھی جی کی اشیر باد (دعاؤں) کے ساتھ اپنی زندگی کا نصب العین پاکستان کی مخالفت قرار دے رکھا ہے: ہمیں اس سے کچھ تعرض نہیں۔

مہ نور می فشاند و سگ بانگ می دہد

لیکن حیرت و تأسف اس پر ہے کہ ابھی تک اس ملک میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اسلام کے اس قدر کھلے دشمنوں کے دست و بازو بنتے چلے جا رہے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ یہ "سیاسی نظریوں" کا اختلاف ہے اس لئے ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس شخص کی تائید کرے جو اس سے سیاسی نظریہ میں ہم آہنگ ہو۔ لیکن ہم عرض کرینگے کہ یہ سیاسی نظریوں کا اختلاف نہیں بلکہ کفر و اسلام کا کھلا ہوا معرکہ ہے۔ پچھلے دنوں لدھیانہ (پنجاب) میں "اکھنڈ ہندوستان" کی کانفرنس میں مسٹر منشی نے اپنے خطبۂ صدارت میں نہایت واضح الفاظ میں بتایا کہ ہندوؤں کو پاکستان کی مخالفت کیوں کرنی چاہیئے۔ انھوں نے کہا تمھیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان کیا ہے؟ نہیں معلوم تو سن لیجئے۔ نظریۂ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ:-

"(۱) تمام ہندوستان کے مسلمان ایک ملتِ واحدہ اور (ہندوؤں سے) الگ قوم ہیں۔

(۲) ہندوستان کے مسلمانوں کو حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ گوشوں میں اپنے لئے ایسے اماکن و مساکن (Homelands) بنائیں جہاں زندگی اور طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے اور

جہاں اُردو ان کی قومی زبان بن سکے۔

مختصر الفاظ میں یوں سمجھیے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایسا خطۂ ارض ہوگا جس میں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔ چنانچہ ابھی پچھلے دنوں مسٹر سہروردی نے کہا کہ "ہم ملّتِ اسلامیہ کے لئے ہندوستان میں ایسے خطّے چاہتے ہیں جہاں ہم دُنیا کا نقشہ اپنے مذہب کے خطوط پر متشکل کرسکیں۔"

اس کے بعد مسٹر منشی نے بتایا کہ "قرآنی حکومت" میں غیر مسلموں کا کیا حشر ہوگا۔ اور اس کا مہیب اور بھیانک نقشہ کھینچنے کے بعد اپنے مخاطبین سے کہا کہ

"ایک قوم (یعنی ہندو) خواہ کتنی ہی بُزدل اور غیر منظم کیوں نہ ہو وہ کبھی اسے برداشت نہیں کرسکتی کہ اس کے افراد شمشیر وسنان کا نشانہ بنائے جائیں۔ ان کی عورتوں کی عصمت ریزی کی جائے اور ان کے مقدس مقامات کی بے حرمتی ہو۔"

یہ تو تھا پاکستان کے متعلق۔ اس کے بعد فرمایا۔ کہ

"تم جانتے ہو کہ "اکھنڈ ہندوستان" کے سامنے کیا مقصد ہے؟ اس کا مقصد ہے وہ عظیم الشان کلچر جسے ہندی کلچر کہا جاتا ہے۔ وہ کلچر جو زمانہ قبل از تاریخ میں پیدا ہوا۔ چھ ہزار برس کی مدتِ مدید میں بڑھتا۔ پھولتا۔ پھلتا زمانہ کی سطح کو یوں روندتا مسلتا آگے بڑھتا گیا جس طرح مادرِ گنگا طوفان کے وقت اُمنڈتی چلی جا رہی ہو۔ ہاں اس کا مقصد؟ نوعِ انسانی کو نجات کا پیغام دینا ہے۔ کیسا پیغام! موت کے مقابلہ میں زندگی کا پیغام۔ سفلی خواہشات پر نصب العین کے غلبہ کا پیغام۔ "جنگل کے قانون" پر (جس کی دنیا پرستش کرتی ہے) اخلاقی نظام کی فتح کا پیغام۔ انسان کو مظہرِ اُلوہیت بنانے کا پیغام۔ میں جانتا ہوں کہ یہ پیغام ناقابلِ فنا ہے۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ "اکھنڈ ہندوستان" جو اس پیغام کا ایک زندہ پیکر ہے نہ فنا ہو سکتا ہے نہ فنا ہوگا۔"

(ٹریبیون ۱۱/۱۳ مئی ۲۰ ء)

آپ نے ملاحظہ فرمالیا کہ مسٹر منشی کس چیز کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ ان کے ارشادات کا ملخص یہ ہے کہ

(۱) مسلمان پاکستان چاہتے ہیں۔

(۲) پاکستان کا مطلب یہ ہے کہ ان علاقوں میں قرآنی حکومت قائم کی جائے۔

(۳) قرآنی حکومت (معاذ اللہ) وحشت و بربریت کی حکومت ہے۔

(۴) اس کے برعکس "اکھنڈ ہندوستان" کا نصب العین اس کلچر کا احیاء و استبقاء ہے جو چھ ہزار سال سے بھارت ماتا کی گودیوں میں پلا۔ اور "جنگل کے قانون" کے مقابلہ میں تہذیب و شائستگی کا پیغام ہے۔

ان تصریحات کے بعد انھوں نے فرمایا:۔

"میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ قومیت پرست مسلمانوں نے مسلم عوام تک پہنچ کر انھیں اس نظریۂ تفریق (پاکستان) کے خطرات سے آگاہ کیوں نہیں کیا؟" (ایضاً)

آپ کو معلوم ہے اس کے بعد کیا ہوا! قومیت پرست مسلمانوں کے ایک "مقتدر روحانی پیشوا" (بقول مسٹر منشی) جمعیت العلماء کے رکن حضرت مفتی محمد نعیم صاحب جلسہ میں تشریف فرما تھے۔ یہ "دعوتِ حق" سن کر بے قرار ہو گئے اور بے تابانہ پکار اٹھے لبیک۔ یا جبل لبیک! گھبرائیے نہیں! پاکستان کی ہم مخالفت کریں گے۔ یہ نظریہ اسلام کے خلاف ہے (ہندوستان ٹائمز ۹/۴۴ ۸) آپ نے غور فرمایا کہ جناب مفتی صاحب (اور دیگر قومیت پرست مسلمان اور جمعیت العلماء) کس چیز کی مخالفت پر سربکف میدانِ جہاد میں اتر رہے ہیں۔ ہندوستان میں مسلم اکثریت کے علاقوں میں قرآنی حکومت کے قیام کے خلاف۔

اے محمدؐ! گر قیامت را براری سر ز خاک

سر برآر و این قیامت در میانِ خلق بیں!

یہ تو تھے ایک مفتی صاحب اور خیر سے جمعیت العلماء کے رکن (با ہمہ ادعائے زہد و تقدس و دعوئے علم و فضل)، اور دوسری طرف تھا ایک سیدھا سادہ مسلمان۔ جب اس کے کان میں یہ طاغوتانہ الفاظ پڑے تو جذبۂ حمیتِ اسلام سے تلملا اٹھا اور علی گڑھ سے للکارا کہ او! اسلام کو بربریت و سبعیت کا نظام کہنے والے سن رکھ کہ "پاکستان کا نظریہ ان اصول پر مبنی ہے جو ہمیں اسلام نے سکھایا ہے۔ وہ اسلام جو

نہ صرف عدل و انصاف کی بلکہ غیر مسلموں سے کشادہ ظرفی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے کہ وہ (نوع انسانی ہونے کی حیثیت سے) ہمارے بھائی کی مانند ہیں" (مسٹر جناح کی تقریر علی گڑھ - بحوالہ ہندوستان ٹائمز ۱۱؍ ۲؍ ۴۴)

وہ ہیں مفتی محمد نعیم اور یہ ہیں مسٹر جناح!

حسن ز بصرہ - بلال از حبش - صہیب از روم

ز خاکِ مکہ ابوجہل؛ این چہ بوالعجبی است

---

(۳) **ایک دلچسپ دلیل** سندھ کے وزیر- پیر الٰہی بخش صاحب نے "پاکستان" پر اپنے خیالات کا اظہار فرماتے ہوئے کہا:-

"میرے خیال میں "پاکستان" ناقابل عمل ہے اور ہندوستانیوں کے لئے تقسیم ہو جانا اور اتحاد کو توڑ دینا خودکشی کے مترادف ہوگا۔ میں تو اقبال کے ان اشعار کا معتقد ہوں جن میں انھوں نے کہا ہے کہ

ہندی ہیں ہم۔ وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اور

مسلم ہیں ہم۔ وطن ہے سارا جہاں ہمارا!

جب ہم مسلمان ساری دنیا کو اپنا وطن قرار دیتے ہیں تو ہم ہندوستان کے ایک حصّہ کو یہ کہہ کر کیوں چھوڑ دیں کہ یہ ہمارا وطن نہیں ہے۔" (مسلم وائس کراچی ۱۵؍ ۱۱؍ ۴۴)

پاکستان کی مخالفت میں حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے ان اشعار کو بطور دلیل پیش کرنا کس قدر دلچسپ ہے۔ یعنی جناب پیر صاحب اقبال کے ان اشعار کو تو سند مانتے ہیں جو انھوں نے ۱۹۰۵ء میں کہے تھے۔ لیکن اسی اقبال نے جو کچھ ۱۹۳۸ء میں کہا اور جس کی وہ آخری وقت تک تلقین کرتے رہے اُسے سند نہیں مانتے!

یہ ہیں خیر سے ہمارے وزرا حضرات!

---

(۴) **ہذیان** جب انسان غیظ و غضب کے جوش میں اپنا عقلی توازن کھو بیٹھتا ہے تو اُس وقت کس قسم کی باتیں کرنے لگ جاتا ہے، اس کا اندازہ اس مقالۂ افتتاحیہ سے لگ سکیگا جو پچھلے دنوں جناب فضل الحق صاحب

(وزیر اعظم بنگال) کے نو زائیدہ اخبار "نواجگ" میں شائع ہوا۔ اس مقالہ میں جس کا عنوان ہے "ہمارا لیڈر کون ہے" لکھا ہے :-

"ہم سے پوچھا جاتا ہے کہ آپ جناح کی مدد کیوں نہیں کرتے؟ ہمارا جواب یہ ہے کہ ہم نے کبھی کسی ایسے شخص کو لیڈر نہیں مانا جو غیر بنگالی ہو۔ ہمارا پختہ ایمان ہے کہ صرف ایک بنگالی لیڈر ہی ہندوستان کو آزاد کرا سکتا ہے۔ ہمیں نہ جناح سے محبت ہے اور نہ اس کے خلاف کوئی تعصب ہے۔ جناح نے آپ کو کیا دیا ہے۔ پھر آپ جناح جیسے آدمی کی کیوں مدد کرتے ہیں جو ایک دوسرے صوبے سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک گمنام ہستی ہے اور جس نے کوئی قربانی نہیں کی۔ کیا آپ کو اس پر کوئی شرم نہیں آتی۔ اگر آپ مجھے اس کی قربانی کی ایک مثال بھی بتا دیں تو میں اس کو اپنا لیڈر مان لونگا۔" (انقلاب ۱۲/۱۱ھ ۵)

ہمارا خیال ہے کہ اب جبکہ مسلم لیگ اور جناب فضل الحق صاحب کی افسوسناک آویزش کا دلخراش قصہ ختم ہو چکا ہے جناب فضل الحق صاحب کو چاہئے کہ اس اخبار کو بھی ختم کر دیں۔ اس لئے کہ یہ اخبار نہ صرف ان کے لئے اسی دنیا میں تخریب و تذلیل کا باعث ہوگا بلکہ آخرت میں بھی ندامت و شرمساری کا موجب بنے گا۔ جس اخبار کی بنیاد بنگالی مسلمان اور غیر بنگالی مسلمان کی تفریق جاہلیت پر ہو کسی سنجیدہ مسلمان کے لئے زیبا نہیں کہ اس سے کسی قسم کا بھی تعلق وابستہ رکھے۔

این دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ

---

(۵) لاؤڈ اسپیکر اور نماز

ہمارے دینی اجتماعات (مثلاً جمعہ۔ عیدین وغیرہ) میں آلہ مکبر الصوت (لاؤڈ اسپیکر) کے استعمال کے جواز کا مسئلہ ایک عرصہ سے زیر بحث چلا آ رہا تھا۔ للہ الحمد کہ اتنے عرصہ کی باہمی کشمکش اور تکفیر و تفسیق کے بعد مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی نے اب اس کے جواز میں فتویٰ صادر فرما دیا

صبح کا بھولا شام گھر آئے اس کو بھولا مت کہئے

ذیل میں سوال اور اس کا جواب (نقیب مورخہ ۱۲/۱۱ھ ۱۰) کے حوالہ سے درج کئے جاتے ہیں :-

"کیا فرماتے ہیں علمائے کرام کثر اللہ سوادکم۔ اس آلہ کے بارے میں جسے ریڈیو کہتے ہیں۔ وہ

مثل فونوگراف ہوتا ہے جو اصواتِ خارجہ کو جذب کرکے نشر کر دیتا ہے۔ کیا اس کا استعمال نماز اور تلاوتِ قرآن میں جائز ہے یا نہیں ہے۔؟ اور اس کے عمل کی صورت یہ ہے کہ قاری یا متکلم پڑھتا یا بولتا ہے اور وہ آلہ آواز جذب کرکے اسی کی آواز کی مانند نشر کرتا ہے۔ اور دونوں کی آواز میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ تو کیا بڑے اجتماع کی نمازوں میں مثلاً عیدین میں قرأت سننے کے لئے اس آلہ کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟"

(المستفتی محمد عبدالعزیز عفی اللہ از مدرسہ غوث العلوم واقع کمانی پورہ)

جواب:-

"جس آلہ کے متعلق سوال کیا گیا وہ اب تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ مگر سننے میں آیا ہے کہ وہ ایک ایسا آلہ ہے جسے خطیب یا قاری کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے اور وہ اُس کی طرف رُخ کئے ہوئے قرأت یا خطاب کرتا ہے۔ پس وہ آلہ آواز کو جذب کرکے اتنی دور نشر کرتا ہے کہ اُس کے چوتھائی فاصلہ تک بھی بغیر اس کی امداد کے آواز پہنچانا مشکل ہے اور جو آواز اس آلہ کے ذریعہ سامعین تک پہنچتی ہے وہ بعینہٖ قاری یا خطیب کے منہ سے نکلی ہوئی آواز ہوتی ہے۔ یہ آواز قاری یا خطیب کے منہ کی کمزور نکلتی ہے۔ مگر وہ آلہ کے اندر ہوکر نکلتی ہے تو ہوا میں زیادہ قوت کے ساتھ نشر ہوتی ہے یہ آواز آلہ کی نہیں ہوتی۔ درحقیقت آلہ کی اپنی کوئی آواز ہے بھی نہیں۔ پس دور اور نزدیک جو بھی سننے میں آتی ہے وہ قاری یا خطیب کی آواز ہوتی ہے۔ کسی غیر کی نہیں ہوتی۔ اگر یہ تفصیل صحیح ہے تو ایسے آلہ کے استعمال سے کوئی حرج نہیں اور ہماری نظر سے شریعتِ مقدسہ میں اس کی ممانعت کی کوئی دلیل نہیں گذری۔ واللہ اعلم۔

(محمد کفایت اللہ غفرلہٗ مدرسہ امینیہ)

ہمیں اس جواب سے تو اطمینان ہوا۔ لیکن لاؤڈ سپیکر کے متعلق جناب مفتی صاحب کے اس بیان پر بے حد حیرت ہوئی۔ اوّل تو آجکل لاؤڈ سپیکر ایک اتنی عام چیز ہو چکا ہے کہ شہروں کے رہنے والے بچے بھی اس سے واقف ہیں۔ پھر جناب مفتی صاحب خود کانگرسی مولوی ہیں۔ انھوں نے کانگرس کے متعدد جلسوں میں شرکت کی ہے۔ جہاں التزاماً لاؤڈ سپیکر نصب ہوتا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ

انھوں نے خود کئی ایک مواقع پہ لاؤڈ اسپیکر پہ تقریر فرمائی ہوگی۔ اگر ہمارا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو دو برس اُدھر دہلی میں خود جمعیت العلماء کا جو سالانہ اجلاس ہوا تھا اسمیں لاؤڈ اسپیکر موجود تھا اور ان تمام حضرات نے اس پہ تقریریں کی تھیں۔ اس کے بعد مفتی صاحب کا یہ ارشاد کہ "جس آلہ کے متعلق سوال کیا گیا ہے وہ دیکھنے میں نہیں آیا مگر سننے میں آیا ہے" (اور اس کے بعد پوری تفصیل لاؤڈ اسپیکر کی دی گئی ہے) یقیناً حیرت انگیز ہے۔ مستفتی صاحب نے اپنے استفتاء میں لاؤڈ اسپیکر کی جگہ ریڈیو کا غلط لفظ استعمال کر دیا ہے۔ لیکن ان کی تفصیل سے خود ہویدا ہے کہ ان کی مراد لاؤڈ اسپیکر سے ہے۔ (چنانچہ نقیب نے اس فتویٰ کو "لاؤڈ اسپیکر اور نماز" کے عنوان سے شائع کیا ہے) اس کے بعد مفتی صاحب کی طرف سے یہ تفصیلات اور قیود و شرائط سمجھ میں نہیں آسکیں۔ بہرحال ہمیں خوشی ہوئی کہ مفتی صاحب نے بات کو صاف کر دیا۔ اس کے بعد ہم بیرونی مقامات اور خود دہلی کی بڑی بڑی مساجد (مثلاً جامع مسجد، مسجد فتحپوری، عیدگاہ وغیرہ) کی مجالس منتظمہ سے درخواست کرینگے کہ وہ اب جمعہ اور عیدین کے اجتماعات پہ لاؤڈ اسپیکر کا انتظام کرنے کی فکر کریں۔ لیکن ہمیں تو اب بھی خدشہ ہے کہ خطیب حضرات اس پر بھی رضامند نہ ہونگے۔ اس لئے کہ لاؤڈ اسپیکر نصب کرنے کے بعد تقاضا ہوگا کہ سامعین تک کوئی کام کی بات پہنچائی جائے اور اس کے لئے قابلیت اور محنت دونوں کی ضرورت ہے۔ محض رسمی یا وراثتی خطابت و امامت سے کام نہیں چل سکتا۔ ہمارا خیال ہے کہ خطبات کے لئے لاؤڈ اسپیکر کی مخالفت میں یہ جذبہ بھی بڑی حد تک کارفرما رہا ہے۔ ہم انتظار میں ہیں کہ آئندہ عید الاضحیٰ کی تقریب پر کہاں کہاں لاؤڈ اسپیکر نصب کئے جاتے ہیں۔

---

(۲) حقیقی بہی خواہی

پنجاب کے مختلف حلقوں میں آجکل یہ خبر گشت لگا رہی ہے کہ وہاں کی اتحاد پارٹی کے خلاف ایک سازش ہو رہی ہے۔ جس میں ایک زمین کے قریب مسلمان بھی ہیں جو چاہتے ہیں کہ موجودہ اتحاد پارٹی کی حکومت کی جگہ ایک جدید پارٹی کی حکومت قائم کر دی جائے۔ اس پہ اتحاد پارٹی کا حامی ایک اسلامی اخبار تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"اگر یہ خبر درست ہے تو مسلمانوں اور صوبے میں منظم تعمیری کام کے حامیوں کا فرض ہے کہ اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور سوچیں کہ مسلمانوں کے جائز حقوقِ اکثریت اور صوبے کے قابل قدر تعمیری کاروبار کو گزند پہنچانے کے لئے کیا کیا سازشیں کی جا رہی ہیں .... اس قیاس کو درست مان لینے کی صورت میں (یعنی یہ کہ اس سازش میں مسلم لیگ کے کوئی سربرآوردہ صاحب بھی شامل ہیں) یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا لیگ کے کسی ذمہ دار ممبر یا لیگ کی مجلسِ عاملہ کے ممبر کے لئے یہ زیبا ہے کہ وہ پنجاب میں مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت کو چھوڑ کر جو سارے کے سارے لیگی ہیں کانگرسیوں اور اکالیوں سے ساز باز کرے۔ اگر یہ درست ہے تو کیا پنجاب میں اس پارٹی یا اس کے قائم کردہ نظام کو کسی نقطۂ نگاہ سے بھی مسلمانوں کی نمائندہ پارٹی یا نمائندہ نظام قرار دیا جا سکے گا جس میں ۸۹ منتخب مسلم ممبروں میں سے ایک درجن کے قریب مسلمان شامل ہوں گے۔"

مسلمانوں کے حقوق۔ لیگ کی سرفرازی۔ ملت کی مرکزیت۔ اجتماعی زندگی تشتت وافتراق سے احتراز۔ یہ وہ مسائل ہیں جن کے متعلق ہمارا مسلک بالکل واضح ہے۔ لہٰذا ہمارے متعلق ایک ثانیہ کے لئے بھی یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ ہم کسی ایسی سازش یا تحریک کے حامی ہو سکتے ہیں جو لیگ کی نمائندگی اور ملت کی اجتماعیت و مرکزیت میں کسی قسم کی رخنہ اندازی کا موجب ہو۔ ہم سے بڑھ کر ایسے شخص یا ایسی جماعت کا مخالف کوئی اور نہیں ہو سکے گا۔ لیکن ہم اس موقر جریدہ کی خدمت میں بادب گذارش کریں گے کہ وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر ذرا خدا کے لئے سوچیں تو سہی کہ کیا پنجاب کی موجودہ حکومت کو حقیقی معنوں میں مسلم لیگی اور مسلمانوں کی نمایندہ حکومت قرار دیا جا سکتا ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں کہ مسلم لیگ اور اس کے نصب العین کی سب سے زیادہ ٹھوس (لیکن نقاب پوش) مخالفت آج پنجاب کی اسی لیگی حکومت سے ہو رہی ہے؟ کیا حکومتِ پنجاب کے لیگی وزراء نے آج تک لیگ کی قوت واستحکام کے لئے ایک لفظ بھی زبان سے نکالا؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ گاندھی جی کے سوراج کی طرح سرسکندر حیات خاں صاحب کے "نظریہ پاکستان" کا

آجتک کوئی تعریف (Defintion) نہیں ہوسکی! ابھی کل ہی مسٹر منشی جیسے پاکستان کے متشدد مخالف نے کھلے کھلے الفاظ میں مسٹر جناح سے کہا ہے کہ سر سکندر حیات خان صاحب پاکستان کے مخالف اور اکھنڈ ہندوستان کے حامی ہیں۔ (ہندوستان ٹائمز ۱۱/۸) اور سر سکندر کی طرف سے اس کی تردید میں، ایک لفظ بھی شائع نہیں ہوا! اس کے برعکس سر سکندر حیات خاں صاحب نے ابھی ابھی سونی پت کی تقریر میں اپنے اس پرانے نظریہ کو دہرایا ہے جس کے متعلق ہندوستان ٹائمز جیسے اخبار نے اپنے مقالۂ افتتاحیہ میں لکھا ہے کہ سر سکندر کی یہ اسکیم ہمیں تو منظور ہے لیکن کیا یہ مسلم لیگ کے نزدیک بھی قابلِ قبول ہوگی جس کا نظریۂ پاکستان اس سے بالکل جُداگانہ ہے۔" (ہندوستان ٹائمز ۲۳ نومبر ۱۹۴۲ء) اور کیا یہ واقعہ نہیں کہ اتحاد پارٹی کی اس حکومت کے ایک وزیر (سر چھوٹو رام صاحب) نے اپنی زندگی کا نصب العین پاکستان کی مخالفت قرار دے رکھا ہے اور ان کے خلاف اس پارٹی یا "لیگی حکومت" کی طرف سے کبھی ایک آواز احتجاج کی بلند نہیں ہوئی؟ کیا سر چھوٹو رام صاحب نے اکھنڈ ہندوستان کانفرنس (منعقدہ لدھیانہ) کو بذریعہ تار پاکستان کی مخالفت اور اکھنڈ ہندوستان کی موافقت کا پیغام نہیں بھیجا؟ (ہندوستان ٹائمز ۱۱/۸) کیا لیگی حکومت اسی کا نام ہے! کیا مسلمانوں کے حقوقِ اکثریت کا تحفظ اسی طرح ہوا کرتا ہے! کیا آج کوئی دیدہ ور پنجاب کی مسلم لیگ کو زندہ جماعت قرار دے سکتا ہے! کیا جب حالت یہ ہو تو ایسی جماعت کے تحفظ و بقا کے لئے مسلمانوں سے "حقوقِ اکثریت" اور نمائندگیٔ لیگ کے نام پر اپیل کرنا کوئی وجہ جواز اپنے اندر رکھتا ہے! یہ طرزِ عمل موجودہ حکومتِ پنجاب کی حقیقی بہی خواہی نہیں۔ حقیقی بہی خواہی یہ ہے کہ ان حضرات کو بتایا جائے کہ ان کی اس موجودہ "خنکرے بودن و ہمرنگِ مستاں زیستن" کی روش سے مسلمان کس قدر بیزار ہیں۔ انہیں آگاہ کیا جاتے کہ لیگ کی نمائندگی فقط لیگ کا لیبل چسپاں کر لینے سے نہیں بلکہ دل سے لیگ کے ساتھ رہنے میں ہے۔ انہیں کہا جائے کہ وہ جب تک مسلمانوں کے مفاد کو اپنے ذاتی مفاد پر ترجیح نہ دیں گے مسلمان دل سے کبھی ان کے ساتھ نہ ہوسکیں گے۔ سازش کو ناکام بنانے کا یہ طریقہ ہے۔ نہ یہ کہ ۸۹ کے اعداد گن کر انہیں لیگ کی نمائندہ جماعت قرار دے دیا جائے۔ یقین مانئے۔ مسلمانوں کو نہ پنجاب کی موجودہ حکومت سے کسی قسم کا بیر ہے نہ اراکینِ حکومت سے کسی

قسم کی دشمنی - انھیں دشمنی اور اختلاف ہے تو اس طرزِ عمل سے جو ان حضرات نے لیگ کے بارے میں اختیار کر رکھا ہے - وہ اپنی روش کو آج صحیح خطوط پر منتقل کرلیں مسلمان ان کے دست و بازو ہوں گے -

باقی رہے مبینہ سازش کے عناصر - سو ان میں اگر کوئی لیگی حضرات بھی ہیں تو ہم ان کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ وہ جو قدم بھی اٹھانا چاہیں لیگ کی منظوری اور جناب جناح کے مشورہ سے اٹھائیں - ان کا انفرادی فیصلہ خواہ ان کی دانست میں کتنا ہی ملتِ اسلامیہ کے مفاد کے لئے کیوں نہ ہو ملت کی نگاہ میں پسندیدہ نہیں ہوگا تاوقتیکہ اس کے ساتھ مرکزی لیگ کی حمایت شامل نہ ہو -

جوئے رَواں

باسمہ

برادرِ مکرم - سلام مسنون

کون سا مسلمان ہے جو یہ عقیدہ نہیں رکھتا کہ اس کے لئے دین و دنیا کی گراں بہا متاعِ عزیز قرآن کریم ہے۔ لیکن کتنے مسلمان ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ قرآن کریم انھیں زندگی کی کشمکش میں کون سی راہ دکھاتا ہے ؟

کچھ عرصہ پہلے مسلمان کو اس کا احساس ہی بہت کم تھا کہ وہ معلوم کرے کہ قرآن کریم کس شاہراہِ مستقیم کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ لیکن آج اس کا احساس پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے۔

یہی وہ احساس ہے جس نے یہ خلش پیدا کی ہے کہ قرآن کریم کو سمجھا جائے۔ خلش پیدا ہو چکی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس خلش کی تسکین کا سامان میسّر نہیں آتا۔

تسکین کے متلاشی یہ چاہتے ہیں کہ زندگی کی عملی ضروریات اور دورِ حاضرہ کے پریشان کن مسائل کے متعلق کوئی بات اُن کے ذہن میں آسکے۔ قرآن کریم کی تمام و کمال تعلیم۔ ایک مربوط۔ دلکش اور واضح مضمون کی صورت میں ان کے سامنے ہو جو اُن کی قلبی و ذہنی خلش کے لئے سکون اور رُوح کیلئے بالیدگی کا باعث بنے۔

یہی وہ احساس تھا جس سے متاثر ہو کر ہمارے محترم جناب **چودھری غلام احمد صاحب پرویز** نے آج سے قریب ۱۲ برس پیشتر ایک ایسے قرآنی انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب کی ابتدا کی جس میں وہ سب کچھ ہو جس کی تلاش ہے اور عرصۂ دراز کی دماغ سوزی۔ دیدہ ریزی۔ جگر کاوی اور کوہ کنی کے بعد بتوفیقِ ایزدی اس

جوئے رواں

کو صحنِ گلستانِ ملت تک لے آنے میں کامیاب ہو گئے۔ یعنی جو مراحل آپ کو طے کرنے تھے وہ آپ کی خاطر

بنڈ ڈایل نمبر 4240

نھوں نے نظے کر دیتے۔ چنانچہ ان کی محنت کا ماحصل اور تدبر فی القرآن کا نتیجہ یعنی اہم عظیم المرتبت انسائیکلوپیڈیا

معارفُ القرآن

کی جلد اول چھپ کر سامنے آگئی۔ کتاب کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کسی غائبانہ تعارف سے نہیں لگایا جا سکتا۔ کتاب دیکھنے سے ہی معلوم ہو سکتا ہے کہ — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

جناب پرویز اپنے خداداد فہم قرآن اور دلکش اسلوب بیان کے لئے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ہزارہا "مغرب زدہ" نوجوان ان کے گراں قدر مضامین کے تصدق مذہب سے والہانہ شیفتگی پیدا کر چکے ہیں جو اُن کیلئے وجہ سعادت اور ملت کے لئے موجب رحمت ہے۔

معنوی حیثیت کے علاوہ صوری حیثیت سے بھی کتاب جناب مؤلف کے حسن ذوق کی آئینہ دار ہے۔ بڑی تقطیع کے ۵۰۰ صفحات پر مشتمل۔ کتابت۔ طباعت۔ ٹائیٹل جنت نگاہ۔ کاغذ عمدہ، جلد خوبصورت مضبوط اور مُطلا۔ مجلّد کتاب کارڈ بورڈ کے بکس میں محفوظ — اور قیمت :-

بلا جلد	پانچ روپیہ	محصول ڈاک ۱۳؍
مجلّد	ساڑھے چھ روپیہ	محصول ڈاک ایک روپیہ

(ابتداء میں مجلد کی قیمت ۶/۸ روپیہ تھی۔ لیکن جلد سازنے دوسری مرتبہ اسی قیمت میں اس پایہ کی جلد تیار کرنے سے انکار کر دیا۔ اس لئے جلد میں مہر کا اضافہ کرنا پڑا)

جلدی منگا لیجیے کہ ایسی کتابیں روز روز نہیں چھپا کرتیں۔

ملنے کا پتہ :- (۱) لاہور — ملک رشید الدین صاحب۔ سپرنٹنڈنٹ پنجاب کوآپریٹو یونین ۱۳ لورمال

(۲) نئی دہلی — (۱) ۱۵ نور جہاں روڈ

(۳) دفتر طلوع اسلام۔ شمیم منزل بشیدہ لورہ۔ قرول باغ دہلی

آپ کا بھائی

(آخوندزادہ) حسین امام ناظم ادارہ طلوع اسلام
ناشر معارف القرآن

طلوع اسلام
اپریل و مئی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا

ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

دہلی

دورِ جدید

مرتب
سید اخوندزادہ حسین امام

بدل اشتراک
سالانہ پانچ روپیہ 5/
ششماہی تین روپیہ 3/
فی پرچہ آٹھ آنے 8/

جلد ۵ شمارہ (۴ و ۵)

ربیع الاول و ربیع الثانی ۱۳۶۱ھ ہجری مطابق اپریل و مئی ۱۹۴۲ء

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
مرکزِ ملت
لا الٰہ الا اللہ
محمد رسول اللہ
مرکزِ ملت
فلا وربک لا یؤمنون حتیٰ یحکموک فیما شجر بینہم ثم لا یجدوا فی انفسہم حرجاً مما قضیت ویسلموا تسلیماً
مرکزی فیصلوں کی اطاعت ہی ایمان ہے
یاایہا الذین اٰمنوا
اعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا
اللہ کی رسی کو سب کے سب مضبوطی سے تھام لو اور اس سے علیحدہ مت ہو
استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم
یعنی
مرکز۔ مرکز کی اطاعت اور جماعت پیدا کرو
اس لئے کہ
جو جماعت سے علیحدہ ہوا وہ جہنم میں گیا
جماعت کے بغیر اسلام کچھ نہیں!
علیکم بالجماعۃ فانہ من شذ شذ فی النار
(فرمانِ رسولؐ)
لا اسلام الا بالجماعۃ
(قول حضرت عمرؓ)
اقبالؒ
چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ
با ہزاران چشم بودن یک نگاہ
بگذر از بے مرکزی پایندہ شو

۱۲ ربیع الاوّل

کوثر چکد از لبم بایں تشنہ لبی ! خاور دمد از شبم باایں تیرہ شبی
اے دست ادب! کہ حریم پاک است شاہنشاہ انبیاء ۔ رسولِ عربی

حسُن کے ذوقِ نمود نے انگڑائی لی ۔ خطیرہ قدس کی ملکوتی فضا میں ہلکا سا تموّج ہوا ۔ ملاءِ اعلیٰ کے حریمِ ناز کے حریری پردوں میں غیر محسوس سی جنبش نظر آئی ۔ بربطِ عدم کے خاموش تاروں میں نورانی ارتعاش سا محسوس ہوا ۔ فرشتوں کی معصوم نگاہیں اوپر کو اٹھیں ۔ "سبوحٌ قدوس" کی بے صوت صدائیں، نور و نگہت کے رنگین ترشح کی صورت میں زمزمہ ریز نغمہ بار ہوئیں ۔ دور جانبِ عرشِ عظیم سے کُن کی جبروتی آواز نے اس طلسمِ سکوت کو توڑا ۔ عدم کے پردے اٹھنے لگے اور افق سے اُس پار ۔ عالمِ تصوّر سے نگار خانۂ کائنات نے خاموشی سے ابھرنا شروع کیا ۔ سائنسدان نے اسے حرکت و حرارت سے تعبیر کیا ۔ فلاسفر نے حلقۂ دامِ خیال قرار دیا ۔ عشق نے جلوۂ یکتائے محبوب کہا ۔ اربابِ قضا و قدر نے ایک متعین پروگرام کا نقطۂ اولیں بتایا ۔ مذہب نے امرِ تکوین کا کرشمۂ حیرت زا نام رکھا ۔ اور قلبِ سلیم نے مشیت ایزدی سمجھکر سر جھکا دیا ۔

ہیولائے کائنات ابھرنے کو تو ابھرا لیکن بڑا بے کیف اور بہت بے رنگ ۔ آہستہ آہستہ اس کے بکھرے ہوئے ذرّوں میں ربط و ضبط پیدا ہونا شروع ہوا ۔ ربط و ضبط سے اس خاکہ میں کچھ رنگینیوں کے آثار محسوس ہونے لگے ۔ منتشر رنگینیوں نے آہستہ آہستہ متشکل ہونا شروع کیا ۔ بکھری ہوئی شوخیاں سمٹ کر بجلیاں بننے لگیں ۔ جنت کی حوروں نے کنکھیوں سے باہم اشارے کئے ۔ نوامیسِ فطرت کی نگاہوں میں ہلکا سا تبسم پیدا ہوا ۔ حریم قدس کے رازداروں نے کانوں ہی کانوں میں کچھ کہا سنا ۔ زمین کانپی ۔ آسمان تھرتھرایا ۔ چاند کا ساغرِ زریں چھلک گیا ۔ ستاروں کے ننھے ننھے دل ہل گئے ۔ فضا میں ایک شور اٹھا اور

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور خود گرے ۔ خود شکنے ۔ خود نگرے پیدا شد

حوروں نے نغمۂ تبریک گایا ۔ فرشتوں نے سر جھکایا ۔ ارض و سمٰوات نے اپنی باجگزاری کا خریطہ پیش کیا ۔

ابلیس نے مقابلہ کا چیلنج دیا۔ اور یوں یہ عالمِ بے کیف۔ دنیائے رنگ و بُو اور جہانِ سوز و ساز بن گیا۔

ابلیسانہ سرکشی اور ملکوتی تسلیم و رضا کی یہی کشمکش تھی جو اس کی خودی کے استحکام اور اس کے جوھر انسانیت کے ارتقاء کا موجب بنی اب درحقیقت اس پروگرام کا پہلا دور شروع ہوا جس کے پیش نظر یہ تمام ابتدائی مراحل یوں طے ہوئے تھے۔ ابلیسانہ قوت کی تائید میں کشش و جاذبیت کے وہ تمام نگاہ فریب سامانِ رنگ و تعطر تھے جو اس نگارخانہ طلسم و حیرت کے دامن میں بھر کر رکھدئے گئے تھے اور اس کے خلاف اس پیکر خودی کے رشد و ہدایت کے لئے وہ پیغامِ ازلی جو مبدا رفیض کی کرم گستری سے وقتاً فوقتاً اس کے پاس پہنچتا رہا۔ اس پیغام کی لِم ایک تھی۔ حقیقت ایک تھی۔ لیکن جوں جوں اس طلسم خانۂ فسون و فریب کی جاذبتیں بے نقاب ہوتی جاتی تھیں۔ ان کے مقابلہ کے لئے اس اصول کی فروعات میں مناسب رد و بدل اور ضروری اضافہ ہوتا جاتا تھا تاکہ اس کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ جوہر انسانیت کا ارتقاء ہوتا رہے۔ یا ارتقائی مدارج تکمیل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ رہروانِ شوق کا یہ قافلہ سوئے منزل جادہ پیما تھا۔ ان کا ہر قدم ایک خاص سمت اٹھتا اور ہر نشانِ راہ ایک نقطۂ آخریں کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ چنانچہ ان آنے والوں میں سے جو کوئی اپنے منصب کی تکمیل کے بعد واپس جاتا تو جاتے وقت ایک آخری آنے والے کا پتہ۔ نشان بتا کر جاتا۔ تاکہ جب وہ آنے والا آئے تو یہ قافلہ فوراً اس کے پیچھے ہولے اور راہ گم کردہ مختلف وادیوں میں سرگرداں و حیران نہ پھرتا رہے۔ آج سے قریب ساڑھے تین ہزار برس اُدھر جب سینا کے مقدس میدانوں سے ایک عظیم المرتبت پیغامبرؑ اپنا منصبِ جلیلہ ادا کر کے جانے لگا تو اہلِ قافلہ کو اسکی زبان سے سنا دیا گیا کہ

"تیرا خدا۔ تیرے لئے۔ تیرے بھائیوں میں سے۔ تیرے مانند ایک نبی بھیجے گا۔ تو اس کو مانیو۔ میں اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا" (توریت کتاب پنجم۔ باب اٹھارہ)

شام و فلسطین کی وادیوں میں کوئی تین ہزار سال پیشتر حضرت داؤدؑ کے نغماتِ لاہوتی میں یہ صدائے ملکوتی بلند ہوئی کہ

"تیرا برگزیدہ بندہ۔ جس کی طرف سے میرا جی راضی ہے پورب کی طرف سے اٹھے گا" (زبور)

اور ان کے پرشکوہ و صاحب سطوت جانشینؑ نے اس آنے والے کے نشانات بتا کر کہا کہ

"اے یروشلم کی بیٹیو! یہ ہے میرا دوست۔ میرا محبوب" (غزل الغزلات باب ۵)

پھر اسی یروشلم میں آج سے قریب دو ہزار سال اُدھر ایک خدائی گڈریاؑ نے اپنے گلہ کی منتشر بھیڑوں کو اکٹھا کر کے کہا کہ میں اب جا رہا ہوں۔

"لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اب میرا جانا ہی اچھا ہے اس لئے کہ اگر میں نہ جاؤں گا تو (دنیا کو) تسلی دینے والا تمہارے پاس نہیں آئے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب وہ صداقت کی روح تمہارے پاس آئے گی تو وہ تمہیں سچائی کی طرف رہنمائی کرے گا۔ اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہے گا بلکہ جو کچھ وہ سنے گا وہی کچھ کہے گا۔ اور وہ تمہیں آنے والی باتوں کی خبر دے گا" (یوحنا۔ باب ۱۶)

اور انجیل برنباس (فصل ۴۴) میں اس آنے والے کے متعلق ہے۔

وہ کیسا مبارک زمانہ ہے جس میں یہ رسول دنیا میں آئے گا۔ تم مجھے سچا مانو۔ ہر آئینہ میں نے اسے دیکھا اور اس کے سامنے عزت و حرمت کو پیش کیا ہے۔ جیسا کہ اس کو ہر ایک نبی نے دیکھا ہے کیونکہ اللہ ان (نبیوں) کو اس (رسولؐ) کی روح بطور پیشگوئی کے عطا کرتا ہے۔ اور جب کہ میں نے اسے دیکھا میں تسلی سے بھر کر کہنے لگا اے محمدؐ اللہ تیرے ساتھ ہو اور مجھ کو اس قابل بنائے کہ میں تیری جوتی کا تسمہ کھولوں۔ کیونکہ اگر میں یہ شرف حاصل کر لوں تو بڑا نبیؑ اور اللہ کا قدوس ہو جاؤں گا"

سرزمین ایران میں اسی طرح ایک جانے والے (جناب زرتشت) نے اپنے جانشین (جاماسپ) سے کہا کہ سن رکھو کہ

"اولاد ہاشم میں ایک بزرگ پیدا ہوگا۔ دعوائے نبوت کرے گا۔ اس کا مذہب سات ولایتوں میں جائے گا۔ اولاد نرینہ نہ رہے گی۔ البتہ لڑکی سے نام چلے گا۔ تاج کی جگہ سر پر عمامہ رکھے گا۔ آتشکدے اس کے حکم سے بند کر دئے جائیں گے"

ہندوستان کی سرزمین میں گوتم بدھ نے اپنے چیلے آنند سے جاتے وقت کہا کہ غمگین ہونے کی کوئی بات نہیں۔ میرے بعد کئی بدھ آئیں گے۔ آخری بدھ کا نام تیریا (محمدؐ) اور لقب متیا (رحمت) ہوگا۔ گنگا کی وادیوں میں بسنے والوں کے نام بھی ان کی کتاب کلکی پوران میں ایک پیغام موجود ہے کہ

کلجگ میں سانبل دیپ میں جگت گرو پیدا ہونگے۔ باپ کا نام وشنو بھگت (عبداللہ) اور ماں کا نام سومتی (آمنہ) ہوگا۔ تاریخ پیدائش ۱۲ بیساکھ۔ پیر کا دن۔ دو گھڑی دن چڑھے۔ پہلے باپ کا انتقال ہوگا پھر ماں کا۔ جگت گرو سانبل دیپ کی رانی سے شادی کریں گے۔ ایک پہاڑ کی کھوہ میں تپسیا کریں گے۔ پرش رام (روح اللہ) سے تعلیم پائیں گے بستی میں آکر تبلیغ کریں گے تو لوگ تکلیف دیں گے اور جگت گرو شمالی پہاڑوں کی طرف ہجرت کر جائیں گے۔ وہاں سے تلوار لیکر

پھر اس بستی کو آئیں گے۔ ملک فتح ہو جائے گا۔ جگت گرو کا ایک گھوڑا ہوگا۔ برق سے زیادہ تیز چلے گا۔ اس پر سوار ہو کر آپ کل زمین اور سات آسمانوں کی سیر کریں گے۔"

یہ وہ نشانات راہ ہیں جو ان بچے کھچے آثار قدیمہ میں ملتے ہیں جو آج کھنڈرات کی شکل میں یہاں وہاں پائے جاتے ہیں اور جن میں حوادث زمانہ نے معلوم کیا کیا تغیرات پیدا کر دئے ہیں۔ اگر یہ یادگاریں آج کہیں اپنی اصلی شکل میں موجود ہوتیں تو خدا جانے ان میں اس جلیل المرتبت آنے والے کے متعلق کن کن درخشندہ اور نکھرے ہوئے الفاظ میں کتبے آویزاں نظر آتے۔ اس لئے کہ یہ سب ایک ہی سلسلۂ زریں کی مختلف کڑیاں تھیں جن میں کی ہر کڑی۔ سلسلہ کی آخری کڑی کی روشن دلیل تھی۔ یہ سب ایک ہی کتاب فطرت کے مختلف اوراق و ابواب تھے جن میں کا ہر ورق اور ہر باب کتاب کے آخری باب کی گویا تمہید تھی۔ یہ سب ایک ہی شجر طیبہ کی شگفتہ شاخیں تھیں جو ایک گل سرسبد کے لئے نوید بہار تھیں۔ پھر جب مشیت ایزدی کی یہ محکم تدبیر جس کے لئے زمین اور آسمان قرنہا قرن سے یوں سرگرداں پھر رہے تھے۔ اپنی پختگی تک پہنچی۔ جب انسانیت جس کے لئے کائنات کے ایک ایک ذرہ کو لاکھوں چکر دئے گئے تھے۔ گہوارۂ طفولیت سے نکل کر حریم شباب میں پہنچی۔ جب اس صحیفۂ فطرت کی تکمیل کا وقت آیا جس کے مختلف اوراق ستاروں کی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی میں کوثر و سلسبیل سے دھلے ہوئے قلم سے لکھے گئے تھے۔ جب سینۂ کائنات میں اتنی کشادگی آگئی کہ وہ اپنے اندر رازہائے درون پردہ کے معدن لعل و گہر کو سمو لے۔ تو آسمان کی حوریں زمین پر اتریں کہ جنت کی پھول پتی سے بطحا کی وادیوں کی تزئین و آرائش کریں۔ صحن گلستان کائنات پر بہار آئی۔ چاروں طرف سے مسرتوں کے چشمے ابلنے لگے۔ چاند مسکرایا۔ ستارے ہنسے۔ آسمان سے نور کی بارش ہوئی۔ فرشتوں کی معصوم آنکھوں میں انی اعلم ما لا تعلمون کی تفسیر ایک پیکر محبوبیت بن کر چمکنے لگی۔ فلک تعظیم کے لئے جھکا۔ زمین نے اپنی خاک آلود پیشانی سجدہ سے اٹھائی کہ آج اس کی قرنہا قرن کی دعاؤں کی قبولیت کا وقت آپہنچا تھا۔ صحرائے حجاز کے ذرے چمکے۔ بلد الامین[۵] کی گلیوں کا نصیبہ جاگا کہ آج اس آنے والے کی آمد آمد تھی جس کے لئے جبل تین پر حضرت نوحؑ نے اپنے رب کو پکارا۔ جسے کوہ زیتون پر جناب مسیحؑ نے اپنے حواریوں کو وجہ تسکین خاطر بتایا تھا جس کی آمد کی خبریں وادی طور سینین میں اسرائیلیوں کو دی گئیں

---

[۵] والتین والزیتون وطور سینین وھذا البلد الامین

اور جس کے لئے دشتِ عرب میں حضرتِ خلیل اکبر اور ذبیح اعظم (علیہما السلام) نے اپنے خدا کے حضور میں دامن پھیلایا تھا۔ وہ آنے والا کہ جس کے انتظار میں زمانہ نے لاکھوں کروٹیں بدلی تھیں۔ آیا اور اس شانِ زیبائی و رعنائی سے آیا کہ زمین و آسمان میں تہنیت کے غلغلے بلند ہوئے۔ فرشتوں نے زمزمۂ تبریک گایا۔ سدرۃ المنتہیٰ کی حدود فیض پوش شاخوں نے جھولا جھلایا۔ ملاءِ اعلیٰ کی مقدس قندیلوں نے چراغاں کیا۔ کائنات کے ذرّے ذرّے چمک اٹھے فضائے عالم درود و صلوٰۃ کی فردوسِ گوش صداؤں سے گونج اٹھی۔ اور شجر و حجر پکار اٹھے کہ

اللّٰھمّ صلّ علیٰ نبیّنا محمّدًا و بارک و سلّم

یہ آنے والا (صلعم) رسول کافۃ للنّاس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل و حریت لایا جس نے نوعِ انسانی کی تمام زنجیروں کو کاٹ کر اس رشتہ بر پا طائر لاہوتی کو آسمان کی فضائے بسیط میں اذن بال کشائی عطا کر دیا۔ لیکن افسوس کہ انسانوں نے اپنے اس محسنِ اعظم کی صحیح منزلت کو نہ پہچانا۔ ان شوریدہ بخت شپرہ چشموں کو چھوڑیئے جنھوں نے اس نورِ مبین کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ انھیں لیجئے جنھوں نے دنیا کے سامنے حضورؐ کی عظمت کا اعتراف کیا تو اس انداز سے کہ کسی نے "عرب کا ہیرو" قرار دیا۔ کوئی آگے بڑھا تو اس نے اس آفتابِ جہانتاب (اس سراجاً منیراً) کو صرف "مسلمانوں کی قوم" کے صحنِ خانہ کا چراغ سمجھا۔ کسی نے یہ نہ جانا کہ سورج کسی خاص چار دیواری میں بسنے والوں کے لئے وجہ روشنی نہیں ہوتا بلکہ ہر اس شخص کے لئے چشمۂ نور ہوتا ہے جو اپنی آنکھیں کھول کر اس سے مستنیر ہونا چاہے۔ چھوٹے چھوٹے دئے اپنے اپنے گھروں کے دئے ہوتے ہیں لیکن مہرِ عالمتاب ساری دنیا کا مشترکہ سورج ہوتا ہے۔ حضرت عیسےٰؑ و موسےٰؑ کے ماننے والوں اور جناب بدھ اور کرشن کے بھگتوں کو (حضور سرورِ کائنات) محمدؐ رسول اللہ کی ضیاء پاشیوں سے آنکھیں نہیں بند کر لینی چاہئے تھیں کہ محمدؐ کا لایا ہوا پیغام کوئی انوکھا پیغام اور ان کی دی ہوئی تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی۔ وہ اس کتابِ مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمدؐ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام پر بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ محمدؐ میں اتاری گئی۔ مشام جاں نوازنے جہاں کہیں بھی عطر بیزی و عنبر فشانی کی۔ وہ لالہ و یاسمین کی انہی پتیوں کے تصدق تھی جن کے مجموعے کا گلدستہ حضور خاتم النبیینؐ کے دستِ اقدس سے محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدیؐ کیا ہے؟ انہی مقدس اوراق کی شیرازہ بندی ہے جنھیں آندھی کے تیز جھونکوں نے صحنِ کائنات میں ادھر ادھر بکھیر دیا تھا۔ ان کی از سرِ نو شیرازہ بندی اور قیامت تک کے لئے اقتضاآتِ زمانہ کے مطابق تکملہ کہیئے کہ اس سے انکار کی کیا وجہ

اور اعتراض کا کیا باعث ؟ لوگوں نے یہ نہیں سمجھا کہ جب جناب گوتم کا دل ایک اپاہج کو دیکھ کر تڑپ رہا تھا اور حضرت مسیحؑ کوڑھیوں کی تکلیف کے احساس سے نم چشم تھے تو وہ بھی درحقیقت مقام محمدی ہی کے آئینہ جمال کا پرتو تھا اور جب حضرت موسٰیؑ اپنی غلام قوم کو فرعون کے استبداد سے نجات دلانے کے لئے مصروف پیکار تھے اور حضرت یوسفؑ اپنے قید خانہ کے رفیقوں کو متعدد آقاؤں کی غلامی سے نکل کر ایک خدائے قہار کی محکومیت کا وعظ ارشاد فرما رہے تھے ....

تو اس وقت بھی مقام محمدی ہی کے آفتاب جلال کی جلوہ انگنی تھی۔ جب زرتشت اپنے جانشین جاماسپ کو بقائے دوام حاصل کرنے کے لئے سوز نفس کے رازوں سے آگاہ کر رہے تھے اور حضرت خلیل اکبرؑ عشق کی راہ میں اپنے بیٹے کے گلے پر چھری رکھ رہے تھے۔ تو وہ بھی اسی مقام محمود کی ضیاء پاشیاں تھیں۔ غرضیکہ جہاں جہاں کوئی آسمانی حقیقت تھی تو وہ قرآن ہی کے کسی نہ کسی صفحہ کی کوئی سطر تھی اور جہاں جہاں ان حقائق کے علمبردار حضرات کے اعمال زندگی تھے وہ حامل قرآن کی سیرت مقدسہ کے کسی نہ کسی پہلو کے آئینہ دار تھے۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو	آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نور مصطفٰےؐ او را بہاست	یا ہنوز اندر تلاش مصطفٰےؐ است

وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے اور یہاں یہ پیکر جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے اور یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرع میں آب و تاب سے موزوں ہو گئے جو ضمیر کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا اور جو مصرعہ ثانیہ کا محتاج نہ تھا۔ وہ موتی تھے یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں یہ پھول تھا۔ وہ ذرّے تھے یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے یہ کہکشاں تھا۔ وہ افراد تھے یہ ملت تھا۔ وہ نقطے تھے یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتدا تھی یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمتہ للعالمینی انتہاست !

حقیقت یہ ہے کہ انسانیت ابھی ان بلندیوں تک پہنچی نہیں جہاں وہ مقام محمدی کی ماہیت سے آگاہ ہو سکے ایک طرف اس ذات اقدس و اعظم (فداہ ابی و امی) کی عظمت اور حضورؐ کی وساطت سے ملے ہوئے پیغام کی رفعت کو دیکھئے تو تصور سر بگریباں ہو جائے۔ ذرا اندازہ فرمائیے کہ مصورِ کائنات نے بلندیوں اور پستیوں کو کتنے چکر دئے کہ اس کے بعد یہ حسین و جمیل شاہکار وجود میں آیا۔ مصنف صحیفہ فطرت نے کس قدر

نادر مضامین کی تسوید و تبئیض کی جو یہ آخری پیغام متشکل ہوا ۔ دوسری طرف اس پیغام حیات پرور کی عالمگیر وسعتوں پر نگاہ ڈالئے تو تخیل انگشت بدنداں رہ جائے ۔ کسی ایک خطہ ۔ ایک ملک ۔ ایک براعظم ۔ ایک فرد ایک جماعت ۔ ایک قوم کی راہ نمائی کے لئے نہیں بلکہ تمام کرۂ ارض پر بسنے والے انسانوں کے لئے ضابطۂ حیات اور پھر کسی خاص وقت ۔ خاص ماحول ۔ خاص زمانہ کے لئے نہیں بلکہ قیامت تک کے لئے نصاب زندگی کیسا ما پید اکنار ظرف تھا اُس قلبِ منورؐ کا جو ایسے زمان و مکان کی حدود سے بلند و بالا پیغام کا مہبط قرار پایا ۔ اور علم صحیحہ کے کس افق اعلیٰ پر مقام تھا اس معلم الحکماء ذات گرامی کا جس کا ادراک گنجینۂ حقائق کائنات تھا انسانوں نے اس آفتاب علم و حقیقت سے اعتراض برت کر دیکھ لیا ۔ یہ جہنم اور اس کے آسمانی شعلے سب اس انکار و جحود کا نتیجہ ہیں ۔ ان مصائب و نوائب اور اس کرب و الم سے نجات کا طریقہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انسان مقام محمدیؐ سے آگہی پیدا کرے اور پیام محمدؐ کو زندگی کا نصب العین بنائے اور اس بارگاہ عالیہ پر جا کر جھکی ہوئی نگاہوں اور لرزتے ہوئے قلب سے اعتراف کرے کہ

نہ جہاں میں مجھ کو اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی!
میرے جرم ہائے سیاہ کو تیرے عفو۔ بندہ نواز میں
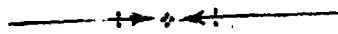
—— ⊹ ——

بیسویں صدی کا آغاز ہے۔ مشرق کی تہذیب و تمدن کے ٹمٹمانے والے آخری چراغ بھی گل ہو چکے ہیں۔ مغرب نے ایک نئے نظامِ تمدن کی طرح ڈالی ہے جس کی درخشندگی اور تابناکی نے بڑے بڑے دیدہ وروں کی نگاہوں میں خیرگی پیدا کر رکھی ہے۔ دنیا بھر کی قومیں اس تہذیبِ جدید کی نقالی میں فخر و سعادت محسوس کر رہی ہیں۔ جلیل القدر دانایانِ روزگار اس نئے تمدن کو انسانیت کے مصائب و نوائب کے لئے مسیحا سمجھ رہے ہیں۔ بڑے سے بڑے مفکر انسانی دانش و بینش کے اس اوجِ کمال پر نازاں و فرحاں دکھائی دیتے ہیں۔ ہر طرف سے اس نئی روشنی کی مدح و ستائش میں قصائد لکھے جا رہے۔ چاروں سمت سے تحسین و تبریک کے غلغلے بلند ہو رہے ہیں۔ چھوٹے بڑے اس نسخہ کیمیا کی برکات کے معترف ہیں ایسا دکھائی دیتا ہے گویا انسان نے اس فردوس گم گشتہ کو پھر سے پا لیا جس کی تلاش میں اسے ساری عمر دشت پیمائیوں اور صحرا نوردیوں میں گذار دی تھی۔ نئے انداز کی سیاست۔ نئی وضع کی معاشرت معیشت کے طور طریق نرالے تعلیم کے ڈھب انوکھے۔ تمام نظام ہائے کہنہ کی بنیادیں تک اکھڑ چکی ہیں اور نئے نقشوں کے مطابق۔ بالکل جدید بنیادوں پر اس تہذیبِ نو کے قصرِ فلک بوس کی عمارت اوپر کو اٹھتی چلی جا رہی ہے جس کی رفعت و بلندی۔ نقش و نگار۔ آئینہ بندی۔ حریر و اطلس کے نگاہ فریب پردے۔ بجلی کے قمقمے اور ان قمقموں کی عالمتاب روشنی میں ایک رنگین دنیا۔ ہر دیکھنے والے کی نگاہ کو حیرت کدہ بنا رہی ہے۔ کہ اتنے میں مشرق کے تیرہ و تار ویرانوں کا ایک تیس سالہ نوجوان اس طلسم خانۂ ہوشربا میں جا نکلتا ہے۔ وہ تہذیبِ نو کے اس جہانِ رنگ و بو میں کھویا کھویا ادھر ادھر پھرتا ہے۔ ہر شے پر ایک غائرانہ نگاہ ڈالتا ہے۔ ہر چیز کو متجسسانہ نظروں سے پرکھتا ہے۔ کہیں رکتا ہے تو پہروں کسی گہری فکر میں ڈوبا ہوا خاک کے ذروں کو ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر اٹھتا ہے تو دیوانوں کی طرح اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے۔ ہونہار ایسا ہے کہ بڑے بڑے مفکرین اسے مستقبل کا درخشندہ ستارہ قرار دیتے ہیں لیکن اس کے اس کمالِ ہوش میں کچھ ایسے غیر محسوس سے جنون کی آمیزش ہے جو اسے دوسرے ہوشمندوں سے یکسر الگ کئے ہوئے ہے۔ وہ فکر و نظر اور ہوش و جنون کے اس نرالے امتزاج سے تہذیب جدید کے اس طلسم کدہ کے ایک ایک عنصر کو دیکھتا ہے اور عین اس وقت جبکہ ساری فضا اس نظامِ تمدن کی توصیف و ستائش میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس کے لبوں پر خفیف سی ہنسی اور اس کی آنکھوں میں ہلکے سے تبسم کی

موجوں کے ہلکورے نظر آرہے ہیں۔ وہ اس پورے تماشے کو اپنی نگاہوں کے دامن میں سمیٹ کر اٹھتا ہے اور لب ساحل ایک اونچی سی چٹان پر کھڑا ہو کر پیچھے مڑکر دیکھتا اور بلند آواز سے پکارتا ہے کہ

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دوکان نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو۔ وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

اور یاد رکھو کہ :-

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

سننے والوں نے سنا اور اسے مجذوب کی بڑ سمجھ کر ایک فلک بوس قہقہہ لگایا اور اس کے بعد پھر اسی کیف و مستی کی دنیا میں جذب ہو گئے۔ یہاں پہنچنے پر پوچھنے والوں نے پوچھا کہو بھائی! حیرت خانۂ مغرب کی سیر تو کی وہاں تہذیب نو کے پری محل کو بھی دیکھا! کیا خیال ہے؟ اس نے اپنے مخصوص انداز میں نگاہوں کو اٹھایا اور کہا کہ ہاں دیکھا! چمک دمک تو بڑی ہے۔ لیکن

پیرِ میخانہ یہ کہتا ہے کہ ایوانِ فرنگ
سست بنیاد بھی ہے۔ آئینہ دیوار بھی ہے

زمانہ آگے بڑھتا گیا۔ شیشہ گرانِ فرنگ اپنے کاخِ تہذیب کی آئینہ بندی میں پہلے سے بھی زیادہ تیزی اور انہماک سے مصروف رہے۔ دنیا اسے بدستور خدا کی رحمت تصور کرتی رہی۔ انسانیت اسی طرح اس کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی۔ تاآنکہ ۱۹۱۴ء میں ایک عالمگیر دھماکہ محسوس ہوا۔ دھماکہ زلزلہ کی صورت اختیار کر گیا اور چار برس تک متواتر بستیاں ویرانوں میں تبدیل ہوتی رہیں۔ میدانوں کا ذرّہ ذرّہ انسانی خون کی ارزانی کی زندہ داستانیں بن گیا۔ لیکن مغرب نے اس کے بعد پھر اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اور اس قصرِ جدید کی تزئین و آرائش اور حفاظت و صیانت میں پہلے سے بھی زیادہ جوش اور سرگرمی سے منہمک ہو گیا۔ سطح بیں نگاہوں نے اس "ہوشمند دیوانہ" سے پھر پوچھا کہ اب کیا کہتے ہیں آپ؟ آپ کی وہ پیش گوئی تو غلط ثابت ہوئی! اس مردِ دانا کی آنکھوں میں پھر تبسم کی لہر دوڑی۔ اور اب کے پہلے سے بھی زیادہ نمایاں ہو کر دوڑی۔ اپنے مخصوص انداز میں سر اٹھایا۔ اور کہا کہ میری آنکھوں نے غلطی نہیں کی۔ میں نے جو کچھ کہا تھا۔ حرف بحرف دیکھ کر کہا تھا۔ وہ غلط نہیں ہو سکتا۔ مغرب کو یہ فطرت کی طرف سے پہلی تنبیہ ملی تھی وہ اس سے عبرت حاصل کرتے تو بچ جاتے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا اور میری آنکھیں پھر دیکھ رہی ہیں کہ

فتنۂ را کہ دو صد فتنہ در آغوشش بود　　دخترے ہست کہ در مہد فرنگ است ہنوز

سننے والوں نے اسے سنا اور سنکران سنی کردی۔ مغرب کے قمقموں کی روشنی اپنی خیرگی میں اور بھی بڑھتی گئی۔ اب ساری دنیا اس کی نقّال تھی۔ اور اس نقّالی میں فخر محسوس کرتی تھی۔ پوچھنے والوں نے پھر اس مجذوب زیرک سے پوچھا کہ فرمائیے! آپ کیا کہتے ہیں۔ اب تو اس قصرِ بلند کی رفعت کہکشاں تک جا پہنچی ہے۔ اس نے پھر ایک سیلاب تبسم سے پوچھنے والوں کی طرف دیکھا اور کہا کہ

نہ کر افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے　　کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی

الٹ جائیں گی تدبیریں۔ بدل جائیں گی تقدیریں　　حقیقت ہے، نہیں میرے تخیل کی یہ خلاقی!

دنیا نے اس پر ایک قہقہہ لگایا اور مغرب اپنی شیشہ گری اور مشرق اس کی نقالی میں پھر مصروف ہوگئی۔ اور وہ مرد زیرک پھر اپنی گہری سوچ میں ڈوب گیا مغرب نے زمین پر جال بچھالیا۔ مغرب نے آسمان پر قابو پالیا۔ اس نے پانی پر اپنا تسلّط جمالیا۔ اس نے خشکی اور تری کو مسخر کرلیا۔ اس نے اپنی حفاظت کے پورے سامان مہیا کرلئے اُدھر یہ ہوتا گیا اور ادھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس دانائے راز پر کچھ عجیب سراسیمگی کا عالم طاری ہورہا ہے وہ بیٹھا بیٹھا اس طرح چونک اُٹھتا جیسے ایک حسین و معصوم بچہ خواب میں دہشت ناک عفریت خونخوار کو دیکھکر چیخ اُٹھتا ہے۔ وہ تصورہی تصور میں کچھ دیکھتا اور یوں ڈرکر سہم جاتا جیسے آگ اور خون کا کوئی سیلاب بلا تھمتا چلا آرہا ہو۔ وہ پہاڑی کی چوٹی پر دُور افق سے اُس پار۔ کچھ دیکھتا اور بیساختہ چلّا اٹھتا کہ

شفق نہیں مغربی افق پر۔ یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے!

طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ!

وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو!

اسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ!

وہ دیکھو!　جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا۔ وہ عالمِ پیر مر رہا ہے!

جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمارخانہ!

وہ راتوں کی تنہائیوں میں اکیلا دیوانہ وار ادھر ادھر پھرتا۔ کبھی آسمان کے خاموش ستاروں سے باتیں کرتا کبھی ندی کی ساکت روانیوں سے محوِ تکلم ہوتا۔ وہ جنگل کے ویرانوں سے۔ دور شہر کی اس محفلِ شعر و شراب کی چکاچوند کو دیکھتا جسے بڑے بڑے ہوشمندوں نے باعثِ گرمی کائنات سمجھ رکھا تھا۔ تو ایک ٹھنڈی سانس بھرتا

اور اپنے سینے کے داغوں کو نمایاں کر کے پکار اٹھتا کہ

وہ بزمِ عیش ہے مہمانِ یک نفس دو نفس
چمک رہے ہیں مثالِ ستارہ جس کے ایاغ

اور — دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا
قریب آ گئی شاید جہانِ پیر کی موت

وہ کبھی کسی نخلستان کے قریب کھجوروں کے جھنڈ کے سایہ میں وجد و مستی میں رقص کرتا اور مطربِ فطرت کی لے نوازی کی ہم آہنگی میں والہانہ انداز میں گاتا نظر آتا کہ

زمانے کے انداز بدلے گئے۔
نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ
کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ

پرانی سیاست گری خوار ہے۔
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے!

گیا دورِ سرمایہ داری گیا۔
تماشا دکھا کر مداری گیا!

ایک حجازی قافلہ پاس سے گذر رہا تھا۔ سالارِ کارواں نے اس تماشہ کو حیرت سے دیکھا اور کہا کہ بابا! یہ کیا کہتے ہو۔ آؤ! تمہیں دکھائیں کہ اس تہذیب نو نے ہمارے عروقِ مردہ میں کس طرح ایک نیا خونِ زندگی دوڑا دیا ہے اس نے اس سادہ لوح میرکارواں کی بات سنی اور ہنس کر کہا کہ اے نادان!

زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر
یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لبِ گور

اس نے پوچھا کہ پھر ہوگا کیا؟ فرمایا کہ

آنچہ بود است و نباید ز میاں خواہد رفت
آنچہ بایست و نبود است ہماں خواہد بود

اس نے پوچھا کہ اس کے لئے پھر کرنا کیا چاہیئے۔ جواب ملا کہ

اگر در دلِ جہانِ تازۂ داری بروں آور
کہ افرنگ از جراحت ہائے پنہاں بسمل افتاد است

اس نے سمجھا کہ شاید دنیائے مسیحیت پھر کسی صلیبی جنگ کے ارادے کر رہی ہے۔ لیکن اس مردِ دانا نے کہا کہ نہیں۔

من از ہلال و چلیپا دگر نمی اندیشم
کہ فتنۂ دگرے در ضمیرِ ایام است

اس نے کہا کہ مغرب کے آہنی پنجے تو زمین و آسمان کو اپنی قاہرانہ گرفت میں لئے بیٹھے ہیں اس چنگل سے رستگاری بھلا کیسے ممکن ہے! مردِ قلندر ہنسا اور اس نے کہا کہ اس گرفت کی شدت بجا اور درست لیکن

پانی بھی مسخر ہے ہوا بھی ہے مسخر
کیا ہو جو نگاہِ فلکِ پیر بدل جائے

دیکھا ہے ملوکیتِ افرنگ نے جو خواب
ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے

لیکن یہ باتیں اس پوچھنے والے کی سمجھ سے باہر تھیں۔ وہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا کہ مغرب جو اس قدر بے پناہ قوتوں کا مالک ہے کبھی تباہ و برباد ہو سکتا ہے۔ وہ شوکت و سطوت۔ غلبہ و تسلّط۔ استیلا۔ و قہرمانی کے اس بحر مواج کو دیکھتا اور کانپ اٹھتا۔ وہ بھلا کیسے باور کر لیتا ہے کہ کہنے والا سچ کہتا ہے۔ لیکن کہنے والا کچھ ایسے جزم یقین سے کہہ رہا تھا گویا اس کے سامنے سینما کا ایک فلم چل رہا ہے جسے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر وہ بتاتا چلا جا رہا ہے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ اس نے اس پوچھنے والے سے کہا کہ تیری حیرت اور استعجاب درست! لیکن میں کہتا ہوں وہ بھی غلط نہیں۔

تو نے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا عروج
موجِ مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ

آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس
سامنے تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھ

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

سننے والے نے سننے کو تو سنا کہ ان باتوں میں لذت و جاذبیت بہت تھی لیکن اسے محض "شاعری" ہی سمجھا اور داد دے کر آگے بڑھ گیا۔ اس کے جاتے جاتے بھی اس مردِ قلندر نے اسے آواز دی اور کہا کہ میری باتوں کو شاعری نہ سمجھ۔ یہ حقیقت ہے۔

چشم بکشائے اگر چشمِ تو صاحب نظر است
زندگی در پئے تعمیرِ جہانِ دگر است

لیکن سننے والے نے اسے بھی شاعری ہی سمجھا اور پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر آگے بڑھ گیا۔ اس مردِ دانا نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہا

مغرب ز تو بیگانہ مشرق ہمہ افسانہ
وقت است کہ در عالم نقشِ دگر انگیزی

زمانہ اپنی روش پر بدستور چلی جا رہی تھی۔ تہذیبِ مغرب اپنے پورے شباب پر تھی۔ نظامِ افرنگ کی رعنائیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن یہ فقیرِ کجکلاہ برابر اپنی پکار کو دہرائے جا رہا تھا کہ

عذرا اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

کسی کی سمجھ میں یہ مطلق نہیں آتا تھا کہ اس دیدہ ور کو کیا نظر آ رہا ہے جس کی بنا پر یہ اس شدت و اصرار سے اپنی بات کو دہرائے جا رہا ہے۔ لیکن کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے یہ مغنی آتش نفس خلوت و جلوت بستی اور ویرانہ میں ہر جگہ اپنے پیغام کو پہنچائے جا رہا تھا۔

باین بہانہ دریں بزم محرمے جوئیم	غزل سرائیم و پیغام آشنا گوئیم
بخلوتے کہ سخن می شود حجاب آنجا	حدیث دل بزبان نگاہ می گوئیم

جب پوچھنے والے زیادہ اصرار کرتے تو وہ ایک ہلکے سے معنی خیز تبسم سے اتنا کہہ دیتا کہ

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں!

محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!

اس سے ان کی حیرت اور بھی بڑھ جاتی اور وہ زیادہ کاوش سے بات کریدنے کی کوشش کرتے تو یہ غمکدۂ حجاز کا متوالا یارانِ میکدہ سے کہہ دیتا کہ

بگرداں جام و از ہنگامۂ افرنگ کم تر گو

ہزاراں کارواں بگذشت ازیں ویرانہ پے در پے

متجسس قلوب سے تو وہ اس شانِ دلربائی سے باتیں کرتا لیکن اگر کوئی ضد اور کد سے ان حقائق کو جھٹلانے کی کوشش کرتا تو اس سے ذرا کھلے کھلے الفاظ میں گفتگو کرتا اور برملا کہہ دیتا کہ

گفت اے گندم نمائے جو فروش	از تو شیخ و برہمن اندر خروش
حکمتے کو عقدۂ اشیاء کشاد	با تو غیر از فکر چنگیزی نداد
مرگ تو اہل جہاں را زندگیست	باش تا بینی کہ انجام تو چیست

وہ کچھ اس قسم کی باتیں کرتا لیکن اس کی باتوں میں کچھ ایسی حلاوت تھی کہ ہر ایک کا جی چاہتا کہ اس سے ذرا اور قریب ہو کر اس کی باتیں سنی جائیں۔ لوگ قریب آتے تو وہ ذرا اور دور ہو جاتا کہ اپنا محرم راز کسی کو نہ پاتا۔ وہ اپنی باتیں اپنے دل سے زیادہ اطمینان سے کرتا۔ لیکن غیر سے کرتا یا اپنے آپ سے۔ آنے والے انقلاب کے تصور سے اس کا دل طلسم پیچ و تاب بنا رہتا۔ وہ رات کی تنہائیوں میں اٹھ اٹھ کر روتا اور دعائیں مانگتا کہ

یا بکش در سینۂ من آرزوئے انقلاب	یا دگرگوں کن نہاد ایں زمان و ایں زمیں

یا چناں کن یا چنیں!!

وہ زمانہ کی بے کیف گردش دولابی سے گھبرا اٹھتا اور صداقتِ فطرت سے اپنے عجیب مجبوبانہ انداز میں کہتا کہ

طرحِ نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم

ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

زمانہ آگے بڑھتا گیا اور اس کے ساتھ ہی اس لے نواز کی نوا میں تلخی اور لے میں سوز بھی زیادہ ہوتا گیا۔ وہ اب حقائق کو زیادہ نکھرے ہوئے الفاظ میں بیان کرنے لگ گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جو چیزیں پہلے اس کے عالم تصور میں دھندلے سے خواب کی صورت میں متشکل تھیں اب محسوس پیکر اختیار کر رہی ہیں اب وہ کھلے کھلے الفاظ میں کہتا کہ ؎

یہ عناصر کا پرانا کھیل یہ دنیائے دوں | ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خوں

اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز | جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نوں

(ابلیس کی مجلسِ شوریٰ۔ ارمغان حجاز آخری تصنیف)

ابلیس کے ایک دوسرے مشیر کی زبان سے کہلوایا گیا ہے۔

زاغِ دشتی ہو رہا ہے ہمسر شاہین چرخ | کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاجِ روزگار

چھا گئی آشفتہ ہو کر وسعتِ افلاک پر | جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشتِ غبار

فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج | کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار

میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے | جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

غرضیکہ وہ صاحب خرد و جنون اس تہذیب کے آل سے دنیا بھر کو آگاہ کئے جاتا رہا۔ لیکن دنیا کی وہی حالت رہی کہ اس کی باتوں کو سنا اور پھر اپنے دھندوں میں مصروف ہو گئے۔ زمانہ یوں ہی گذرتا گیا کہ ایک دن بستی والوں نے دیکھا کہ یہ مرد درویش کچھ اس انداز سے مضطرب و بیتاب ہے جس طرح بعض پرندے طوفان آنے سے پیشتر اضطراب و سراسیمگی میں ادھر ادھر اڑتے اور چکر لگاتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ بابا! خیر ہے؟ یہ بیکلی اور بے چینی کیوں ہے؟ کہا کہ تمہیں کیا بتاؤں! اگر عافیت چاہتے ہو تو اب بھی اپنے آپ اور اپنی نسلوں کو خدائے قوی و مقتدر کی حفاظت میں لے آؤ ورنہ یاد رکھو کہ طوفانِ بلاانگیز میں خس و خاشاک کی طرح بہ جاؤ گے

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے | فرنگ رہگذرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

بستی والوں نے سنا اور حسب دستور ایک خفیف سی ہنسی سے اس کا استقبال کیا۔ رات کو معمولاً محفلِ رقص و سرود

میں محوِ کیف و سرور ہے۔ آخری شب آنکھ لگی تو محسوس ہوا گویا زلزلے کے جھٹکے آ رہے ہیں۔ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے۔ دیوانگی میں ادھر ادھر بھاگے۔ دیکھا تو اس قصرِ مشید کی بنیادیں تک ہل رہی ہیں جس کے متعلق کبھی تصور بھی نہ آتا تھا کہ یہ متزلزل ہو سکے گا۔ آندھی اور جھکڑ کا طوفان۔ زلزلے کے جھٹکے۔ یہ مکان گرا۔ وہ دیوار ٹوٹی باہر تند و تیز بارش۔ اندر تباہی و بربادی۔ سامنے ڈنزگ کی پہاڑیوں کو دیکھا تو آتش فشاں چوٹیوں سے لاوے کا سیلاب امنڈا چلا آ رہا ہے اور جو کچھ سامنے آتا ہے اسے اپنے مہیب شعلوں کی لپیٹ میں لئے بربادیوں کے جہنم میں دھکیلتا چلا جاتا ہے بستی والوں کو اپنے پرائے کا کچھ ہوش نہ تھا۔ اب ان کی سمجھ میں آیا کہ وہ مردِ دانا کیا کہتا تھا! اس سراسیمگی میں اٹھے اور اس فقیر کی کٹیا کی طرف لپکے کہ اسی دانائے راز سے پوچھیں کہ اس سیلابِ فنا سے بچنے کی بھی کوئی صورت ہے بھاگے بھاگے کٹیا پر پہنچے۔ لیکن دیکھا تو کٹیا خالی ہے۔ وہ مردِ درویش کہیں چلا گیا۔ سر پکڑ کر بیٹھ گئے کہ اب کوئی تدبیر سجھائی نہیں دیتی تھی۔ کٹیا کے اندر عین وسط میں نورِ قرآنی کی قندیل جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ ایک طرف ایک کدوئے کہنہ میں عشقِ محمدی کی شرابِ کوثریں چھلک رہی تھی اور سامنے دیوار پر جبریل کے پر مل سے لکھا تھا کہ

سرودے رفتہ باز آید نیاید | نسیمے از حجاز آید نیاید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے | دگر دانائے راز آید نیاید

بستی والوں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو ایک طرف ایک کشکول دکھائی دی جس کے اوپر جلی حروف میں لکھا تھا۔

بحضورِ ملت

دیکھا تو اس میں کاغذات کے کچھ ٹکڑے نہایت ترتیب سے رکھے ہیں۔ سب سے اوپر ۱۹۰۷ء کا ایک ٹکڑا ہے۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ ملتِ بیضا کا انحطاط اپنی انتہائی پستی تک پہنچ چکا تھا اور کہیں کسی طرف۔ امید کی کرن نظر نہیں آتی تھی۔ عین اس مایوسی اور بیکسی کے ماحول میں اس امیدوں کے شاہزادے نے گرتی ہوئی کا بازو تھاما اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا کہ کیوں گھبراتے ہو۔ کیوں خوف کھاتے ہو۔

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا
سفینۂ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا

لوگوں نے سنا اور ایک معنی خیز تبسم سے اس کا استقبال کیا کہ یہ انحطاط اور اس پر یہ موہوم امیدیں! اس کے پیچھے ۱۹۱۲ء کا ایک پرزہ تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب جنگ بلقان میں ملت اسلامیہ کے ترکش کا آخری تیر بھی نشانہ خطا کرکے ٹوٹ کر گر چکا تھا۔ سطوتِ اسلامیہ کے ابھرنے کی بظاہر کوئی امید نظر نہ آتی تھی۔ مایوسیوں کی تاریکی نے چاروں طرف سے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ اس ظلمت و تاریکی میں وہ شمع بردارِ کاروانِ حجاز اٹھا اور اپنی مخصوص لے میں پکار کر کہا کہ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اور — جلوۂ تقدیر میرے دل کے آئینے میں دیکھ — دیکھ اور اپنی آنکھوں سے دیکھ کہ کس طرح

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش — اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار — نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک — بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں — محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

اس کے ساتھ ہی ایک اور ٹکڑے پر یہ لکھ رکھا تھا ؎

دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی! — کوکبِ غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی — گل برانداز ہے خونِ شہدا کی لالی

رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے (جوابِ شکوہ)

اُدھر یورپ کے میدانوں میں خونِ مسلم کی یوں ارزانی ہو رہی تھی اور ادھر ہندوستان میں انہی دنوں ایک ایسی تحریک کی ابتدا تھی جو آتشِ خاموش کی طرح وحدتِ ملت اور عالمگیریت اسلام کو اندر ہی اندر جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دینے والی تھی۔ اس مردِ دانا کی نگہ دوررس اگر ایک طرف لالہ زارِ مغرب کے آتشیں منظر پر محوِ خوننابہ فشانی تھی تو دوسری طرف اس تحریک جدید کی ہلاکت سامانیوں سے بھی غافل نہ تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب کسی کے حیطۂ تصور میں بھی نہ تھا کہ قومیت پرستی (یعنی وطن کو وجۂ جامعیت قرار دے کر متحدہ قومیت کی تشکیل) میں بھی مسلمانوں کے لئے کسی قسم کا کوئی خطرہ ہے۔ بڑے بڑے دردمندانِ ملت اپنی وطن پرستی پر فخر کرتے نظر آتے تھے۔ لیکن ان سب میں اکیلا یہ مردِ دانا تھا جس نے بلند آہنگی سے پکار کر کہا کہ

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور — ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور　　　　　تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ تہذیبِ مغرب کی تقلید میں نیشنلزم گویا وقت کا فیشن بن رہی تھی - مہذب ہونے کا ثبوت یہ تھا کہ انسان نیشلسٹ ہو عین اس زمانہ میں اس دیدہ ورکی نگاہوں نے دیکھ لیا کہ یہ نیا فلتنہ کس قدر اسلام کے بنیادی خطوط سے متضاد ومتبائن ہے - اس نے قوم کو جھنجھوڑ کر کہا کہ

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ

ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار

قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں

اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی!

اس لئے کہ :-　　　　نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا

بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے　　　　(۱۹۰۸ء)

اس کے بعد ایک اور ورق ملا - یہ اس زمانہ کا لکھا ہوا تھا جب ہندوستان میں جدید اصلاحات کا دور دورہ تھا جن کی رو سے یہاں مغربی انداز کے جمہوری نظام کی طرح ڈالی گئی تھی - وقت وہ تھا کہ مغربی جمہوریت کو نوعِ انسان کی تمام مصیبتوں کا حل بتایا جاتا تھا - اسی میں اصل آزادی کا راز مضمر سمجھا جاتا تھا - تمام ہندوستان نے جمہوری نظام کی طرف ان اصلاحی اقدام کا خیر مقدم کیا حتیٰ کہ مسلمانوں کی طرف سے تو بلند آہنگی سے نعرے لگنے شروع ہو گئے کہ اسلام جمہوریت کا مذہب ہے - اور کسی نے یہ نہ سمجھا کہ اس جمہوریت اور اسلامی جمہوریت میں کس قدر بعد المشرقین ہے یہ جمہوریت وہ تھی جس کی رو سے قانون سازی کا اختیار انسانوں کی ایک جماعت کے سپرد کیا جاتا تھا یوں اقلیت پر اکثریت کے فیصلوں کی پابندی لازم تھی - ادھر ساری دنیا (اور ہندوستان کے مسلمان) ان اصلاحات پر حیلا غاں کر رہے تھے اور ادھر یہ مردِ دانا انھیں متنبہ کر رہا تھا کہ یاد رکھو -

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام　　　　جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق — طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

ورق کے دوسری طرف لکھا تھا ؎

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو — کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

انہی دنوں کا لکھا ہوا ایک اور ورق ملا۔ زمانہ وہ تھا جب یورپ کے گدھ (ترکی کے) مرد بیمار کی لاش
نڈلا رہے تھے۔ عرب و عجم میں مسلمانوں کی رہی سہی قوتیں بھی ختم ہو رہی تھیں۔ جنگ عظیم کے بعد کے اثرات
ملت اسلامیہ کا جسم ناتواں نڈھال ہو رہا تھا۔ وہ زمانہ جس میں

ے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل — خشت بنیاد کلیسا بن گئی خاک حجاز!
ہو گیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو — مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

عالمگیر مایوسی میں جبکہ کہیں سے شعاع امید جلوہ افروز نظر نہیں آتی تھی۔ اس مرد مومن نے اپنی قرآنی فراست
دیکھا کہ مایوسیوں کے ان خوفناک بادلوں کے پیچھے امید کی سنہری کرن بھی موجود ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر
تی ہوئی قوم کو حوصلہ دلایا کہ وجۂ اضطراب کچھ نہیں۔

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دور گراں خوابی!
عروق مردۂ مشرق میں خون زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی۔ ذہن ہندی۔ نطق اعرابی

اس کے نیچے لکھا تھا ؎

سرشک چشم مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا

کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

اُدھر اس قدر تابناک امیدوں کی قندیل کو روشن کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یورپ کی ہمسائیگی میں بسنے والے ترکوں کو اس سے بھی آگاہ کر دیا کہ یاد رکھو کہیں تم نے بھی تہذیبِ مغرب کے فریب میں نہ آجانا۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی	یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو	ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے
تدبّر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا	جہاں میں جس تمدّن کی بنا سرمایہ داری ہے

پھر ایک اور یادداشت ملی۔ یہ اس زمانہ میں لکھی گئی تھی جب روس کا بالشویکی نظام عالمگیر حیثیت اختیار کئے جا رہا تھا اور چونکہ یہ نظام۔ سرمایہ داری کا ردِّ عمل تھا اور گھبرایا ہوا انسان یہ سمجھ رہا تھا کہ بس وہ تریاق ہاتھ آگیا جو زمانۂ حاضر کے ہر قسم کے زہر کا مداوا ہے۔ اپنے مرکز سے ہٹا ہوا مسلمان بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ ہاں! یہ نظام عین اسلامی نظام ہے۔ اس عالمگیر غلغلہ اندازی میں اس مردِ دانا نے اس نظام اشتراکیت کا تجزیہ کیا اور فریب خوردہ مسلمان کو بتایا کہ یہ بھی سراب ہی سراب ہے۔ تو میں صرف تخریب (لا) سے بلند نہیں ہوا کرتیں اس کے ساتھ تعمیر (الّا) کی بھی ضرورت لاینفک ہوتی ہے۔ نظام اشتراکیت پر غور کرو۔

فکرِ او در تندبادِ لا بماند	مرکبِ خود را سوئے الّا نراند
آیدش روزے کہ از زورِ جنوں	خویش را زیں تندباد آرد بروں
در مقامِ لا نیا ساید حیات	سوئے الّا می خرامد کائنات
لا و الّا ساز و برگِ اُمتاں	نفیٔ بے اثبات مرگِ امتاں

پھر ایک اور یادداشت ملی۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب یورپ نے بین الاقوامی معاملات کے تصفیہ کے لئے مجلسِ اقوام کی طرح ڈالی تھی اور دنیا خوش تھی کہ اب نزاع اور جھگڑوں کا زمانہ ختم ہو گیا۔ جنگ نابود ہو گئی۔ اب کمزوروں پر ظلم و استبداد روا نہیں رکھا جائے گا۔ ہر ایک کی دادرسی ہو گی۔ دنیا خوش اور مطمئن تھی۔ لیکن اس مردِ دانا نے سر ہلا دیا اور کہہ دیا کہ

برفتد تا روشِ رزم دریں بزمِ کہن !	دردمندانِ جہاں طرحِ نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند	بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند !

اس کے نیچے لکھا تھا ؎

نقش نو اندر جہاں باید نہاد — از کفن دزداں چہ امید کشاد
در جنیوا چیست غیر از مکر و فن — صید تو ایں میش و آں نخچیر من
نکتہ ہا کو می نگنجد در سخن — یک جہاں آشوب و یک گیتی فتن

ادھر یہ ہو رہا تھا اور ادھر ہندوستان میں وطن پرستی۔ متحدہ قومیت کا دامِ ہمہ رنگ زیں وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا تھا اور بھولا بھالا مسلمان بلا سوچے سمجھے اپنے ہاتھوں سے اس دام کے حلقے کستا چلا جا رہا تھا۔ لیکن یہ دانائے راز برابر پکارتا چلا جا رہا تھا کہ یاد رکھو یہ سراب رنگ و بو ہے یہ تمہاری غلامی کی نئی زنجیریں ہیں۔ وطنیت کی بنا پر قومیت کا تصور نہیں دورِ اسلام سے نکال کر عہدِ جاہلیت کی طرف لے جائیگا ایک کاغذ کے پرزے پر اس بحری تار کی نقل تھی جو گول میز کانفرنس میں شریک ہونے والے مسلمان نمائندوں کے نام بھیجی گئی تھی کہ دیکھنا کہیں مخلوط انتخاب کو تسلیم نہ کر لینا۔ یہ تمہاری جمعیتِ اسلامی کی بنیادیں اکھیڑ کر رکھدے گا۔ ایک یادداشت کا تھوڑا سا ٹکڑا موجود تھا جس میں نہرو رپورٹ کی مخالفت کی تلقین تھی۔ ۱۹۳۰ء کی لکھی ہوئی ایک لمبی چوڑی دستاویز ایک خریطہ کے اندر سنبھال کر رکھی ہوئی ملی۔ اس میں بڑے کام کی باتیں تھیں۔ ایک مقام پر جلی حروف میں لکھا تھا۔

"میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب۔ صوبہ سرحد۔ سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے۔ ہندوستان کو حکومت خود اختیاری زیرِ سایۂ برطانیہ ملے یا اس سے باہر کچھ بھی ہو۔ مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے"

بستی کے لوگ کشکول کی ان دستاویزوں کو کھول رہے تھے اور فقیر کی ہیبت ان کے دلوں پر چھائے جا رہی تھی وہ محسوس کرتے تھے کہ گویا وہ ابھی تک کٹیا کے اندر ہی ہے۔ ان دستاویزوں کا انداز کچھ ایسا لاہوتی سا تھا کہ وہ اس زمین کی باتیں نظر ہی نہیں آتی تھیں۔

پھر کچھ اور متفرق یادداشتیں ملیں کسی میں افسردہ دل صوفی سے کہا گیا تھا کہ ؎

یہ حکمتِ ملکوتی یہ علم لاہوتی — حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکرِ نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور — تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

کہیں ظواہر پرست ملّا سے تخاطب تھا کہ۔۔

فقیہِ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور — کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست
گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی! — اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

کہیں اس زمانہ کے جھوٹے مدعیانِ امامت و نبوّت سے خطاب تھا کہ

فتنۂ ملّتِ بیضا ہے امامت اس کی — جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

کہیں افرنگ زدہ مسلماں سے کہا گیا تھا کہ

ترا وجود سراپا تجلّیٔ افرنگ — کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے خالی ہے — فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر

کہیں اربابِ فنونِ لطیفہ کو مخاطب کر کے کہا گیا تھا کہ

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو! — جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا؟

کہیں فلسفہ دانوں کو مخاطب کر کے کہا گیا تھا کہ

سن مجھ سے یہ نکتۂ دل افروز

انجامِ خرد ہے بے حضوری — ہے فلسفہ زندگی سے دُوری

بستی والے ان یادداشتوں کو دیکھتے تھے اور حیران ہوئے جاتے تھے کہ یہ مردِ قلندر کس مقامِ بلند پر تھا کہ اس کے سامنے ہر شے اپنی اصلی شکل میں بے نقاب ہو جاتی تھی اور وہ ان تمام چیزوں کے محاسن و معائب کو کس طرح کھلے ہوئے الفاظ میں بیان کر دیتا تھا۔ پھر یہ بھی کہ اس چھوٹی سی کٹیا کے اندر رہتے ہوئے اس کی نگاہ کس طرح

یک چمن گل۔ یک نیستاں نالہ۔ یک خمخانہ مے۔

اپنے دامن میں رکھتی تھی کہ زندگی کا کوئی شعبہ اور علم و سائنس کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جس کو یہ محیط نہ ہو

ایک پرزہ دیکھا تو اس پر گویا آتشیں حروف میں چند شعر لکھے ہوئے ملے۔

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ — ز دیوبند حسین احمدؒ ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملّت از وطن است — چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

پڑھنے والوں میں سے ایک نے کہا کہ جن صاحب کا نام لیا گیا ہے یہ تو سنا ہے کہ کسی دینی مکتب کے صدر

مدرس تھے۔ ایک گوشے میں ایک سفید ریش بزرگ بیٹھے تھے۔ انھوں نے کہا کہ یہ تو واقعی صدر مدرس تھے لیکن اس فقیر دانا کو تم کیا سمجھتے ہو! اس کی شکل و صورت اور وضع قطع پر نہ جاؤ۔ اس کے لکچر کا عالم ہم نے تو اپنی زندگی میں دیکھا نہیں۔ بستی والے یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہے تھے اور بیٹھے سر پیٹ رہے تھے کہ ہم نے اس دانائے راز کی کچھ قدر نہ کی یہ تو بیٹھے ہی بیٹھے دنیا کو کچھ سے کچھ کر گیا ہے۔ بستی والوں نے اس مرد بزرگ سے پوچھا کہ سائیں بابا! یہ تو بتاؤ کہ یہ مرد دانا اس قسم کی باتیں کہتا کس طرح سے تھا۔ یہ تو ہمیں کسی اور ہی دنیا کا انسان نظر آتا ہے۔ اس نے کہا کہ لوگوں کی یہی تو بھول ہے۔ یہ مرد دانا اسی دنیا کا انسان تھا۔ اس نے نہ (معاذ اللہ) نبی ہونے کا دعوےٰ کیا نہ مہدی کا نہ وہ مجددیت کا مدعی ہوا نہ امامت کا۔ اس نے اپنے آپ کو سیدھا سادا مسلمان کہا اور بس بستی والوں نے پوچھا کہ ہماری بات تو وہیں کی وہیں رہی کہ جب اس نے کوئی دعوےٰ بھی نہیں کیا تو پھر وہ ایسی باتیں کس طرح کہتا تھا۔ مرد بزرگ نے کہا کہ میں نے خود اس سے یہ سوال کیا تھا جس کے جواب میں مرد دانا نے اپنے مخصوص تبسم سے کہا کہ اس میں کرامات کی کوئی بات نہیں۔ **اپنی آنکھیں** جن پر کسی بیرونی اثر کا رنگین چشمہ نہ ہو اور **قرآن کریم کی روشنی** اس سے وہ فراست پیدا ہو جاتی ہے جس سے ہر شے کی حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

میانِ آب و گِل خلوت گزیدم — نہ افلاطون و فارابی بریدم
نکردم از کسے دریوزہ چشم — جہاں را جز بچشمِ خود ندیدم

میری صہبائے بصیرت (مرد دانا نے کہا) خمکدۂ حجاز سے سر بمہر آبگینوں میں آتی ہے جس میں خالص **قرآن** ہوتا ہے۔ یہ کہا اور مردِ دانا کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے فرمایا کہ کیا آپ نے میری وہ دعا نہیں سنی جو آہِ سحرگاہی اور نالۂ نیم شبی کے تحائف کے ساتھ میں نے بحضور خواجۂ کونین پیش کی ہے سنئے کہ میں نے کیا درخواست پیش کی ہے۔

گر دلم آئینۂ بے جوہر است — ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن — ایں خیاباں راز خارم پاک کن
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا — بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

آخری مصرعہ پڑھا اور پڑھتے ہی وہ مرد دانا بچوں کی طرح ہچکیاں لیکر رونے لگ گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ سر سے پاتک قلب ہی قلب ہے جو سوز و گداز و تپش و خلش کا نازک آبگینہ ہے۔

بستی والے اس مرد بزرگ کی باتیں سن رہے تھے۔ ہر ایک کی آنکھوں میں آنسو اور دل میں تلاطم اضطراب موجزن تھا۔ انھوں نے دیکھا تو ایک پرزے پر لکھا تھا۔

پس از من شعر من خوانند و مے یابند و می گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگا ہے!

بستی والوں نے اس شعر کو دیکھا اور بلک بلک کر رونے لگ گئے جب ذرا سنبھلے تو کہا کہ اے کاش! ہمیں یہ بھی بتلا ہوتا کہ بالآخر اب ہم کریں کیا؟ دیکھا تو ایک ورق پر لکھا تھا۔

اے اسیرِ رنگ پاک از رنگ شو — مومنِ خود۔ کافرِ افرنگ شو
رشتۂ سود و زیاں در دستِ تُست — آبروئے خاوراں در دستِ تست
ایں کہن اقوام را شیرازہ بند — رایتِ صدق و صفا را کن بلند
اہلِ حق را زندگی از قوّت است — قوّتِ ہر ملت از جمعیت است

رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں
قوّت بے رائے جہل است و جنوں

بستی والے افسردہ و غمگین کٹیا سے باہر آ گئے ہر ایک کی آنکھیں متلاشی اور قلب متمنی تھا کہ اے کاش! وہ مردِ کہیں سے پھرتا پھراتا ایک مرتبہ پھر ادھر آ نکلے۔ وہ اسی سوچ میں ڈوبے ہوئے آہستہ آہستہ جا رہے تھے کہ انہوں نے سنا کہ دُور پہاڑی کے دامن میں میٹھے میٹھے سروں میں کوئی گائے جا رہا ہے کہ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

———✕———

قائد اعظم

اگرچہ سر تراشد قلندری داند

ایسی آنکھ بمشکل مل سکے گی جو تاریکی کے جانے اور روشنی کے آنے کے درمیانی لمحہ کو بھانپ سکے۔ حقیقت یہ ہے
ان ہر دو مراحل کے درمیاں حد فاصل ہوتی ہی نہیں روشنی ایک چمک ہے۔ جونہی وہ پیدا ہوئی۔ اندھیرا غائب ہو گیا۔
اہ وہ اندھیرا سالہا سال کا بھی پرانا کیوں نہ ہو۔ قلب و دماغ کی دنیا میں اس کا نام **انشراح صدر** ہے اسمیں
شبہ نہیں کہ علم ہی وہ **نور** ہے جس کے آنے سے جہالت کی تاریکی کافور ہو جاتی ہے۔ لیکن علم کے لئے ضروری نہیں کہ
انسانوں کے متعین کردہ نصاب کے چکروں سے گذر کر ہی حاصل ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو قلب سلیم اور ذہن رسا عطا فرمائے
سکتا ہے کہ قرآن کریم کی وادئ نور سے ایک بار گذرنے سے ہی اس کی نگاہوں میں وہ بصیرت پیدا ہو جائے جو حقیقت
کو بے نقاب اور رموز دین کو اس طرح بے پردہ دیکھے جو دوسرے کو عمر بھر کی ورق گردانی کے بعد میسر نہ آسکے۔ اس
کے انشراح صدر اور کشف غطا کی بہت سی مثالیں سامنے آسکتی ہیں لیکن ان میں نزدیک ترین مثال وہ ہے جو
ے کشتی ملت جناب محمد علی جناح کی نگہ حقیقت بیں میں بصیرت فرقانی بن کر چمکی ہے۔ جناب **جناح** کے خلاف،
بخوان طبقہ کی طرف سے جو اپنے آپ کو حقائق دینی کا واحد اجارہ دار سمجھتا ہے۔ ہمیشہ یہ اعتراض عائد کیا جاتا ہے کہ
سٹر کیا جانیں **دین** کسے کہتے ہیں؟ اس میں شبہ نہیں کہ اگر دین جاننے سے مفہوم یہ ہے کہ وہ **کافیہ** کا
ی پڑھا ہوا ہے یا نہیں۔ تو بیشک مسٹر جناح "دین" سے ناواقف ہے۔ لیکن اگر سوال یہ ہے کہ وہ **دین** کی حقیقت
واقف ہے یا نہیں تو بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس باب میں اپنے اس مخلص بندے کو وہ بصیرت
لی ہے جس کے لئے بڑے بڑے "مدعیان علم شریعت" کو دعائیں مانگنی چاہئیں۔ ذرا غور فرمایئے کہ آج ہمارا
رام" کا طبقہ اپنے اس علم دین پر ناز کرتا ہے جو انہیں یہ سکھا رہا ہے کہ ہندوستان میں مغربی اصول جمہوری کی بنا پر
دں اور مسلمانوں کی ایک مشترکہ حکومت قائم کی جائے جس میں اکثریت کے فیصلے قانون کی حیثیت اختیار کریں، باقی
سلام۔ سو اگر مسلمانوں کو نماز۔ روزہ کی اجازت حاصل ہو جائے تو بس مقصد حاصل ہو گیا! اس کے برعکس یہ
کہ مذہب اور اس کے لوازم کے متعلق یہ **مسٹر** کیا کہتا ہے اور اس کے بعد فیصلہ کیجئے کہ رموز دین سے
"علمائے کرام" واقف ہیں یا مسٹر محمد علی جناح۔

۱۰ اگست ۱۹۴۶ء کو جناب جناح حیدر آباد تشریف لے گئے وہاں بعض نوجوان طلباء نے ان سے کچھ سوالات کئے اس مکالمہ کو مسٹر محمود علی صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) نے محفوظ کر لیا اور اب اورینٹ پریس کی وساطت سے شائع ہوا ہے۔ یہ مکالمہ انگریزی زبان میں ہوگا لیکن اخبارات میں اس کا اردو ترجمہ شائع ہوا ہے۔ ہمارے سامنے **انقلاب** ۱۰ فروری ۱۹۴۷ء کا پرچہ ہے ترجمہ کی زبان میں کہیں کہیں الجھاؤ نظر آتا ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ ان مقامات میں سلاست پیدا کر دی جائے۔ ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیے کہ دین کے متعلق مسٹر جناح کے کیا خیالات ہیں۔

سوال۔ مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں۔

جواب۔ جب میں انگریزی زبان میں مذہب کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور قوم کے محاورے کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں ہے۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملا نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعوےٰ ہے البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی۔ سیاسی ہو یا معاشی۔ غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔

سوال۔ اس سلسلہ میں اشتراکی حکومت وغیرہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔

جواب۔ اشتراکیت۔ بالشویت۔ یا دیگر اسی قسم کے سیاسی اور معاشی مسلک۔ درحقیقت اسلام اور اس کے نظام سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سا ربط اور دفاع و توازن نہیں پایا جاتا۔

سوال۔ ترکی حکومت تو ایک مادی اسٹیٹ ہے۔ کیا اس سے اسلامی حکومت مختلف ہے؟ آپ کا اس باب میں کیا خیال ہے؟

جواب۔ ترکی حکومت پر میرے خیال میں مادی حکومت (سیکولر اسٹیٹ) کی سیاسی اصطلاح اپنے پورے مفہوم میں منطبق نہیں ہوتی اب رہا اسلامی حکومت کے تصور کا امتیاز سو یہ بالکل ملحوظ **اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں**

اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کے لئے تعمیل کا مرکز قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے (آپ جس نوعیت کی بھی چاہتے ہوں) بہرحال آپ کو علاقہ اور سلطنت کی ضرورت ہے۔

سوال۔ وہ سلطنت ہمیں ہند میں کس طرح نصیب ہو سکتی ہے۔

جواب۔ مسلم لیگ۔ اس کی تنظیم۔ اس کی جدوجہد۔ اس کا رُخ۔ اس کی راہ۔ سب اس سوال کے جواب ہیں۔

سوال۔ جب آپ اسلامی اصول کے نصب العین اور طریق کار دونوں میں بہترین اور برترین حکومت کا یقین رکھتے ہیں اور اجمالاً یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو خود مختار علاقے اس لئے مطلوب ہیں کہ وہاں وہ اپنے ذہنی میلانات اور تصورات زندگی کو بلا روک ٹوک بروئے کار اور روبہ ترقی لاسکیں۔ تو پھر اس میں کونسا امر مانع ہے کہ مسلم لیگ زیادہ تفصیل اور توضیح کے ساتھ اپنی جدوجہد کی مذہبی تعبیر و تشریح کردے۔

جواب۔ (وقت یہ ہے کہ) جب اس جدوجہد کو مذہب سے تعبیر کیجئے تو ہمارے علماء کی ایک جماعت بغیر اس بات کے سمجھنے کے کہ کام کی نوعیت تقسیم عمل اور اس کے اصل حدود کیا ہیں۔ ان امور کو صرف چند مولویوں کا اجارہ خیال کر لیتی ہے۔ اور اپنے حلقہ سے باہر اہلیت و استعداد کے باوجود مجھ میں یا آپ میں (یعنی کسی اور میں) اس خدمت کے سرانجام دینے کی کوئی صورت نہیں دیکھتی حالانکہ اس منصب کی بجاآوری کے لئے جن اجتہادی صلاحیتوں کی ضرورت ہے انہیں میں ان مولوی صاحبان میں (الا ماشاء اللہ) نہیں پاتا۔ (اور پھر مشکل اندر مشکل یہ کہ) وہ اس شیٔ کی تکمیل میں دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے۔

---*---

ان تصریحات پر غور فرمائیے اور پھر سوچئے کہ کیا دین یہ ہے جسے مسٹر جناح پیش کر رہے ہیں یا وہ جو خیر سے علماء کرام کی جمعیت کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہے۔ وہ دین جس میں امتزاج بولہبی و مصطفوی سے ایک ایسی متحدہ قومیت کی تشکیل کی جا رہی ہے جس کی آزادی میں طاغوتی اکثریت کا نظام حکومت کارفرما ہوگا۔ اس کے برعکس مسٹر جناح کا دین یہ ہے کہ اطاعت و وفا کیشی میں مرجع صرف خدا کی ذات ہے۔ اور اس کی تعمیل کا مرکز قرآن کریم کے احکام۔ مسلمان نہ کسی بادشاہ

کا محاجم ہو سکتا ہے نہ پارلیمان کا۔ نہ کسی شخص کا نہ ادارہ کا۔ بلکہ وہ صرف اپنے خدا کا محکوم ہو سکتا ہے اس لئے اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی احکام واصول کی حکومت ہے" اور یہی وہ حکومت ہے جس کے لئے مسلم لیگ برسرپیکار ہے۔ وہ ہیں "علماء کرام" یہ ہے مسٹر جناح۔

اگر یہ خدا کی دین نہیں تو اور کیا ہے۔ سچ کہا تھا کسی نے کہ

زسومنات جناح دز کاشمیر اقبالؒ

زدیوبند حسین احمدؒ ایں چہ بوالعجبی است

ان تصریحات کے بعد غور فرمایئے کہ مسلم لیگ کی مخالفت دین خداوندی کے "تمکن وترویج کی مخالفت ہے۔ یا کوئی نیک کام اور یہ بھی کہ ایک ایسی جماعت کی موجودگی میں جس کا نصب العین یہ ہو کسی اور جماعت کی تشکیل ملت میں تشتت وافتراق ہے یا اصلاح وخیر!

فردوس بیک خوشۂ انگور فروشم

آزادی! اور وہ آزادی جس میں اللہ کے بندے اپنے اللہ کے سوا کسی اور کے محکوم نہ ہوں
دُنیا میں کسی قیمت پر بھی گراں نہیں۔
اس آزادی کے حصول کے لئے کیا کیا قیمتیں ادا کرنی پڑتی ہیں؟ جائیے! اور ان میدانوں سے پوچھئے
جہاں کے شفق آگیں ذرات، خونِ شہداء کی تابندہ داستانیں اپنی پیشانی پر
نقش کئے بیٹھے ہیں۔
اس میں شبہ نہیں کہ جانِ مُدعا کی قیمت جان کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن اُس کی رحمتوں کے تصدق،
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ زلیخا کو اُس کے خوابوں کی تعبیر بازارِ مصر میں کوڑیوں کے
دام مل جائے۔ پھر
کس قدر خوش بختی ہے اُس قوم کی جسے آزادی جیسی متاعِ بے بہا، خون کے بجائے چند پیسوں کے عوض
مل جائے۔
اور کیسی بدبختی ہے اُن کی جو یوسفِ زندگی کو سوت کی انٹی کے بدلے بھی نہ خرید سکیں!!
آج بازارِ ہند میں دس کروڑ فرزندانِ ملت کے لٹے ہوئے قافلے کی چھنی ہوئی متاعِ زندگی پھر
سے واپس مل رہی ہے۔ اور اتنی سستی مل رہی جتنی زلیخا کو بازارِ مصر میں مل گئی تھی!
اس سودے کے لئے آج تمہارا امین معتمد علیہ قائد۔ اس بازارِ بیع و شریٰ میں نکل آیا ہے۔ وہ اپنے لئے
کچھ نہیں خریدنا چاہتا۔ سب کچھ تمہارے لئے ہی لینا چاہتا ہے۔
مسلمانو! آج جناح نے پہلے پہل اپنی جھولی تمہارے سامنے پھیلائی ہے۔ اس جناح نے جس نے
آج تک کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا تو ایک طرف۔ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا!

اور تم سے مانگتا کیا ہے؟ جان نہیں۔ تھوڑا سا مال۔ وہ مال جس کے متعلق تم کبھی نہیں کہہ سکتے کہ کس وقت ہاتھ سے چلا جائے۔ اگر اعتبار نہ ہو تو پوچھو رنگون کے اُن بے سروسامانوں سے جو کل تک کروڑ پتی تھے اور آج ایک وقت کی روٹی کے لئے محتاج ہیں۔

غنیمت جانو یہ وقت کہ روپیہ تمھارے اپنے قبضہ میں ہے۔ اس میں سے جتنا جناح کی جھولی میں ڈال دو گے محفوظ خزانے میں پہنچ جائے گا۔ وہاں اپنی حفاظت بھی کرے گا اور تمھاری حفاظت بھی۔

مسلمانو! جناح روز روز نہیں مانگیگا! مقدر کے ستارے روز روز نہیں پلٹیں گے۔ اتفاق سے حالات ایسے پیدا ہو گئے ہیں کہ تھوڑی سی مالی قربانی بڑے سے بڑے نتائج پیدا کر سکتی ہے۔

جو کچھ کر تم سے بن پڑے۔ زیادہ سے زیادہ جتنا دے سکو۔ دریغ نہ کرو۔ تامل نہ کرو۔ اور براہِ راست نمبر ۱۰ اورنگ زیب روڈ نئی دہلی کے پتہ پر جناب جناح کے نام بھیجدو۔ کیا عجب کہ اس سے تمھاری غلامی کی زنجیریں کٹ جائیں۔ تم دنیا میں پھر سے سر اٹھانے کے قابل ہو جاؤ۔

شاید یہ موقع پھر نہ ہاتھ آئے۔

ہرچہ داری صرف کن در راہِ او
لَن تَنَالُوا البِرَّ حَتّٰی تُنفِقُوا۔

اسلام کا آخری رکن

یہ ایک مقالہ کی تمہید ہے جس کو علامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری نے ماہ گذشتہ جامعہ ملیہ میں پڑھا تھا چونکہ بقیہ حصہ اس مقالہ کا حج سے متعلق ہے جس پر علامہ موصوف کا ایک بسیط مضمون طلوع اسلام دسمبر ۱۹۳۹ء میں نکل چکا ہے اس لئے اس موقع پر صرف اس کی تمہید ہی شائع کی جاتی ہے۔ (ادارۂ طلوع اسلام)

دین اسلام کے پانچ رکن تسلیم کئے گئے ہیں۔ پہلا رکن کلمۂ توحید ہے جس کے اوپر اسلام کی بنیاد ہے۔ کلمۂ توحید بمنزلہ اسلام کے دروازہ کے ہے۔ کوئی شخص دین اسلام میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتا اور نہ مسلمان کہا جا سکتا ہے جب تک کہ اس کلمہ کو دل سے نہ مان لے اور اس کا اقرار نہ کرلے۔ اس لئے یہ سب سے پہلا اور اسلام کا اول رکن ہے دوسرا رکن نماز ہے جس کا ادا کرنا ہر بالغ عاقل مسلمان پر فرض ہے۔ اور جس سے انسان کی صحیح بندگی کا تعلق اپنے خالق اور مالک کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔

تیسرا رکن زکوٰۃ ہے جس کا ادا کرنا صرف ان مسلمانوں پر فرض ہے جو صاحب نصاب ہوں یعنی جن کے پاس بڑھتا ہوا مال شرع کی معین کی ہوئی مقدار سے کم نہ ہو اور اس پر سال گذر جائے۔

نماز اور زکوٰۃ مکہ ہی میں فرض ہو چکی تھیں۔ قرآن کی ان سورتوں میں جو مکی ہیں نماز اور زکوٰۃ دونوں کے احکام ہیں۔ بلکہ دونوں بیشتر ایک ساتھ ہی مذکور ہوئے ہیں۔ لیکن مکی آیات میں زکوٰۃ کا جو ذکر آتا ہے۔ اس کی نوعیت اس زکوٰۃ سے جو مدنی آیات میں ہے کسیقدر مختلف ہے۔ مکہ میں اسلام کی کوئی اجتماعی طاقت پیدا نہ ہو سکی تھی اور نہ کسی قسم کی سیاسی حیثیت قائم ہوئی تھی۔ اس لئے وہاں زکوٰۃ صرف رضاکارانہ صدقات و خیرات کا نام تھا بخلاف اس کے مدینہ میں جب اسلام کی اجتماعی زندگی شروع ہوئی اور حکومت الٰہیہ قائم ہو گئی تو اس کے اخراجات کے لئے ملت کے ارباب نصاب سے سالانہ زکوٰۃ وصول کی جانے لگی جس کے قواعد و ضوابط خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتب فرمائے تھے۔ اور وہ اجمالاً یہ تھے کہ ہر صاحب نصاب مسلم سے سال کے خاتمہ پر قریب بلد کے زکوٰۃ امام کی طرف سے وصول کی جائے۔ اور جس کے پاس دو سو درہم سے کم یعنے موجودہ سکہ کے حساب سے چالیس روپیہ سے کم ہوں وہ صاحب نصاب نہیں ہے اس سے کچھ نہ لیا جائے۔ کم و بیش یہی نسبت یعنے بلد کی مویشی وغیرہ کا زکوٰۃ میں بھی رکھی گئی۔ اس کے ساتھ اپنی مرضی سے خیرات و صدقات کا سلسلہ بھی جاری رہا جو انفرادی تھا

اور جس کے لئے کسی مخصوص آئین وضابطہ کی ضرورت نہ تھی۔

چوتھا رکن اسلام کا روزہ ہے جو سنہ ھ میں مدینہ میں فرض کیا گیا۔ اور سب سے آخری رکن حج ہے جو سنہ ھ میں کہ فتح ہو جانے کے بعد فرض ہوا۔

میرا خیال ہے کہ یہ آخری رکن اپنی اہمیت کے لحاظ سے اس قدر عظیم الشان ہے کہ بہت پہلے فرض کر دیا جاتا اگر کہ مسلمانوں کے قبضہ میں ہوتا۔ بیت اللہ پر مشرکین کے تسلط کی وجہ سے اس کی فرضیت میں تاخیر بعید از قیاس نہیں۔ چنانچہ سنہ میں جب حضور اکرمؐ کعبہ کے شوق دید میں بیتاب ہو کر مسلمانوں کو ساتھ لیکر عمرہ کے لئے تشریف لے گئے تو کفار مکہ نے اس چھوٹے حج سے بھی روک دیا۔ اور مکہ میں داخل نہیں ہونے دیا۔ اس لئے حج کی فرضیت اسی وقت ہوئی جب مسلمانوں کا تسلط مکہ پر ہو گیا۔ اور یہ تسلط سنہ میں ہوا۔

قرآن کریم میں غور کرنے سے ہر صاحب بصیرت اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اسلام مجموعی لحاظ سے اجتماعی دین ہے یعنی وہ تمام بنی نوع انسان کی اجتماعی زندگی کا ایک مکمل نظام ہے۔ بیشک وہ انفرادی تعلیمات بھی پوری پوری اپنے اندر رکھتا ہے۔ لیکن ان تعلیمات سے وہ افراد کا تزکیۂ نفس اور ان میں تقویٰ و طہارت پیدا کر کے ان کو ملت کا جزو صالح بنانا چاہتا ہے تاکہ پوری ملت کی زندگی ایک نجات یافتہ زندگی ہو جائے۔ یہاں ضمناً اس امر کی طرف اشارہ کر دینا بے موقع نہ ہوگا کہ اسلام کی اجتماعی زندگی جو خلافت راشدہ یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زندگی تک قرآن کے مطابق تھی۔ بنی امیہ کی ملوکیت قائم ہو جانے کے بعد سے بالکل بدل گئی۔ نہ صرف اس لئے کہ یہ ملوکیت بجائے حکومت الٰہیہ کے انسانی حکومت تھی جو اسلام کے بالکل منافی تھی بلکہ اس لئے بھی کہ ان نام نہاد خلفاء نے۔ جو سوائے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے جن کا کل زمانہ دو سال تھا سب کے سب در اصل مستبد بادشاہ تھے۔ فوج خزانے اور ملک پر اپنا قبضہ جما کر دین کو افراد کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا جس کی وجہ سے اس کا اجتماعی نظام ٹوٹ گیا اور کوئی مرکز اس کی قیادت کے لئے نہیں رہا۔ چنانچہ افراد کی دینی رہنمائی کرنے والوں میں جب آپس میں اختلافات شروع ہوئے تو ان نزاعوں اور جھگڑوں کو فیصلہ کرنے والی کوئی قوت نہ تھی جو ان کو چکا کر مسلمانوں کو افتراق اور تشتت سے بچا لیتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دین کے لحاظ سے ملت میں نت نئے فرقے پیدا ہونے لگے اور اس کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی جس کی شیرازہ بندی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ملت میں پھر نبوت اور خلافت راشدہ کے منہاج پر مرکزیت نہ قائم ہو۔

آخر رفتہ رفتہ ہوا یہ کہ سوائے وابستگان سلطنت کے جملہ اہلِ اسلام ملی مشاغل سے نہ صرف فارغ بلکہ غافل ہو گئے

ان میں سے جن کو دین کا زیادہ ذوق ہوتا وہ ظاہری مہماتِ ملت کے دروازے اپنے اوپر بند پاکر باطنی تزکیہ کی طرف توجہ کرکے اپنی نجات کی راہ ڈھونڈتے۔ اس انفرادیت نے عام طور پر رہبانیت پیدا کی اور اوراد وظائف بالخصوص تصوف سے زیادہ دلچسپی بڑھی۔ اور دماغوں سے ملی مقصد اور اجتماعی نجات کا تصور ہی جاتا رہا۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اسلام سارے انسانوں کے لئے نہ صرف انفرادی بلکہ اجتماعی زندگی کا مکمل نظام ہے جو اللہ کا مقرر کیا ہوا ہے۔ اس کے خلاف جو نظام بھی قائم ہوگا وہ غیر اسلامی اور اللہ کی مرضی کے خلاف ہوگا۔ یہ اسلامی نظام ان پانچوں ارکان کی ادائیگی پر قائم ہے جن سے انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں کی تکمیل ہوسکتی ہے۔

پہلا رکن توحید جیسا کہ میں نے کہا دین اسلام کی بنیاد ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کا انفرادی اور اجتماعی مقصود حیات صرف اکیلے اللہ کی رضامندی ہے اور بس۔ اور یہ اسی کی اطاعت سے مل سکتا ہے سارے قرآن کو آپ چھان ماریئے اس میں سوائے اکیلے اللہ کی اطاعت کے اور مطلقاً کسی کی اطاعت کا حکم نہیں پائیں گے اطاعت الٰہی بذریعہ رسول کے ہوتی ہے۔ اور یہ آپ کو معلوم ہے کہ رسول ایک منصب ہے۔ نام نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو فریضے تھے۔

(۱) پیغمبری۔ یعنے اللہ کے پیغامات کو اس کی مخلوق کے پاس بے کم و کاست پہنچا دینا۔

اس منصب کے لحاظ سے آپ کو کسی سے مشورہ لینے کا حکم نہیں تھا بلکہ صرف یہ فرمان تھا یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ (اے رسول جو کچھ تجھ پر تیرے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اسے لوگوں تک) پہنچا دے۔

(۲) امامت۔ یعنے احکام الٰہی کے مطابق ان کو چلانا۔ ان کے باہمی جھگڑوں اور قضیوں کے فیصلے کرنا۔ ملکی امور مثلاً جنگ و صلح وغیرہ میں ان کی قیادت اور نمائندگی کرنا وغیرہ۔

جہاں تک پیغام رسانی کا تعلق ہے یہ منصب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ختم ہوگیا اور اس کی تکمیل اور اس کو ختم کرنے کے لئے وہ بھیجے ہی گئے تھے۔ لیکن دوسرا منصب یعنے **امامت** قیامت تک مستمر ہے جس کو ان کے جانشینوں کے ہمیشہ قائم رہنا چاہیئے تھا۔ اس جانشین کے لئے خلیفہ یا امام کا لفظ تاریخی طور پر مستعمل

تصوف اسلام سے قبل اقوام عالم میں رہا ہے اور اب تک ہے۔ مسلمان صوفیوں نے اس میں اسلامی رنگ دیا لیکن اس کے عناصر کا بڑا حصہ غیر قرآنی ہے جو اسلام کی اجتماعی زندگی میں غیر ضروری ہے۔

رہا ہے لیکن اب یہ دونوں الفاظ اس حد تک اپنے معانی سے دور ہو گئے ہیں کہ ان کے بولنے سے صحیح مفہوم کا تصور مشکل معلوم ہوتا ہے اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کو مرکز ملت سے تعبیر کر دوں۔

اسی مرکز کی اطاعت خواہ براہ راست ہو خواہ اس مرکز کے مقرر کئے ہوئے امراء کے ذریعہ سے ہو اللہ کی اطاعت ہے یہ مرکز حکومت الٰہی کا نمائندہ ہے مخلوق کے لئے جو امام اور اس کے مشیروں پر مشتمل ہو گا۔ اور یہ ذمہ دار ہونگے کہ ملت کو قرآن کے مطابق چلائیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بعد سے یہی مرکزیت امت کی جاتی رہی۔ اور ملت میں لامرکزیت اور انفرادیت پیدا ہوئی جو دن بدن اس کو انتشار اور تشتت کی طرف لئے چلی جا رہی ہے۔

اس بیان سے میرا مقصد اس امر کی توضیح ہے کہ دین اسلام نے کہ یہی دین الٰہی اور ازلی اور ابدی دین ہے موحدوں کا مرکز صرف اطاعت الٰہی کو قرار دیا ہے۔ یہی وہ مرکز ہے جس سے بنی نوع انسان کے جملہ باہمی جھگڑے اور منازعت ختم ہو سکتے ہیں اور سب کے سب وحدت اطاعت کی بدولت متحد ہو سکتے ہیں دوسرے لفظوں میں یہی مرکز امن عالم کا نقطہ ہے جس پر ایک نہ ایک دن دنیا کو آنا پڑے گا۔ لیکن یہ مرکز عقلی ہے اس لئے اس کی اطاعت کے لئے محسوس مرکز کی ضرورت تھی جو منصب رسالت سے پورا کیا گیا۔ رسول اور رسول کے بعد اس کے جانشین ملت سے یہ اطاعت لیں گے۔ اور اللہ کے مقرر کئے ہوئے اصول اور احکام یعنی اس کی اتاری ہوئی کتاب کے مطابق اس کو چلائیں گے۔

اس مرکز سے مقرر کئے ہوئے امراء کے ساتھ تو قرآن جمہور کو اختلاف اور تنازع کا حق دیتا ہے لیکن اصل مرکز سے کسی کو سرتابی کا حق ہے نہ منازعت کا۔ قرآن نے اس کی تصریح کر دی ہے۔

مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ

(کسی مومن مرد یا عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور رسول[1] (مرکز) کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو پھر ان کو اپنے معاملہ میں اختیار باقی رہے)

امراء اور جمہور کے تنازع کی صورت میں اس کا فیصلہ مرکز کرے گا جیسا کہ قرآن نے حکم دیا ہے۔

فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ۔

---

[1] ہم ایک مضمون میں جو طلوع اسلام میں اسلامی نظام کے نام سے شائع ہو چکا ہے قرآن کریم سے ثابت کر چکے ہیں کہ جہاں جہاں اللہ اور رسول کی اطاعت کا امر قرآن میں ہے وہاں ان سے مراد مرکز ملت کی اطاعت ہے

(اگر تم کسی بات میں آپس میں جھگڑ بیٹھو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف مستردکرو)
اس طرح پر بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے معاملہ کا فیصلہ ہو جایا کرے گا اور امت میں کوئی تفرقہ اور کوئی نزاع قائم نہ رہے گی۔

امام کے ساتھ مشیروں کی ایک جماعت کا ہونا قرآن کی تعلیم وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ یعنے ان کی حکومت باہمی مشورہ سے ہوگی۔کے مطابق لازم ہے۔ اور قرآن کی ہدایت شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ یعنے ان سے حکومت میں مشورہ لو۔کے مطابق امام مامور ہے کہ ان کے مشورہ سے کام کرے۔

یہی امام اور مشیروں کی جماعت ملت کی مرکزی جماعت ہے۔ اس مرکزی جماعت کا نصب کرنا جہاں تک میں قرآن سے سمجھ سکا ہوں ملت کا فریضہ ہے۔کیونکہ اپنی کتاب میں کہیں اللہ نے خود اس مرکز کے نصب کر دینے کی ذمہ داری نہیں لی ہے۔جو لوگ امام منصوص کے قائل ہیں ان کے پاس کوئی قرآنی سند نہیں ہے۔

اس مرکزی جماعت کا اصولی قانون اور دستورالعمل صرف کتاب اللہ ہے۔ اسی کے مطابق ہر زمانہ میں اس کی ضروریات کے لحاظ سے ضوابط بنائے جائیں گے۔ یہ ضوابط کسی خاص قبیلہ یا قوم یا مخصوص کنبہ یا خاندان کے فائدہ کے لئے نہیں ہو سکتے بلکہ یہ حکومت الٰہی ہوگی جس کا مقصد صرف اقامتِ حق اور اعلائے کلمۃ اللہ ہوگا تاکہ ہر انسان صحیح طور پر اللہ کا بندہ اور خلیفہ فی الارض ہو سکے جس کے لئے اس کی تخلیق ہوئی ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ

(میں نے نہیں پیدا کیا جن وانس کو مگر اس لئے کہ وہ میرے بندے بنیں)

جب ہم بولتے ہیں کہ مسلمانوں کا مذہب اور ان کی سیاست ایک ہے تو اس سے مراد ہماری یہی سیاست ہوتی ہے جو حکومت الٰہی ہے اور ہمارا دین ہے۔ بخلاف اس کے آجکل جو مسلمانوں کی ہر جماعت اس قسم کے نعرے لگاتی ہے اس کا مفہوم میری سمجھ سے باہر ہے۔ کیونکہ میں تو دیکھ رہا ہوں کہ مسلمانوں کی سیاست اور ان کا مذہب خلافت راشدہ کے بعد ہی سے الگ الگ ہیں۔

اسلام سوائے اس حکومتِ الٰہیہ کے بقیہ جملہ اقسام کی حکومتوں کو طاغوتی قرار دیتا ہے۔ بادشاہت جس کا تسلط خلافت راشدہ کے بعد سے مسلمانوں پر ہوا اور جس کے ساتھ آج تک بھی ان کا ایک حصہ بدقسمتی سے وابستہ ہے وہ تو اکثر حالتوں میں دنیا کے لئے ایک مصیبت ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ بادشاہ اور اس کے ارکان حکومت وزراء اور امراء اور عمال اور فوج سب مل کر اپنی قوت سے پورے ملک کے باشندوں کو تاج کا غلام بنا لیتے

ہیں اور رعایا کی محنت کو اس کے اور اس کے تحت ہی اپنے فائدہ کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

آجکل جمہوریت اور ڈکٹیٹرشپ دو قسموں کی حکومتیں دنیا میں زیادہ نمایاں اور باہم دگر برسرپیکار ہیں۔ لیکن اسلام مروجہ اصطلاحی معنوں میں نہ جمہوریت کو صحیح قرار دیتا ہے نہ ڈکٹیٹرشپ کو۔ کیونکہ جمہوریت میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ حق حکومت جمہور کو حاصل ہے جس کو وہ اپنے نمائندوں کے سپرد کرتے ہیں جس سے وہ نمائندے حکومت اور وضع قوانین کے مجاز ہو جاتے ہیں۔ اور ڈکٹیٹرشپ میں، ڈکٹیٹر یعنے مختار مطلق کی ذات میں حق حکومت تسلیم کیا جاتا ہے اور اسلام تو کسی انسان یا کسی انسانی جماعت میں حکومت کا حق نہیں مانتا بلکہ حکومت کو صرف اللہ کا حق قرار دیتا ہے۔ قرآن میں ہے۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ اَمَرَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ۔

(نہیں ہے حکومت مگر اللہ کے لئے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ تم سوائے اس کے کسی کے بندے نہ بنو)

دوسری جگہ فرمایا ہے

لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا

(اللہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں گردانتا)

خود انبیاء کرام کو بھی یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ انسانوں کو اپنا غلام بنائیں بلکہ صرف یہ کہ ان کو اللہ کی اتاری ہوئی کتاب کے مطابق چلائیں۔ جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے کہ

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ۔

(کسی شخص کو جسے اللہ کتاب حکم اور نبوۃ بخشے یہ حق نہیں ہے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بنو۔ بلکہ اللہ والے بنو۔ اس کے مطابق جو تم کتاب کو پڑھاتے اور پڑھتے ہو)

اس لئے ملت اسلامیہ کی مرکزی جماعت صرف قرآنی قوانین الٰہی کے نفاذ کا اختیار رکھتی ہے۔ اسی کی روشنی میں ہنگامی ضروریات کے لئے وہ ضوابط تیار کرے گی۔ اور کوئی ایسا قانون نہیں بنا سکے گی جو قرآن سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔

(اور جو کوئی اللہ کے اتارے ہوئے (اصول) کے مطابق حکم نہ دے وہ ظالم ہے)

ان دو مرکزوں یعنے اللہ کی حکومت اور مرکز ملت کی اطاعت کے لئے تیسرا ایمانی اور اعتقادی مرکز ملت اسلامیہ کا قرآن کریم ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے جس کی تعلیمات کسی ماحول۔ کسی زمانہ۔ کسی قوم اور کسی ملک کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ

ابدی اور حقیقی ہیں جو ہر احوال اور ہر زمانہ میں اٹل ہیں۔ کیونکہ یہ اس علیم و خبیر کی کتاب ہے جو زمانوں سے بالاتر ہے اور جو حقائق کا علم رکھتا ہے۔ اس سے نصیحت ہر فرد مسلم لے سکتا ہے مگر اس کو اجتماعی طور پر استعمال کرنے کے لئے اس کی تشریح و توضیح اور اس کے اصول سے زمانہ کے اقتضا کے مطابق فروع کے اخذ کرنے کا حق صرف مرکزی جماعت ہی کو حاصل ہے۔ بے شک قرآن ہر صاحب عقل کو دعوت دیتا ہے کہ آیات میں غور و فکر کرے۔ لیکن کسی کی کوئی تشریح اس وقت تک امت کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتی جب تک کہ مرکز اس کو تسلیم نہ کرلے۔ اسی طرح کوئی تلقین کوئی وعظ کوئی ارشاد یا رہنمائی امت کی بلا اجازت مرکز کے غلط قرار دی جائے گی۔ یہ بات اس موقع پر اجمالاً بیان کی گئی ورنہ اس کی مزید توضیح خود ایک جداگانہ مقالہ کی محتاج ہے۔

چوتھا مرکز اسلام کا مقامی ہے یعنی بیت اللہ جو توحید پرستوں کی پہلی مسجد ہے اور جس کے معمار حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے جو موحدوں کے پیشوائے اعظم ہیں۔ جنھوں نے بحکم الٰہی اکیلے اللہ کی عبادت کے لئے اس گھر کو بنایا اس وقت جبکہ دنیا میں کوئی دوسری مسجد نہ تھی۔

اللہ نے اس گھر کو برکت عطا کی اور سرچشمۂ ہدایت بنایا۔ جیسا کہ قرآن میں ہے۔

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ۔

(پہلا (توحید کا) گھر جو انسانوں کے لئے بنایا گیا ہے وہ جو مکہ میں ہے۔ برکت والا اور دنیا جہان کے لئے ہدایت ہے)

جب یہ گھر تیار ہو گیا تو اللہ نے حضرت ابراہیم کو حکم دیا کہ لوگوں میں اعلان کر دو کہ یہاں حج کے لئے آیا کریں۔

وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ

(اور انسانوں میں حج کا اعلان کر دے۔ وہ تیرے پاس پاپیادہ اور لاغر سواریوں پر جو دور دراز آتی ہیں آئیں گے۔)

یہ اعلان کل انسانوں کے لئے کیا گیا جیسا کہ لفظ الناس سے ظاہر ہے لیکن مراد یہاں بنی نوع انسان کے موحدین ہیں کیونکہ اس گھر کی بنیاد توحید پر ہی ہے اور قرآن نے اس میں غیر موحدوں کا داخلہ بند کر دیا ہے۔

إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَٰذَا۔

(مشرک تو نجس ہیں اس سال کے بعد وہ مسجدوں کے پاس بھی نہ پھٹکیں۔)

یہاں ضمناً یہ بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی اسلام لے کر روز اول سے وہی دین الٰہی ہے اور تمام انبیاء سابقین کے ذریعہ سے اسی دین کی تلقین دنیا کو کی گئی ہے اور یہی دین آخر میں حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ

پر عمل کیا گیا ہے جملہ انسانوں کو ایکساں قرار دیا ہے۔ اور نسل۔رنگ۔ملک یا زبان کے اختلاف سے ان میں کوئی تفریق نہیں کی ہے۔ ہاں ایک تفریق وہ ضروری قرار دیتا ہے یعنے اسلام اور کفر۔ جو لوگ عہد الست پر قائم ہیں اور انبیاء کے ذریعہ سے ملی ہوئی تعلیم کے تابع' ان کو وہ اولیاء الرحمٰن کہتا ہے اور جو لوگ شرک یا کفر میں مبتلا ہیں ان کو اولیاء الشیطان یہ تفریق بلا امتیاز قوم و نسل قائم رہی ہے اور قیامت بلکہ جنت اور دوزخ تک رہے گی۔

الغرض کعبہ کو اللہ نے موحدوں کا بین الاقوامی مرکز قرار دیا۔ اور خاتم النبیین کے عہد میں اس مرکزیت کو مستحکم کرنے کے لئے جملہ ملت اسلامیہ کا قبلۂ نماز بھی اسی کو بنا دیا۔ آج حضرت ابراہیمؑ کے اعلان کو کم و بیش چار ہزار سال ہوگئے ہیں حج کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اور سالانہ اس مرکز میں دنیا کے چاروں گوشوں سے موحد آکر جمع ہوتے ہیں۔ اللہ نے نہ صرف اس مکان کو بلکہ اس زمان کو بھی مرکزی حیثیت کے لحاظ سے احترام بخشا جس میں یہ اجتماع ہوتا ہے

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَائِدَ

(اللہ نے کعبہ بیت اللہ کو انسانوں کے لئے دارو مدار قرار دیا نیز ماہ حرام کو قربانی کے جانوروں کو)

اس آیت میں کعبہ کی مرکزیت کی تصریح کی گئی کہ وہ موحدوں کی بین الاقوامی انجمن کا مرکز ہے۔ اور وہیں سے جملہ اجتماعی امور سرانجام پائیں گے۔ اور جس زمانہ میں یہ اجتماع ہوتا ہے اس زمانہ یعنے ذی قعدہ۔ ذی الحجہ اور محرم تینوں مہینوں کو محترم مہینہ قرار دیا جس میں ہر قسم کی لڑائی روک دی جائے گی تاکہ لوگ امن اور فارغ البالی سے اس اجتماع میں شریک ہو سکیں اس اجتماع کی غرض بھی اللہ نے صرف ایک مختصر جملہ میں بیان کردی ہے۔ یعنے

لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ تاکہ لوگ اپنے فائدوں کے لئے آن موجود ہوں

یہ فائدے کچھ اخروی ثواب ہی تک محدود نہیں ہیں۔ بلکہ دینی۔ دنیاوی۔ ملکی۔ ملی۔ سیاسی۔ تجارتی علمی اور عقلی وغیرہ ہر قسم کے فائدے اس میں داخل ہیں۔ اور یہی رکن ہے جس سے ملت کی ہر قسم کی خرابیوں کی اصلاح ہو سکتی ہے یہی مرکزیت باعث ہوئی کہ قرآن نے مسجد الحرام کے بین الاقوامی ہونے کا اعلان فرمایا۔

سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ۔ اس میں باشندے اور غیر باشندے یکساں ہیں

جس کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قرآنی بصیرت رکھنے والی جماعت نے جس میں حضرت عمرؓ اور عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ بھی شامل ہیں پورے شہر مکہ کو بین الاقوامی قرار دیا۔ اور وہاں کے کسی باشندے کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ کسی آفاقی اور باہر سے آنے والے حاجی کو اپنے گھر میں قیام سے روک سکے۔ بلکہ وہ مکہ کے گھروں میں کواڑ لگانے کو بھی پسند نہ کرتے تھے اور اگر کتوں وغیرہ سے تکلیف کا خیال نہ ہوتا تو اس کی اجازت بھی نہ دیتے۔

اب اگرچہ اعتقادی طور پر یہ چاروں مرکزیتیں ملّت اسلامیہ میں باقی ہیں لیکن سوائے کعبہ کی مرکزیت کے جس کی طرف مسلمان رخ کر کے نمازیں پڑھ لیتے ہیں اور سال میں حج کے لئے وہاں جمع ہو جاتے ہیں عملاً کوئی مرکز ان کا باقی نہیں رہا۔ اللہ کا عرش بریں کے ساتھ اب ہزاروں مالک زمین پر اور حاجت روا زیر زمین مان لئے گئے ہیں جن کی زیارت اور پوجا ہوتی ہے۔ رسول کی جگہ ہر وہ شخص لے لیتا ہے جو علماء کا لباس پہن کر لوگوں کی رہنمائی کے لئے کھڑا ہو جائے اور قرآن کے بجائے انسانی کتابیں دستور العمل بنی ہوئی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اب امّت اسلامیہ کے افراد صرف انفرادی حیثیت سے مسلمان ہیں اور اجتماعی حیثیت کا نام ہی نام باقی رہ گیا ہے اب اجتماعی اسلام کے لئے ملّت کا فریضہ یہ ہے کہ ان چاروں مرکزوں پر لوٹ کر آجائے یعنے اللہ کی اطاعت۔ مرکزی جماعت۔ قرآنی حکومت اور کعبہ کا بین الاقوامی سالانہ اجتماع ــــ مجھے یقین ہے۔ کہ انشاء اللہ یہ ہو کر رہے گا۔

یہاں پر یہ سوال کیا گیا کہ اس اجتماعیّت کے نئے سرے پیدا ہونے کی صورت کیا ہے؟

جواب میں کہا گیا کہ ہم میں سے کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو مایوسی یا نادانی سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ مذہب ایک شخصی اور انفرادی چیز ہے اس کو اجتماعی ہونے کی ضرورت ہی نہیں۔ لیکن یہ خیال قرآن کے بالکل خلاف ہے۔ وہ دین جو سارے عالم کی اصلاح اور ہدایت اور دنیا میں سرتاسر امن قائم کرنے کے لئے آیا ہے وہ شخصی یا انفرادی کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس کے انفرادی اعمال سے مقصود تزکیۂ نفس اور اللہ کا تقوٰے ہے تاکہ افراد جماعت کا جزو صالح ہو سکیں اس لئے مذہب کے انفرادی ہونے کا خیال دین اسلام کے متعلق نہ صرف غلط بلکہ باطل ہے۔

دوسری جماعت ہم میں ایسی ہے جو یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ امام مہدی آن کر سب کچھ کر دیں گے۔ بعض لوگ امام مہدی کے تو نہیں قائل ہیں لیکن یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی بلند شخصیت ایسی پیدا ہوگی جو اپنے شخصی وقار اور اقتدار سے ملّت کو ایک مرکز پر لائے گی مگر نتیجہ ان دونوں باتوں کا ایک ہی ہے یعنی وہ خود کچھ نہیں کرنا چاہتے۔ یہ خیالات اگرچہ بہت اطمینان اور تسلی کا باعث ہو سکتے ہیں مگر ان کی کوئی قرآنی سند نہیں ملتی۔ میرا خیال یہ ہے کہ موجودہ انقلابات جو عجلت کے ساتھ اقوام و ملل پر آرہے ہیں ان میں ایک ایسا وقت آجائیگا کہ مسلمان جن خطوں میں آباد ہیں ان میں آزاد سیاسی جمہوریتیں قائم کر سکیں گے۔ اور پھر حج کے بین الاقوامی اجتماع سے کام لے کر وضع قوانین میں پوری ملّت کو ہم آہنگ کرنے کے لئے وہ ساری جمہوریتیں اپنا ایک ملّی مرکز قائم کریں گی جس کے لئے مکّہ سے بہتر کوئی موزوں مقام نہیں ہو سکتا۔ اس طرح رفتہ رفتہ اللہ کی مدد سے ملّت ایک مرکز پر آسکے گی۔ میں اپنی قرآنی

بصیرت سے دیکھ رہا ہوں کہ مسلمانوں میں خیر امت ہونے کے امکانات موجود ہیں اور باوجود ہزاروں خرابیوں کے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم الشان روحانی برکتوں سے نہ اب تک یہ اللہ کو بھولے ہیں اور نہ اللہ نے ان کو بھلایا ہے۔ صرف رجوع الی اللہ کی ضرورت ہے کہ نفسیات نفس کے پردے اٹھ جائیں اور ہم اپنے کو پہچان سکیں اور پھر سب مل کر ایک اور ایک ہی مالک کے بندے بن جائیں۔

لمبی آنکھ

اور

قرآن کریم کی روشنی

(پرویز)

کسی نئی زبان کے سیکھنے میں کس قدر محنت درکار ہوتی ہے! لیکن انسان کے بچہ کو دیکھئے کہ وہ ان دشوار گذار مراحل کو کس آسانی سے عبور کر لیتا ہے۔ بچہ جب بولنے کی عمر کو پہنچتا ہے تو اس طرح بلا تکلف باتیں شروع کر دیتا ہے گویا یہ سب کچھ اسے پہلے ہی سے یاد تھا۔ لیکن بچہ وہی زبان بولتا ہے جو اس کے گرد و پیش بولی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ اسے پہلے ہی سے یاد نہ تھا بلکہ اس نے اپنے گہوارہ میں خاموش نگاہوں سے سب کچھ سیکھ لیا تھا اور سیکھا اس پختگی سے کہ نہ صرف الفاظ ہی ازبر ہو گئے بلکہ اس لب و لہجہ کی بھی پوری پوری نقل کر لی جو اس کے ماحول کی فضا کو متحرک کر رہا تھا۔ اور نقل بھی ایسی مکمل کہ دو لفظ بولنے سے معلوم ہو جائے کہ بچہ کس خطہ اور کس قبیلے سے متعلق ہے۔ بڑی عمر میں پہنچکر جو زبان سیکھی جائے اس میں اہل زبان کا سا لب و لہجہ پیدا کرنا، ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے اور ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں کہ یہ پہچانا ہی نہ جا سکے کہ اس کی وہ زبان مادری ہے یا بعد میں سیکھی ہوئی۔ لیکن بچہ اس نقل کرنے میں کمال کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ بچے کا ذہن کس قدر اخاذ ہوتا ہے اور وہ نقوش جو چپکے ہی چپکے اس کے لوح قلب و دماغ پر آغوش مادر میں منقش ہو جاتے ہیں کس قدر انمٹ اور دیرپا ہوتے ہیں۔ لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بچے کے دماغ کی یہ اخاذی اور اثر قبولی صرف زبان تک ہی محدود ہے! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ دماغ تو بہر حال دماغ ہے۔ جب وہ حروف و الفاظ اور لب و لہجہ کی حرکات و سکنات سے اس قدر متاثر ہوتا ہے تو گرد و پیش کے دیگر احوال و کوائف سے اثر پذیر کیوں نہ ہوگا! زبان کی اثر پذیری چونکہ الفاظ کے محسوس پیکروں میں ہمارے سامنے آجاتی ہے اس لئے ہم اسے ناپ لیتے ہیں۔ لیکن خیالات کی اثر پذیری چونکہ بچے کے قلب و دماغ میں غیر محسوس طور پر پرورش پاتی ہے اس لئے ہم اس کا احساس نہیں کرتے۔ کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ جنھوں نے کرنا چاہا انہوں نے ان غیر محسوس خیالات کو بھی ناپ اور تول کر دیکھ لیا۔ علم تجزیۂ نفس کی بنیاد ہی اس اصول پر ہے۔ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کا بچہ اپنے وراثتی اور ماحولی اثرات کا پیکر ہوتا ہے۔ اور یہی نقوش و اثرات آہستہ آہستہ وہ مستحکم بنیادیں بن جاتے ہیں جن پر اس کے نظریات زندگی اور معتقدات حیات کی فلک بوس عمارتیں قائم ہو جاتی ہیں۔

یہ اثرات جب توارث و تواتر سے نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے چلے آئیں تو ان کی ابتدا کتنی ہی غلط نہج پر کیوں نہ ہوئی ہو رفتہ رفتہ اس قوم کے نزدیک یہی صداقت و حقیقت کا معیار بن جاتے ہیں اس قوم کے فرد انتہائی خوش عقیدگی سے دل کے نازک ترین گوشوں میں چھپائے ۔ سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں اور یہ غلط نظریات ان کے نزدیک ایسی گراں بہا متاع کی شکل اختیار کر جاتے ہیں کہ ان کا چھوڑنا تو ایک طرف ۔ چھوڑنے کے تصور تک سے وہ اس طرح کانپ اٹھتے ہیں گویا ان کی کائنات لٹی جارہی ہے ۔ غلط نظریات و معتقدات کے یہ حسین نظر فریب پردے اتنے دبیز ہوتے ہیں کہ فطرتِ صحیحہ ان کے نیچے دب جاتی ہے اور آہستہ آہستہ اس کا گلا اس طرح سے گھٹ جاتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد محسوس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کہیں زندہ بھی ہے یا نہیں ۔ اب سوال یہ ہے کہ ان پردوں کو کون اٹھائے ! اس خاص ماحول میں تو کم و بیش ہر ایک ان وراثتی اثرات سے متاثر ہوتا ہے ۔ مبدا فطرت کی کرم گستری نے یہ انتظام اپنے ذمہ لیا کہ وقتاً فوقتاً ایسے پیغامات اس کی طرف سے آتے رہیں جو وراثت و ماحول کے تمام اثرات سے محفوظ و غیر متاثر اور انسان کی فطرتِ صحیحہ کے عین مطابق و موافق ہوں ۔ دنیا میں سلسلۂ وحی و رسالت کی یہی لِم اور انتظام رشد و ہدایت کی یہی غائت ہے ۔ یعنی انسان کی فطرتِ صحیحہ وراثت اور ماحول کے اثرات سے مسخ ہو جاتی ہے اور پیغامِ خداوندی ان غیر فطری اثرات کو دور کرنے کے لئے بھیجا جاتا ہے ۔ سعید روحیں فطرت سے ہم آہنگ پیغام کو جانی پہچانی ہوئی (معروف) آواز سمجھ کر اسے قبول کر لیتی ہیں ۔ سرکش و متمرد انسان اپنے وراثتی معتقدات کو ایسا محکم اور یقینی خیال کر لیتا ہے کہ ان میں کسی قسم کے رد و بدل پر آمادہ نہیں ہوتا اور لاکھ ہزار دعوتِ غور و فکر دیجئے وہ اس پیغام کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتا ۔ حق و باطل ۔ خیر و شر کفر و اسلام کی یہی کشاکش ہے جو روزِ ازل سے اس وقت تک ہر جگہ جاری و ساری ہے ۔ سورۂ اعراف کے بائیسویں رکوع کو کھولئے اور دیکھئے کہ اس حقیقت کبریٰ کو کس بصیرت افروز انداز میں بیان فرمایا گیا ہے ۔ ارشاد ہے

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰی شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ

اور جب تمہارے رب نے بنی آدم سے ۔ یعنی اس ذریت سے جو ان کے ہیکل سے پیدا ہونے والی تھی ۔ عہد لیا تھا اور انھیں (یعنی ان میں سے ہر ایک کو اس کی فطرت میں) خود اس پر گواہ ٹھہرایا تھا (عہد یہ لیا تھا کہ) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں ؟ سب نے جواب دیا تھا کہ ہاں تو ہی ہمارا رب ہے ۔ ہم نے اس کی گواہی دی ۔ اور یہ اس لئے کیا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ تم قیامت

کے دن عذر کر بیٹھو کہ ہم اس سے بے خبر تھے۔

یعنی خدا کی ربوبیت کا اقرار خود فطرتِ انسانی کے اندر ودیعت کر کے رکھ دیا گیا ہے اور انسان کی فطرت صالحہ کا تقاضا ہے کہ وہ دین کی اس صراطِ مستقیم پر رہے۔ اب اس سے اگلی آیت میں ہے کہ وراثتی اثرات انسان کو شرک کے غلط راستے پر ڈال دیتے ہیں۔

او تقولوا انما اشرک اباؤنا من قبل وکنا ذریۃ من بعدھم ۚ افتھلکنا بما فعل المبطلون ۝

یا تم یہ عذر کر بیٹھو کہ شرک ہم سے پہلے ہمارے آبا و اجداد نے کیا۔ ہم ان کی نسل میں بعد کو پیدا ہوئے اور لاچار وہی چال چلے جس پر پہلوں کو چلتے پایا) پھر کیا تو ہمیں اس بات کے لئے ہلاک کرے گا جو ہم سے پہلے جھوٹی راہ چلنے والوں کی تھی! (۷/۱۷۳)

اسے یہ واضح ہے کہ فطرتِ صالحہ کا تقاضا کچھ اور ہے اور غلط روی کے آبائی اثرات اس فطرت کو مسخ کر دیتے ہیں۔ ماحول و وراثت کے ان غیر فطری اثرات کو زائل کر کے فطرتِ صحیح کو بروئے کار لانے کا کیا طریق ہے؟ اس کے متعلق چار آیات بعد فرمایا کہ یہ صرف خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی ہدایت کے اتباع سے ہو سکتا ہے۔

من یھد اللہ فھو المھتدی ۚ ومن یضلل فاولئک ھم الخسرون ۝

جسے اللہ (اپنے قانونِ مشیت کے مطابق) ہدایت دے وہی سیدھی راہ پر ہے۔ اور جس پر (اسی قانون کے مطابق) راہ گم کر دے۔ تو یہ لوگ خسارے میں ہیں۔ (۷/۱۷۸)

لیکن وہ قانون کیا ہے جس کی رو سے خدا کے نازل کردہ پیغام سے ہدایت حاصل کی جا سکتی ہے اور وہ روش کونسی ہے جس سے اس ہدایت سے مستفید نہیں ہوا جا سکتا؟ اس کی تشریح اگلی آیت میں فرما دی جس میں ارشاد فرمایا کہ ہدایت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان خدا کی دی ہوئی عقل سے کام لے۔ ذہن و ادراک کی قوتوں کو کام میں لائے ڈھور ڈنگر کی طرح آنکھیں بند کر کے، جس ڈگر پر چلے آ رہے ہیں۔ اسی پر نہ چلا جائے۔ اگر انسان نے فکر و نظر سے کام نہ لیا تو اس پر ہدایت کی روشنی گم ہو جائے گی۔ روشنی سے تو وہی مستنیر ہو سکتا ہے جو اپنی آنکھیں کھول کر رکھے۔ آنکھیں بند کر کے، دوسروں کی لکڑی کے سہارے چلنے والوں کا انجام جہنم ہے فرمایا۔

ولقد ذرأنا لجھنم کثیرا من الجن والانس ۖ لھم قلوب لا یفقھون بھا ولھم اعین لا یبصرون بھا ولھم اذان لا یسمعون بھا ۚ اولئک کالانعام بل ھم

اضلّ اولٰئک ھم الغٰفلون ○

اور کتنے ہی جن اور انسان ہیں جنھیں ہم نے جہنم کے لئے پیدا کیا (یعنی ان کا بالآخر ٹھکانا جہنم ہونے والا ہے) یہ اس لئے کہ ان کے پاس عقل ہے لیکن اس سے سمجھ بوجھ کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان ہیں مگر ان سے سننے کا کام نہیں لیتے وہ (عقل و شعور کی قوتوں کو بیکار کرکے) چارپایوں کی مانند ہوگئے۔ بلکہ اُن سے بھی زیادہ کھوئے ہوئے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو یکسر غفلت میں ڈوب گئے ۱۷۹/۷

یہ ہیں وہ بنیادی خطوط جن پر حق و باطل کی کشمکش متشکل ہوتی چلی آرہی ہے یعنی فطرت صالحہ پر خارجی اور وراثتی اثرات غیر فطری پردے ڈال دیتے ہیں۔ اس پر پیغام خداوندی۔ جو ماحول وراثت کے تمام اثرات سے پاکیزہ و منزہ ہوتا ہے ان کے سامنے آتا ہے تقلیدی اثرات کا تقاضا ہوتا ہے کہ انسان اس دعوت پر غور و فکر نہ کرے بلکہ ضد سے اسی روش پر جاتا ہے جس پر اس کے آبا و اجداد چلتے رہے ہیں اور جسے وہ وراثتی اور گردوپیش کے خارجی اثرات کے ماتحت صحیح راہ سمجھ رہا ہے۔ اس کا نتیجہ جہنم ہے اور ہلاکت۔ جس دن سے خدا کا پیغام دنیا میں آنا شروع ہوا۔ اس دن سے آج تک جہل و بصیرت اور تقلید و تجدید کی یہ کشمکش جاری ہے۔ قرآن کریم میں امم سابقہ کے احوال و کوائف بیان کرکے اس حقیقت ازلی کو بے نقاب کیا گیا ہے تاکہ آنے والے لوگ اس سے عبرت حاصل کریں چنانچہ مندرجہ صدر آیات میں مذکور ہے کہ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ○ (۱۷۶/۷) سو اے پیغمبر یہ حکائیتیں لوگوں سے بیان کرو تاکہ وہ ان میں غور و فکر کریں۔

قرآن کریم کے بیان کردہ امم سابقہ کے ان قصص و حکایات کو سامنے لائیے اور پھر ان پر غور کیجئے آپ دیکھیں گے کہ بار بار اسی حقیقت کو دہرایا گیا ہے کہ آبائی تقلید سے انسان فطرت کے صحیح راستہ سے ہٹ جاتے تھے۔ اس کے بعد حضرات انبیاء کرام علیہم کی وساطت سے آسمانی پیغام ان تک آتا۔ لیکن ان میں سے اکثر اس سے محض اس لئے اعراض برتتے کہ وہ پیغام ان کے آبا و اجداد کی روش کے خلاف ہوتا۔ حالانکہ اس پیغام کی دعوت سراسر عقل و بصیرت اور غور و تدبر پر مبنی ہوتی۔ لیکن وہ لوگ غور و تفکر کے پاس نہ پھٹکتے اور جس راہ پر چلے آرہے تھے اسی پر چلے جانے میں عافیت سمجھتے۔ سب سے پہلے قوم حضرت نوحؑ کو لیجئے۔ ان تک پیغام خداوندی آیا۔ لیکن انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ○ ۲۴/۲۳ ہم نے اپنے اگلے بزرگوں سے ایسی بات کبھی نہیں سنی۔

یعنی انکار کی وجہ یہ ہے کہ یہ دعوت ان کے اسلاف کی روش کے خلاف تھی اور انھوں نے اپنے بزرگوں سے کبھی ایسی بات نہیں سنی تھی۔

قوم نوحؑ کے بعد حضرت ہودؑ کی قوم کو لیجئے۔ جب ان سے کہا گیا کہ ایک خدائے قہار کی عبودیت اختیار کرو تو انھوں نے کہا کہ۔

اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآءُنَا ؕ (پ۸)

کیا تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ ہم صرف ایک خدا کی عبودیت اختیار کریں اور ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی عبودیت ہمارے آبا و اجداد کرتے چلے آئے ہیں

یہی سازِ کہن کہ جس روش پر اسلاف چلتے آرہے ہیں اسے چھوڑ کر اس نئی روش کو کس طرح اختیار کر لیا جائے یعنی اپنے مسلک کی تائید و صداقت میں کوئی دلیل نہیں کوئی برہان نہیں۔ بس دلیل ہے تو فقط اتنی کہ یہ وہ راہ ہے جس پر ان کے آبا و اجداد چلتے آرہے ہیں۔

قوم ہودؑ کے بعد حضرت صالحؑ کی قوم کو دیکھئے۔ قوم کو اس مردِ صالحؑ سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ انھوں نے سمجھا تھا کہ یہ ہمارے باپ دادا کی روش پر چل کر ہماری پیشوائی کرے گا۔ لیکن جب اس نے حق و صداقت کی ایسی بات کہدی جو ان کے آبائی مسلک و طریق کے خلاف تھی۔ تو انھوں نے منہ پھیر لیا اور کہدیا کہ اف! کیسا افسوس کا مقام ہے۔ اس شخص سے کتنی امیدیں وابستہ تھیں اور اس نے کس طرح ان سب کو خاک میں ملا دیا۔

قالوا یصلح قد کنت فینا مرجوًا قبل ھذآ اتنھٰنآ ان نعبد ما یعبد اٰبآؤنا و اننا لفی شك مما تدعونآ الیہ مریب

انہوں نے کہا کہ اے صالح پہلے تو تو ایک ایسا آدمی تھا کہ ہم سب کی امیدیں تجھ سے وابستہ تھیں۔ پھر کیا تو ہمیں روکتا ہے کہ ہم ان معبودوں کی عبودیت اختیار نہ کریں۔ جن کی عبادت ہمارے آبا و اجداد کرتے چلے آرہے ہیں۔ ہمیں تو اس بات میں بڑا ہی شک ہے جس کی طرف تم دعوت دیتے ہو کہ ہلکے ملیں نہیں آتی ۱۱/۶۲

ایسا ہی جواب حضرت شعیبؑ کو اپنی قوم کی طرف سے ملا۔ انھوں نے قوم کو اس غلط راستے سے روکا جس پر وہ آبائی تقلید کی رو سے آنکھیں بند کرکے چلے آرہے تھے۔ تو قوم نے جواب دیا۔

قالوا لشعیب اصلوٰتك تامرك ان نترك ما یعبد اٰبآؤنا و نفعل فے اموالنا ما نشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ۝

قوم نے کہا کہ۔ اے شعیب۔ کیا تیری یہ نمازیں تجھے یہ حکم دیتی ہیں کہ ہمیں آ کر کہے کہ ان معبودوں کو چھوڑ دو جن کی عبودیت تمہارے باپ دادا اختیار کرتے چلے آئے ہیں! یا یہ تمہیں اختیار نہیں کہ اپنے مال میں جس طرح کا تصرف کرنا چاہو۔ کرو۔ بس تم ہی ایک نرم دل اور راست باز آدمی رہ گئے ہو! ۱۱/۴۷

غور فرمائیے! اس جواب سے انکار و اعراض کی راہ اختیار کرنے والوں کی نفسیاتی کیفیت کس طرح جھلک رہی ہے۔ یعنی ہمارے آباؤ اجداد سب غلط راستے پر تھے اور یہی ایک راہ راست پر ہے؟ بڑا آیا کہیں سے تقدس مآب"؟ (معاذ اللہ) اسلاف کی راہ پر آنکھیں بند کر کے چلنے والوں کی بالکل یہی کیفیت ہو جاتی ہے۔ ان کے قلوب پر بزرگوں کی عظمت و عقیدت اس درجہ چھا جاتی ہے کہ وہ انھیں معصوم اور منزہ عن الخطا سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ اور اسے برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص ان کی روش کو غلط بتائے!

یہی کچھ فرعون کی قوم نے کہا۔ جب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارونؑ ان کے پاس خدا کی کھلی ہوئی نشانیاں لے کر گئے جن کا کوئی جواب ان کے پاس نہ تھا۔ تو بالآخر انھوں نے وہی جواب دیا جو اس سے پیشتر آبائی اثرات کے تحت ہر داعی الی الحق کو ملتا چلا آیا تھا۔ قالوا اجئتنا لتلفتنا عما وجدنا علیه اباءنا وتکون لکما الکبریاء فی الارض وما نحن لکما بمؤمنین ٥

انھوں نے کہا! کیا تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ جس راہ پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو چلتے دیکھا ہے اس سے ہمیں ہٹا دو۔ اور ملک میں تم دونوں بھائیوں کے لئے سرداری ہو جائے ہم تو تمہاری بات ماننے کے نہیں! (۱۰/۷۸)

ملتِ حنیفہ کے مؤسّسِ اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ نے بھی جب اپنی قوم کو اس غلط راہ سے روکا جس پر ان کے آباؤ اجداد چلتے آرہے تھے تو انھیں بھی یہی جواب ملا کہ یہ وہ راہ ہے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو پایا۔

قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ٥ ۲۱/۵۳

انھوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو دیکھا۔ وہ انہی کی پرستش کیا کرتے تھے!

غرضیکہ جہاں جہاں اور جب کبھی پیغامِ خداوندی اپنی روشن دلیلوں کے ساتھ پہنچا تو ان لوگوں کی طرف سے جو اپنے آباؤ اجداد کے طور طریق پر چلے جانے میں ہی عافیت سمجھتے تھے اور ان کے ذہن میں یہ خیال جم چکا تھا کہ ان کے اسلاف کبھی غلطی نہ کر سکتے تھے۔ انھوں نے ہر جگہ اس پیغامِ حقیقت کی مخالفت کی۔ چنانچہ سورۂ ابراہیم میں تمام اقوامِ سابقہ کے متعلق جامع طور پر فرمایا کہ ان میں سے ہر ایک نے یہی روش اختیار کی اور حضرات انبیاءِ کرامؑ سے یہی کہا کہ

تُرِیدُونَ اَنۡ تَصُدُّوۡنَا عَمَّا کَانَ یَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَا - ۱۴

تم چاہتے ہو کہ جن معبودوں کی عبودیت ہمارے آباؤ اجداد اختیار کرتے چلے آئے ہیں۔ ان سے ہمیں روک دو

پھر جب ایسا ہوا کہ وہی نورِ آسمانی جو پہلے مختلف اقوام و ملل کے پاس قندیلوں کی شکل میں آتا رہا۔ ایک مہر عالمتاب بن کر چمکا۔ تو شپرہ چشم لوگوں نے حسب معمول یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ ہم کبھی آنکھیں نہیں کھولیں گے اس لئے کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو اسی طرح آنکھیں بند کئے ہوئے دیکھا ہے۔

بَلۡ قَالُوۡۤا اِنَّا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤی اُمَّۃٍ وَّ اِنَّا عَلٰۤی اٰثٰرِهِمۡ مُّهۡتَدُوۡنَ ۝

بلکہ انھوں نے کہا کہ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنے اسلاف کو ایک راہ پر چلتے دیکھا اور ہم انہی کے نقش قدم پر چلے جارہے ہیں۔ (۴۳/۲۱)

ایک دیدۂ بینا کے لئے یہ جواب یقیناً حیرت انگیز تھا کہ روشنی آجانے کے بعد اگر معلوم ہو جائے کہ جس راہ پر روایتی قوت کے ماتحت چلے جارہے ہیں وہ راہ ہلاکت و تباہی کے مہیب غاروں کی طرف لئے جارہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اسی راہ پر چلنے پر اصرار کرنا اور اس کے لئے دلیل یہ لانا کہ ہمارے آباؤ اجداد اسی راہ پر چلا کرتے تھے کھلی ہوئی حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ اس کے متعلق خود خالقِ فطرت نے بتایا کہ ان کی یہ روش کچھ انوکھی نہیں۔ بلکہ مسخ شدہ فطرت انسانی کا تقاضا ہی یہی ہے۔ جہاں جہاں روشنی آتی رہی۔ اسلاف کی تقلید میں آنکھیں بند کر رکھنے والے خفاشوں نے ہمیشہ اس کی طرف سے منہ موڑا۔

وَ كَذٰلِكَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ فِیۡ قَرۡیَۃٍ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ اِلَّا قَالَ مُتۡرَفُوۡهَاۤ ۙ اِنَّا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤی اُمَّۃٍ وَّ اِنَّا عَلٰۤی اٰثٰرِهِمۡ مُّقۡتَدُوۡنَ ۝

اور اسی طرح (اے رسولؐ) تجھ سے پہلے بھی جس بستی میں ہم نے کوئی آگاہ کرنے والا بھیجا تو وہاں کے تن آسان لوگوں نے یہی کہا کہ بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایک روش پر چلتے دیکھا ہے اور ہم انہی کے نقوشِ قدم کی پیروی کریں گے۔ (۴۳/۲۲)

جیسا کہ ظاہر ہے۔ یہ دلیل اتنی بودی اور یہ روش ایسی احمقانہ تھی کہ اس کی تردید کے لئے کسی بحث و تحمیص کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اس کے جواب میں اتنا ہی کہا جاسکتا تھا کہ جس روش کی طرف ہم دعوت دیتے ہیں وہ مسلک خواہ تمہارے آبائی مسلک سے کتنا ہی بہتر اور محکم کیوں نہ ہو۔ کیا تم پھر بھی اسی روشِ کہن پر ہی چلے جاؤ گے! یعنی اگر اس دعوتِ جدید اور آبائی مسلک کو دلائل و براہین کے ترازو میں رکھکر تولنے کی کوشش کرو جب تو ہم بتائیں کہ

یہ دعوت کس قدر گراں بہا ہے۔ لیکن اگر دلیل فقط اتنی ہو کہ یہ روش چونکہ ہمارے اسلاف کی روش کے خلاف ہے اس لئے سیدھی اور محکم ہے۔ تو اس کا کیا جواب؟

قالوا اولو جئتکم باھدی مما وجدتم علیہ اباءکم قالوا انا بما ارسلتم بہ کفرون ○

(ان پیغمبر نے) کہا کہ خواہ میں تمہارے پاس اس راہ سے جس پر تمہارے آباء اجداد چلتے تھے۔ کہیں زیادہ صحیح راہ لے کر آیا ہوں (تو کیا تم پھر بھی اس پرانی لکیر پر چلتے رہو گے؟) انھوں نے کہا کہ ہمارے پاس دلیل وحجت تو ہے نہیں لیکن) بات یہی ہے کہ ہم اس پیغام سے انکار کرتے ہیں جسے دیکر تم بھیجے گئے ہو۔ ۴۳/۲۴

یہی جواب سلسلۂ انبیائے کرام کی پہلی کڑیوں کی طرف سے دیا جاتا رہا اور یہی جواب اس مقدس سلسلہ کی آخری اور مکمل کرنے والی کڑی کی طرف سے دیا گیا۔

واذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما الفینا علیہ اباءنا اولو کان اباؤھم لا یعقلون شیئا ولا یھتدون ○

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو ہدایت نازل کی ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو اسی طریقہ پر چلیں گے جس پر اپنے اسلاف کو چلتے دیکھا ہے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ اگر تمہارے بڑے بوڑھے عقل سے کورے اور ہدایت سے محروم رہے ہوں (تو تم بھی عقل و ہدایت سے انکار کر دو گے؟) ۲/۱۷۰

انسانی ضد اور جہالت۔ بے دانشی اور بے راہ روی۔ وراثتی اثرات کے ماتحت اسلاف کی اندھی تقلید کی یہ داستان ہمارے سامنے ہے جو انسان کی آنکھ کھولنے کے دن سے لیکر حضور خاتم النبیین صلعم کے عہد مبارک تک مذکور ہے۔ لیکن کیا اس کے بعد اس بے دانشی اور اسلاف کی کورانہ تقلید کا سلسلہ ختم ہو گیا؟ ختم کیسے ہو سکتا ہے! ابلیس نے تو اللہ تعالیٰ سے قیامت تک کے لئے مہلت لے رکھی ہے سو جب تک ابن آدم دنیا میں موجود ہے ابلیسانہ حربے بھی اس کی راہ میں موجود رہیں گے۔ پہلی امتوں میں کیا ہوتا تھا؟ کچھ وقت تک وہ لوگ اپنے رسول کے لائے ہوئے پیغام کی اتباع کرتے۔ اس کے بعد جب نفسانی خواہشات ان پر غالب آجاتیں تو وہ رفتہ رفتہ دوسری شاہراہوں پر چل نکلتے۔ گمراہی کی یہ روش بالارادہ ہوتی۔ لیکن اس کے بعد آنے والی نسلیں غیر شعوری طور پر اپنے آباء و اجداد کے وراثتی اثرات کے ماتحت اس غیر فطری مسلک کو اختیار کئے جاتیں۔ اس کے بعد ایک اور رسول آجاتا۔ اس نے کہا

وگوں نے جہاں اپنے عمل کی راہ بدل لی تھی اس کے ساتھ ہی پیغامِ خداوندی میں بھی تحریف والحاق شروع کر دیا تھا۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ پیغام حوادثِ ارضی وسماوی کے ہاتھوں ضائع ہو جاتا۔ بہرحال وہ پیغام اپنی شکل میں موجود نہ رہتا۔ اس لئے ایک دوسرا رسول آتا اور تجدیدِ دعوت کرتا۔ نبی اکرمؐ کے بعد کسی رسول کی ضرورت باقی نہیں رہی اس لئے کہ خدا کا آخری پیغام اپنی اصلی شکل میں دنیا میں موجود ہے اور موجود رہے گا۔ لیکن اس پیغام کی محض موجودگی اس بات کی دلیل نہیں کہ جس طرح پہلی قومیں راہ راست کو چھوڑ کر آہستہ آہستہ وراثتی اثرات کے ماتحت غلط راستے پر چل نکلیں۔ یہ قوم غلط روش اختیار نہیں کرے گی۔ غلط روش اختیار کرنے کے لئے سینکڑوں محرکات اور ہزاروں اسباب پیدا ہو جاتے ہیں اس روش سے حفاظت وضمانت کا تو ایک ہی طریق ہے کہ انسان اپنے ہر ایک قدم کا جائزہ پیغام خداوندی کی روشنی میں لیتا رہے اور جونہی کوئی قدم غلط طریق پر اٹھنے لگے۔ اسے فوراً قرآن کی صراطِ مستقیم کی طرف بچائے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ مسلمان غلط راستے پر چلے۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ فلاں فرقہ غلط راستے پر چلا اور فلاں صحیح روش پر گامزن رہا۔ لیکن بہرحال یہ واقعہ ہے کہ ایک فرقہ نہ سہی دوسرا سہی۔ غلط روش پر ضرور چلا اور چلے جا رہا ہے۔ ملتِ واحدہ کا فرقوں میں بٹ جانا خود اس امر کی دلیل ہے کہ ہر ایک صحیح روش پر نہیں رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر فرقہ یہی سمجھتا ہے کہ میں راہ راست پر ہوں اور دوسرے فرقے غلط روش پر ہیں۔ اب ذرا سوچئے کہ اگر پہلی امتوں میں سے کسی امت کی یہی حالت ہو جاتی جو ہماری ہو چکی ہے (اور آج سے نہیں ایک عرصہ سے ہو چکی ہے) اور ان کی اصلاح کے لئے کوئی رسول آتا اور خدا کا پیغام ان کے سامنے پیش کرتا۔ تو ان کی طرف سے کیا جواب ملتا! وہی جواب جو ملتا چلا آیا ہے۔ یعنی یہ کہ چونکہ جو کچھ تم کہتے ہو، وہ ہمارے اسلاف کی روش کے خلاف ہے اس لئے ہم تمہاری نہیں سنتے! اس کے جواب میں وہ داعی الی الحق لاکھ پیغامِ خداوندی کی روشنی کو پیش کرتا لیکن اس کا وہی جواب ملتا جو حضرت صالحؑ کی قوم نے دیا تھا کہ ”ہاں ہمارے اسلاف سب غلطی پر تھے۔ بس تم ہی ایک راہ راست پر چلنے والے رہ گئے!“ آج ہماری اصلاح کے لئے کوئی رسول نہیں آ سکتا لیکن جو شمع رسولوں کی وساطت سے لا کرتی تھی۔ وہ تو ہمارے پاس موجود ہے۔ اب دیکھئے کہ آج بھی جو شخص قرآن کریم کی آسمانی قندیل کو سامنے لا کر قوم کو بتلاتا ہے کہ اللہ کی متعین کردہ صراطِ مستقیم کونسی ہے! اسے وہی جواب ملتا ہے یا نہیں جو پہلی قوموں کی طرف سے ملا کرتا تھا؟ یعنی یہ کہ تم جو کچھ کہتے ہو وہ ہمارے اسلاف کی روش کے خلاف ہے اس لئے ہم اسے قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ بھائی! میں تو کچھ نہیں کہتا۔ کہنے والی تو یہ خدا کی کتاب ہے! اس کا جواب کیا ملتا ہے؟ وہی سازِ کہن کی صدائے بازگشت!! کہ لو بھائی! یہ آ گیا کہیں سے بڑا معتبر

بھلا ہمارے بڑے بڑے قرآن جانتے تھے؟ وہ کہتا ہے کہ بھائی! اس میں بحث وجدل اور لڑائی جھگڑے کی کوئی بات نہیں یہ ہے قرآن اور یہ ہے تمہاری روش۔ تم خود پرکھ کر دیکھ لو کہ یہ روش قرآن کے مطابق ہے یا نہیں! اس کا جواب کیا ملتا ہے؟ وہی پرانا جواب کہ ہمیں پرکھنے کی ضرورت نہیں ہمارے آباؤ اجداد نے سب کچھ پرکھ لیا تھا! کہئے کہ اس کا کیا جواب! اور اس تمام مباحثہ و مجادلہ کے پیچھے جذبۂ محرکہ وہی "ایمان" کہ ہمارے آباؤ اجداد غلطی نہیں کرسکتے تھے۔ وہ معصوم اور منزہ عن الخطا تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس سے انسان کے جذبات کو بڑی ٹھیس لگتی ہے اگر اس سے کہا جائے کہ تمہارے بزرگ غلطی بھی کرسکتے تھے۔ بالخصوص جبکہ ان بزرگوں کے ساتھ عقیدت و ارادتمندی کے مقدس جذبات بھی وابستہ ہوں۔ ایسی مقدس ہستی اور غلطی؟ توبہ۔ توبہ۔ یہ بھلا کیسے ممکن ہے؟ لیکن انہیں کون سمجھائے کہ معصوم صرف رسول کی ذات ہوتی ہے۔ باقی ہر انسان سے غلطی کا امکان ہے اور غلطی سے کسی انسان کے تقدس اور بزرگی پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ ہم اپنے ہمعصروں میں غلطی کا امکان تسلیم کرتے ہیں۔ ان غلطیوں پر تنقید بھی کرتے ہیں۔ یہی ہمعصر آئندہ نسلوں کے اسلاف بن جائیں گے۔ اس لئے اسلاف میں غلطی کا امکان نہ ماننا! انہیں تنقید کی حد سے بالاتر سمجھ لینا کس دلیل کے ماتحت ہوسکتا ہے؟ محض یہ واقعہ کہ ایک شخص ہم سے سو برس پیشتر وفات پاچکا ہے۔ اسے منزہ عن الخطا نہیں بنا سکتا! اس کی تحقیقات کو قرآنی روشنی میں پرکھ لینے سے اس کی کسی قسم کی تحقیر و تذلیل نہیں ہوجاتی۔ ہر شخص کا فہم۔ ادراک تحقیق اس کے ماحول اور زمانہ سے وابستہ ہوتا ہے اس لئے اگر زمانہ مابعد کا انسان۔ اپنے کسی پیشرو کی تحقیق میں غلطی دیکھے تو درحقیقت اس سے اس پیشرو کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا وہ اپنے زمانہ اور ماحول میں گھرا ہوا تھا۔ اس نے جو محنت کی اور مشقت اٹھائی وہ ہمارے نزدیک درخور تحسین ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کی محنت کا ماحصل تمام کا تمام وحی منزل کی طرح واجب الاتباع سمجھ لیا جائے۔ پھر یہ تنقید و تحقیق کسی شخص کی ذاتی رائے کے تابع نہیں ہوگی بلکہ قرآن کریم کے مطابق ہوگی۔ اگر زیر تنقید معاملہ قرآن کے مطابق ہوا تو ہو المراد۔ اس کے صحیح تسلیم کرنے میں کسے انکار ہوسکتا ہے۔ اور اگر وہ قرآن کریم کے مطابق نہ نکلا تو اس سے رجوع کرلینے میں کونسی خفت ہوجائیگی۔ قرآن کریم تو وہ نصاب حیات ہے جس کی اتباع کا حکم خود ذات رسالتمآب کو بھی تھا۔

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِیَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (۶)

اے رسول! جو کچھ تیرے ربّ کی طرف سے وحی کی گئی ہے۔ تم اس کی پیروی کرو۔

اس لئے قرآن کریم کی اتباع میں اگر کسی بڑے سے بڑے بزرگ کا اپنا خیال بھی ترک کردینا پڑے تو اس

ذرا سا تأمل نہیں ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ حق کو کبھی انسانوں کے ذاتی خیالات کے تابع نہیں ہونا چاہیئے۔ اور جب ایسا ہوتا ہے تو کوئی شے اپنی اصل پر قائم نہیں رہنے پاتی۔ آج ہم جادۂ اعتدال سے اس لئے ہٹے ہوئے ہیں کہ ہم نے حق کو انسانوں کی آراء کے تابع رکھ چھوڑا ہے اور یہ سب، رائتی اثرات کے ماتحت غیر شعوری ہو رہا ہے۔ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ ۞ (۲۳/۷۱)
اگر حق لوگوں کی خواہشات کے تابع ہو جائے تو زمین و آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے درہم برہم ہو جائے
دین خداوندی کے اکمل اور آخری ہونے کی تو دلیل ہی یہی ہے کہ حق ہر وقت اپنی اصلی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ اس میں کسی قسم کی آمیزش نہیں ہوئی۔ اور یہی حق ہے جو جوہرات کے پرکھنے کا معیار ہے۔ اسی لئے اسلام کی دعوت علیٰ وجہ البصیرت ہے اندھی تقلید کی بنا پر نہیں۔ کورانہ تقلید میں بصیرت کا کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ اور یہ عقل و بصیرت کو اپیل کرنے والی دعوت نہ صرف صاحب قرآن (صلعم) کا ہی خاصہ و امتیاز تھا بلکہ حضورؐ کے متبعین کی بھی یہی روش زندگی بیان ہوئی ہے۔ ارشاد ہے۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۞ (۱۲/۱۰۸)
(اے رسول) تم کہدو کہ میری راہ تو یہ ہے کہ میں اس روشنی (بصیرت) کی بناء پر جو میرے سامنے ہے۔ اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور جن لوگوں نے میری اتباع کی ہے وہ بھی (اسی طرح حق کی طرف) دعوت دیتے ہیں۔

رائے کہ جو نظریات و معتقدات' وراثت و ماحول کے اثرات کے ماتحت۔ اسلاف کی بے جا عقیدتمندی کے لئے۔ اختیار کئے جائیں۔ ان کی دعوت علیٰ وجہ البصیرت کیسے قرار دی جا سکتی ہے!

لیکن مشکل یہ ہے کہ مسلمان یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ اسلاف پرستی اور کورانہ تقلید کے متعلق قرآنی تنبیہ فقط یہ امم سابقہ متعلق۔ یا زیادہ سے زیادہ نبی اکرمؐ کے زمانہ کے منکرین کے متعلق ہے۔ ہم سے اس کا کچھ واسطہ نہیں۔ حالانکہ قرآن کریم میں اقوام گذشتہ کے قصص و حکایات اور احوال و کوائف کا ذکر آیا ہی اس لئے ہے کہ آنے والے ان سے عبرت حاصل کریں۔ لیکن ہم ہیں کہ قدم بقدم امم سابقہ کے نقوش و آثار پر چلے جا رہے ہیں اور دل میں خوش ہیں کہ ہم بالکل صراط مستقیم پر گامزن ہیں۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ راستہ ہمارے اسلاف کا ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ اگر کسی راہ کی صداقت کے لئے اتنا ہی کافی ہو کہ وہ مسلک اسلاف سے منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے تو آپ

اپنے زمانہ میں پیدا شدہ فرقوں کے علاوہ کسی اور فرقہ کی کسی روش کی بھی تکذیب نہیں کرسکتے۔ اس لئے کہ وہ کون سا مسلک و مشرب ہے جو بڑے بوڑھوں سے منتقل ہو کر آئندہ نسلوں کو نہیں ملا۔ لہٰذا حق و صواب کی راہ یہ نہیں کہ اس کے ساتھ اسلاف کے نقوش قدم کی سند ہو بلکہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب از منہ اس کی تائید کرے۔ جب قرآن کریم سامنے آجائے تو اس وقت کوئی چیز۔ خواہ وہ تمہارے اپنے علم و عقل کی پیداوار ہو یا اسلاف سے منتقل ہوتی چلی آرہی ہو۔ کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ اس وقت حق و صداقت کا تقاضا ہے کہ خدائی سند کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے خواہ اس سے آپ کے اپنے علمی تقاضہ کو ٹھیس لگے یا اسلاف کی غلط عقیدتمندی پر حرف کیوں نہ آئے۔ قرآن کریم نے اسی حقیقت کو سورۂ لقمان میں اس طرح بیان فرمایا ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کی پیروی کرو۔ تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اسی روش کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آبا کو دیکھا ہے۔ خواہ (اس روش کے مطابق) انھیں شیطان جہنم کے عذاب کی طرف ہی دعوت کیوں نہ دے رہا ہو $\frac{31}{21}$

یہ تو ان کی کیفیت ہے جو اسلاف کے نقوش قدم پر بلا سوچے سمجھے چلے جانے ہی میں نجات و سعادت کی راہ خیال کرتے ہیں۔ اس سے اگلی آیت میں صحیح مسلک کا بیان ہے۔

وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ؕ وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝

اور جس نے اپنے آپ کو بخلوص قلب خدا (کے پیغام) کے سامنے جھکا دیا تو اس نے یقیناً ایک مضبوط شاخ کو پکڑ لیا اور انجام کار سب اللہ ہی کی طرف ہے۔ $\left(\frac{31}{22}\right)$

یعنی دین محکم نہ تو یہ ہے کہ تم اپنے خیالات کی ہی اتباع کرنے لگ جاؤ اور نہ یہ کہ جو کچھ اسلاف سے منتقل ہوتا چلا آرہا ہے بغیر دیکھنے پرکھنے کے اس پر گامزن ہونے چلے جاؤ۔ دین قیم یہ ہے کہ اپنے خیالات اور اسلاف کی طرف سے منتقل ہونے والے معتقدات سب کو قرآن کریم کے ترازو میں رکھ دو۔ جو وہاں سے پورا اترے وہ قابل تسلیم جس کا وہاں کچھ وزن نہ ہو۔ بلا تامل رد کر دینے کے قابل۔ یہ وہ عروۃ الوثقیٰ ہے جسے شکست و ریخت کا کوئی خوف نہیں۔ یہ وہ متاع گراں بہا ہے جسے کسی رہزن کا خطر نہیں۔ وتلك الامثال نضربها للناس لعلهم يتفكرون۔

وعظِ جدید!

ہر مسلمان پر نمازِ پنجگانہ فرض ہے
تاکہ یہ باقاعدہ ورزشِ حیات انگیز ہو

غور سے دیکھیں تو روزے کا بھی مقصد ہے یہی
تندرستی کا سبب یہ عادتِ پرہیز ہو

مدعا یہ ہے جو اہلِ زر پہ واجب ہے زکوٰۃ
ہر ادارے کا خزانہ نقد سے لبریز ہو

اس لئے حج کے سفر کا ہے مسلمانوں کو حکم
تاکہ ان کا جذبۂ سیر و سیاحت تیز ہو

رسمِ قربانی کا بھی دراصل یہ مقصود ہے
مردِ مومن جنگ میں سنگیں دل و خونریز ہو

جنّت و دوزخ سے ہے اک صورتِ امید و بیم
تاکہ یہ ذوقِ عمل کے واسطے مہمیز ہو

کوہکن ہیں ہم اُسی عقبیٰ کی جوئے شیر کے
جس سے دنیا ہی میں حاصل شوکتِ پرویز ہو

یوں نئے واعظ بیاں کرتے ہیں اس کی حکمتیں
دین جیسے اک دروغِ مصلحت آمیز ہو!

اسد ملتانی

نقد و نظر

۱۔ میری زندگی (ایک پنکھڑی)
(انگریزی)

رئیس الاحرار محمد علی جوہر۔ ایک شعلۂ درخشندہ تھا لیکن مستعجل۔ ابھرا۔ چمکا۔ اور گم ہوگیا۔ اور اس کے بعد متجسس نگاہوں کی حیرت اور متلاشی قلوب کی حسرت کے علاوہ اس کی کوئی یادگار بھی باقی نہ رہی۔ ڈھونڈنے والوں کو کچھ گری پڑی پتیاں ادھر ادھر ملیں۔ جن کا مجموعہ زیر نظر کتاب ہے۔ عنوان تو یہ ہے "میری زندگی" لیکن درحقیقت یہ ان کی کتاب زندگی کے چند پریشاں اوراق ہیں۔ ان اوراق کی تسوید کا قصہ بھی عجیب ہے۔ عجیب! لیکن درحقیقت جوہر کی فطری سیمابیت کی تھرکتی ہوئی مثال۔ مقدمہ کراچی میں سزایاب ہونے کے بعد قید کی تنہائیوں میں خیال پیدا ہوا کہ حضور رسالتمآب کی سیرت مقدسہ پر ایک کتاب لکھی جائے۔ تقریب ایک سال کی کدوکاوش کے بعد محسوس کیا کہ جیل کی فضا اس کے لئے سازگار نہیں۔ تو یہ ارادہ "اسلام۔ خدا کی بادشاہت" کے عنوان پر چار ضخیم جلدوں کی تصنیف کے خیال میں منتقل ہوگیا۔ ابھی ابتدائی مراحل بھی طے نہ ہونے پائے تھے کہ قید سے رہائی مل گئی۔ اور جتنا کچھ لکھا جاچکا تھا اس کے بعد اس پر کچھ اضافہ نہ ہوسکا۔ جو لکھا جاچکا تھا اسے مصنف کا ذاتی تعارف کہنا چاہیئے۔ نفس مضمون تک پہنچنے میں ابھی دیر تھی یہی "ذاتی تعارف" ہے جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ اور جسے جناب افضل اقبال صاحب (ایم۔ اے) نے ترتیب دیا اور شیخ محمد اشرف صاحب (تاجر کتب کشمیری بازار لاہور) نے انگریزی میں شائع کیا ہے۔ محمد علی (مدیر کامریڈ) کا قلم اور (وہ بھی انگریزی زبان میں) پھر تصنیف بھی خود اپنے متعلق بے ربطگی اور عدم تسلسل کے باوجود۔ خون میں حرکت اور آنکھوں میں آنسو پیدا کردیتے ہیں۔ کتاب پر تبصرہ گویا خود صاحب کتاب کی زندگی پر تبصرہ کرنا ہوگا جس کی نہ ضرورت ہے نہ محل۔ ترتیب میں بھی محنت سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن دیباچہ میں ایک ایسی چیز سامنے آگئی جو ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کی عام افتاد طبیعت کی غماز ہے۔ ہمارے مغرب زدہ نوجوانوں کا عام رجحان یہ ہے کہ مثلاً وہ اگر علامہ اقبالؒ کے فلسفہ پر قلم اٹھائیں گے تو یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ ان کا فلاں خیال ہیگل سے ماخوذ ہے اور فلاں مسئلہ برگساں سے۔ فلاں نظریہ نیتشے کا ہے اور فلاں مفہوم کانٹ کا۔ اور اس تمام سعی و کاوش سے مقصود فقط یہ بتانا ہوتا ہے کہ ہمیں مغرب کے اعلیٰ فلسفہ پر اس قدر عبور حاصل ہے۔

حکایتِ قدآں یار دلنواز کنم | باین فسانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

کتاب زیر نظر کا نام مصنف نے "اسلام۔خدائی بادشاہت" تجویز کیا۔ اس پر جناب مرتب ارشاد فرماتے ہیں۔

"اس نام نے مجھے وہ الفاظ یاد دلائے جو شلر نے اپنی رنگین ایوسی میں جرمن ہمعصروں سے کہے تھے۔ یعنی میرا خیال آنے سے پیشتر ہی تمام زمین تقسیم کر کے بانٹ دی جا چکی تھی۔ اور میرے لئے جو کچھ باقی بچا وہ فقط آسمان کی بادشاہت ہے۔

لیکن محمد علی کے سامنے۔ شاعر ہونے کے باوجود۔ ایک جداگانہ نظریہ تھا۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ کتاب کے عنوان کے متعلق کونسا خارجی اثر کارفرما ہوا تو وہ ایچ۔جی ویلز کا ناول "خدا۔ غیر مرئی بادشاہ" قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس امر کی کافی شہادت موجود ہے کہ مصنف نے یہ ناول غور سے پڑھا تھا۔ اور وہ اس سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہی اثر ان کی تصنیف کا جذبۂ محرکہ ہو۔"

یعنی چونکہ مولانا محمد علی مرحوم نے ایچ۔جی۔ ویلز کے ناول خدا۔ غیر مرئی بادشاہ " کا مطالعہ کیا تھا اور ان کی تصنیف کا عنوان بھی "اسلام۔خدائی بادشاہت" ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ اس خیال کا ماخذ ویلز کا ناول ہے۔ حالانکہ مصنف بچارا اپنی تصنیف کے ورق ورق پر بتاتا ہے کہ اسے قرآن سے کتنا عشق ہے۔ وہ اپنے بچپن ہی سے کس درجہ اس کتاب زندہ کا گرویدہ تھا اور کس طرح اس کے مطالعہ نے اس پر "خدائی بادشاہت" کی حقیقت واضح کی۔ لیکن ہمارے یہ نوجوان مرتب ہیں کہ انھیں "خدائی بادشاہت" کا تصور ایک اجنبی خیال دکھائی دیتا ہے جس کی تخلیق کے لئے کبھی شلر کی شاعری کا رہین منت ہونا پڑتا ہے اور کبھی ویلز کی افسانہ طرازی کا۔ ہم ان حضرات کی خدمت میں اس سے زیادہ اور کیا عرض کریں کہ۔

دگر بشاخِ گل آویز و آب و نم درکش | پریدہ رنگ ز باد صبا چہ می جوئی!

کتاب عمدہ طباعت اور کاغذ کے ساتھ پونے تین سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ مجلّد اور اس پر گرد پوش۔ قیمت فی نسخہ پانچ روپیہ چار آنے (صہ)

۲۔ **مسٹر جناح کی تقریریں اور تحریریں** (انگریزی) ملتِ اسلامیہ کے لئے جھوٹے قافلے میں ایک نے نوا آیا اور کاروان کے دل میں احساسِ زیاں پیدا کر کے یہ کہہ کر چلا گیا کہ۔

پس از من شعرِ من خوانند و می یابند و می گویند | جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

یعنی اس کے جانے کے بعد وہ نہیں تو اس کی نے کی دلکش صدائیں اس کے کلام کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہیں لیکن اس نے جاتے وقت جس رہبر فرزانہ کے ہاتھ میں یہ شمع دی - وہ اپنا پیغام شعر کے پیکر میں پیش نہیں کرتا - اس لئے اس کے گراں قدر الفاظ اخبارات کے صفوں پر دُرِ منتشرہ کی طرح بکھرے پڑے تھے - بارے شیخ محمد اشرف صاحب (تاجر کتب کشمیری بازار لاہور) کو اس ضرورت کا احساس ہوا اور انہوں نے جناب جناح کی - فروری ۱۹۳۵ء سے دسمبر ۱۹۴۱ء تک کی متفرق اور اہم تقریریں و تحریرات کو سلیقہ سے ترتیب دلا کر یکجا شائع کر دیا ہے - یہ فی الواقعہ ایسا کام ہے جس کے لئے ہم ناشر و مرتب کو مستحق مبارکباد سمجھتے ہیں - ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۱ء تک کا دور ملت اسلامیہ (ہندیہ) کی نشاۃ ثانیہ کا دور ہے اور جو انقلابات اس تھوڑے سے عرصہ میں آنکھوں کے سامنے آئے ہیں - پہلے صدیوں میں بھی رونما ہوا کرتے تھے - اس مختصر لیکن اہم دور میں ہندوستان کے مسلمانوں کے باب میں جناب جناح نے جو عدیم المثال جدوجہد کی ہے اس کا صحیح اندازہ آنے والا مؤرخ ہی لگا سکے گا - اس لئے جناب جناح کی اس دور کی تقریریں اور تحریریں نہ صرف عام سیاسی مسائل پر صحیح تبصرہ ہی ہیں بلکہ مسلمانوں کی سیاسی کشمکش کی ارتقائی داستان بھی ہیں - اس لئے ان کا مطالعہ نہ صرف ہمارے لئے بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے بھی نہایت ضروری ہے - ہم شیخ محمد اشرف صاحب سے گذارش کریں گے کہ وہ اب اس سلسلہ کو جاری رکھیں اور جناب جناح کی ہر سال کی تقریروں اور تحریروں کے مجموعے شائع کرتے جائیں - اگر ان کا کہیں اردو ترجمہ بھی شائع کیا جا سکے تو یہ بہت بڑی خدمت ہو - انگریزی نہ جاننے والے طبقہ کو صحیح اندازہ ہی نہیں ہو سکتا کہ ان کا ناخدائے کشتی ملت کیا کر رہا اور کیا کر رہا ہے -

طباعت کی خوبیوں کے لئے شیخ محمد اشرف صاحب کا نام کافی ضمانت ہے - ۵۱۳ صفحات مجلد گردپوش قیمت فی نسخہ چار روپیہ آٹھ آنہ - ۴/۸/-

---

۳- نورؔ | یہ ایک عجیب چیز ہے جو تبصرہ کے لئے ہمارے پیش نظر ہے - نہ کوئی تصنیف ہے نہ تالیف نہ کوئی پمفلٹ ہے نہ رسالہ - بلکہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے "اسلامیہ کالج فار ویمن" کی سکنڈ ایر کی ایک متعلمہ (سلیمہ اختر) کے وہ جوابات ہیں جو اس نے دینیات کے امتحان مقابلہ منعقدہ مارچ ۱۹۴۱ء میں دئے - جواب فی الواقعہ ایسے ہیں جن پر متعلمہ اس کے سرپرست حضرات اور خود کالج بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں - اسلام کی رُوح سے واقفیت اور پھر انداز بیان ایسا سلجھا ہوا طالب علموں کی صف میں کم از کم ہماری نظروں سے تو اس سے پیشتر گذرا نہیں - یہ جوابات کالج کے اسلامک سٹڈی سرکل کی طرف سے شائع ہوئی ہیں اور عوام کی تشویق کی غرض سے خالباً مفت تقسیم کئے گئے ہیں -

جمعیت العلماء

انسان کی نفسیاتی کیفیت بھی عجیب ہے۔ اصولاً کسی سے پوچھیے تو بلا تامل کہدے گا کہ ہر شخص سے غلطی کا امکان ہے۔ لیکن بہت کم ایسے ملیں گے جو اپنی غلطی کا اعتراف کھلی پیشانی سے کرلیں۔ بالعموم ہوتا یہ ہے کہ اگر کسی سے کوئی غلط بات کسی وقت کسی جذبہ یا خیال کے ماتحت منہ سے نکل جاتی ہے تو اس کے بعد وہ پوری کوشش کرتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اسے صحیح تسلیم کرا دے۔ اس سعی لاحاصل میں اس سے فریب خوردگی اور فریب دہی کے ایسے ایسے مظاہرے ہوتے ہیں کہ جس پر ساری دنیا ہنستی ہے لیکن اس سے اسے اور چڑھ سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ساری دنیا کے خلاف اس کے دل میں انتقام کی آگ شعلہ زن ہو جاتی ہے کچھ وقت کے بعد ایسا ہوتا ہے کہ یا تو قلب میں سکون پیدا ہو جانے کی وجہ سے یا خارجی احوال و ظروف کی بنا پر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے۔ انسانی زندگی میں آزمائش کی یہ گھڑی بڑی نازک اور کٹھن ہوتی ہے۔ غلطی کے اعتراف میں اپنی خودی کے (غلط تصور) کو ٹھیس لگتی ہے جس شد و مد سے اپنے غلط خیال کو صحیح ثابت کرنے میں تگ و دو کی تھی وہ تمام مراحل ایک ایک کرکے سامنے آجاتے ہیں۔ پھر نام کی شہرت۔ معتقدین کا خیال۔ گردوپیش کے نکمیوں کے اشارے یہ تمام تصورات جمع ہو کر اعتراف حقیقت میں گلوگیر ہو جاتے ہیں۔ ایسے وقت میں اگر اللہ کی توفیق شامل حال ہو جائے تو انسان ان تمام ذہنی موانع کو جھٹک کر الگ کر دیتا ہے اور نہایت کشادہ نگہی اور وسیع الظرفی سے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتا ہے۔ اور اس کے بعد وہ دیکھتا ہے کہ جھوٹی عزت کا زعم باطل جو اعتراف حقیقت میں یوں عنان گیر ہو رہا تھا اس کی اصل۔ اس کے اپنے دماغ کے بتکدہ سے باہر کہیں کچھ بھی نہ تھی۔ لیکن اگر اس کشمکش کے عالم میں یہی باطل تصورات انسان کے قلب و دماغ پر چھا جائیں تو وہ کبھی اعتراف حقیقت نہیں کرتا۔ بلکہ اپنی غلط روش پر پہلے سے بھی زیادہ شدت سے کاربند رہتا ہے حتیٰ کہ یہ راہ اسے ہلاکت و بربادی کے مہیب غار میں دھکیل دیتی ہے۔

ارباب نظر دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے علماء کرام کی جماعت آجکل ایسی ہی نفسیاتی کشمکش میں گرفتار ہے۔ اور اس کی کھلی ہوئی دلیل جناب حسین احمد صاحب مدنی کا وہ خطبۂ صدارت ہے جو انھوں نے جمعیت کے گذشتہ اجلاس (لاہور) میں ارشاد فرمایا۔ اس خطبہ میں علاوہ اس پریشانی تحریر کے جو صاحب تحریر کی قلبی کیفیت کی غماز ہے خیالات کا تضاد اس دورا ہے کی طرف صاف صاف اشارہ کر رہا ہے جہاں پہنچ کر انسان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

ہندوستان کا وہ کونسا مسلمان ہے جسے ۱۹۳۸ء کا وہ تاسف انگیز واقعہ نہ یاد ہوگا جب جناب مدنی نے یہ ارشاد فرما کر "قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں" اسلام سے پیشتر عہد جاہلیت کے بولہبی افسانۂ کہن کی پھر سے یاد تازہ کر دی تھی۔ اور یہ بھی کسے نہ یاد ہوگا کہ حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ نے انھیں کس طرح اپنے مخصوص انداز میں اس پر تنبیہ فرمایا تھا لیکن قوم کی بدبختی کہ بجائے اس کے کہ جناب مدنی اس تنبیہ سے اپنی غلطی کا اعتراف فرما لیتے۔ انھوں نے ضد اور کد کی راہ اختیار فرمائی اور اس تین چار سال کے عرصہ میں مسلمانوں کی بہت سی کوششیں جو اپنی تعمیر میں صرف ہونی تھیں۔ ان کی اس غلط روش سے پھیلنے والے زہر کے ازالہ میں ضائع ہو گئیں لیکن ہمیں خوشی ہوئی کہ واقعات نے جناب مدنی کو ان کی غلطی کے احساس پر مجبور کر دیا اور انھوں نے بالآخر محسوس کر لیا کہ فی الواقعہ قومیں اوطان سے نہیں بنتیں بلکہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمان اپنے جداگانہ تصوّر حیات (یعنی دینی اساس) کی بنا پر ایک الگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں چنانچہ انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں ارشاد فرمایا ہے۔

ہندوستان کے داخلی مسائل میں مسلمانوں کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے گذشتہ ایک صدی سے ہندوستان میں برطانیہ کی حکمت عملی نے مسلمانوں کو بھی ہندوستان کی اقلیتوں میں داخل کر کے ان کے متعلقہ مسائل کو اقلیتوں کے مسائل سے وابستہ کر دیا ہے۔ برطانوی سیاسیین اور مدبرین ہمیشہ مسلمانوں کو ایک سیاسی اقلیت کی صف میں شمار کرنے اور ان کے معاملے کو اقلیتوں کے معاملات میں شامل کرنے کے عادی ہو گئے ہیں اور اسی بنا پر ہندوستان کی غیر مسلم قومیں بھی ہندوستان کے سیاسی مستقبل میں مسلمانوں کے متعلقہ مسائل کے ساتھ وہی سلوک کر رہی ہیں جو اقلیتوں کے مسائل کے ساتھ کرنے والی ہیں یہ خیال انگریزوں اور غیر مسلموں تک محدود نہیں رہا بلکہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود مسلمانوں کے ایک طبقے کے دلوں میں بھی یہ احساس پیدا ہو گیا کہ وہ ہندوستان میں ایک سیاسی اقلیت ہیں اور اس وجہ سے وہ تمام اندیشے اور وسوسے اور خطرات ان کے دلوں پر چھا گئے جو ایک اقلیت کو اپنی زندگی اور انفرادیت کے متعلق اکثریت کی طرف سے پیش آتے ہیں اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستان کی مجموعی مردم شماری میں تعداد کے لحاظ سے مسلمان بھی عددی اقلیت میں ہیں لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ بجائے خود ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد یورپ کے کسی بڑے سے بڑے خطے کی آبادی سے کہیں زیادہ ہے نیز ہندوستان کی تعمیر میں ان کا حصہ سب سے زیادہ ہے ہندوستان میں ان کی تعداد نو اور دس کروڑ کے درمیان ہے۔ تہذیب اور ثقافت کے لحاظ سے وہ اہم

خصوصیات کے مالک ہیں جغرافیائی حیثیت سے انھیں قدرتی استحکام حاصل ہے۔ ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے چار میں وہ اکثریت رکھتے ہیں اور اگر صوبوں کی ازسرِ نو تحدید اور توسیع کیجائے تو وہ تیرہ مجوزہ صوبوں میں سے چھ صوبوں میں اکثریت حاصل کرلیں گے ان تمام حالات میں بھی اگر مسلمانوں کو ایک سیاسی اقلیت قرار دے کر دیگر اقلیتوں میں انھیں شامل کر دیا جائے تو اس سے زیادہ سیاسی غلطی اور کیا ہو سکتی ہے اور اس سے بڑا اور کیا فریب دنیا کو دیا جاسکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۳۸ء میں یونہی جناب مدنی کے منہ سے ایک بات نکل گئی جس کی جج میں وہ اڑ گئے۔ ورنہ وہ تو اس سے بہت پہلے (۱۹۲۳ء) میں بھی اس حقیقت کے قائل تھے کہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر متحدہ قومیت نہیں بنائی جاسکتی۔ چنانچہ جناب مدنی نے ۱۹۲۳ء میں جناب شوکت علی صاحب (مرحوم) کے نام اپنی ایک چٹھی میں تحریر فرمایا تھا۔

"چونکہ مسلمان ہندوستان میں اقلیت میں ہیں اور ہندو اکثریت میں اور ان کی اکثریت بھی غیر معمولی ہے اور تین اور ایک کی نسبت ہے۔ اور ان کی یہ حالت ہے کہ آج تک ڈاکٹر مونجے صاحب یہی فرما رہے ہیں کہ یہ سرزمین کسی مسلمان یا کسی فرقہ کی زمین نہیں ہے یہاں جو راج قائم ہوگا وہ ہندو راج ہوگا۔ مجھے کروڑوں ہندو رضاکاروں کی ضرورت ہے" جو مظالم آئے دن دفتروں میں شہروں میں اور ریاستوں میں کئے جا رہے ہیں اور جس تعصب اور عدم رواداری کا ثبوت حسب تصریح جناب ہندو دیوتا "گاندھی جی اور نہرو صاحب نے دیا ہے ان کی بنا پر ہم کسی طرح بھی اپنے ابنائے وطن کے ساتھ متحدہ قومیت کی توقع نہیں کر سکتے۔"

یہ الگ بات ہے کہ جناب مدنی۔ ہندوؤں کی تنگ نظری اور شقاوت قلبی کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ان سے متحدہ قومیت کی توقع نہیں رکھی جاسکتی اور حضرت علامہ اقبالؒ نے اپنی بصیرتِ فرقانی سے اس حقیقت کو بے نقاب دیکھ لیا تھا کہ کفر اور اسلام (یعنی مسلم و غیر مسلم) کے امتزاج سے کبھی ایک قوم بن ہی نہیں سکتی۔ ایسا تصور یکسر غیر اسلامی (یعنی عجمی) ہے۔ بہرحال ہمیں خوشی ہوئی کہ جناب مدنی نے اب حقیقت کا احساس فرمایا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت ایک قوم کی ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک اب دوسرا مسئلہ لیجئے۔ ۱۹۳۸ء میں جناب مدنی نے ارشاد فرمایا تھا۔

"ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو مسلمان سکھ۔ عیسائی۔ پارسی سب شامل ہوں۔ حاصل کرنے کے لئے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہئیے ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصول کے عین مطابق

ہے اور اسلام اس آزادی کی اجازت دیتا ہے" (زمزم ۔ ۱۲ جولائی ۱۹۴۳ء)

یعنی جناب مدنی کے نزدیک ہندو۔ مسلمان سکھ ۔ عیسائی پارسی ۔ (مسلم و غیر مسلم) کی مشترکہ حکومت مغربی انداز جمہوریت کی بنا پر اسلام کے اصول کے عین مطابق تھی حضرت علامہ نے اس پر بھی تنبیہہ فرمائی تھی اور کہا تھا کہ اسلام خود ایک نظام حکومت ہے جس میں "قانون سازی کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے۔ اس لئے مسلم و غیر مسلم کی مشترکہ حکومت کسی صورت میں بھی اسلام میں جائز قرار نہیں دی جا سکتی ۔ باقی رہی مغربی جمہوریت ۔ سو وہ انسانیت کے لئے لعنت اور درحقیقت نقاب پوش استبداد ہے۔ جناب مدنی نے اس کی بھی بڑی شدت سے مخالفت کی اور ارباب ذوق سے پوشیدہ نہیں کہ اس مخالفت میں انھوں نے کیا کیا کہہ ڈالا ۔ وہ ۱۹۳۸ء تھا اب دیکھئے کہ ۱۹۴۲ء میں آپ کا کیا خیال ہے۔ جمہوریت کے متعلق ارشاد ہے۔

شخصی حکومتوں اور ملوکانہ جبر و استبداد اور حاکمانہ خود غرضیوں اور شہوت پرستیوں وغیرہ کی وجہ سے عالم انسانی پر جو بربادی اور ہلاکت کے پہاڑ ٹوٹا کرتے تھے اس سے تنگ آکر انسانی دنیا نے انقلابات کے دروازے کھولے اور جگہ جگہ جمہوری نظام جاری کیا گیا۔ اگرچہ بعض ممالک میں شاہی خاندانوں کو بھی باقی رکھا گیا۔ مگر ان کو اس قدر بے دست و پا کر دیا گیا تھا کہ نظم و نسق اور عام رعایا کے متعلق کسی قسم کے تصرف کا اختیار باقی نہیں رکھا گیا تھا ۔ یہ جمہوری نظام اگرچہ ظاہری نظر میں عام انسانوں کے لئے خوشکن تھا اور ممکن تھا کہ ابتدائی مراحل میں اس میں پوری طرح ہر عام و خاص غریب و امیر کا لحاظ بھی رکھا گیا ہو مگر اقتدار کے قائم ہوتے ہی بوالہوسی اور سرمایہ پرستی کا غلبہ ہو گیا غرباء اور مزدوروں کے خون و پسینہ سے ہولی کھیلی جانے لگی۔ نظام میں اس قدر سرمایہ پرستی خود غرضی اور یورپین قومیت کی لعنت گھس گئی کہ عام انسانی دنیا شخصی حکومتوں سے اس قدر ہلاکت اور بربادی کا شکار نہیں ہوئی تھی کہ اس فریب جمہوریت اور نام نہاد خدمت خلق سے ہونے لگی بالآخر عالم انسانی میں دوبارہ انقلاب کا نشوونما ہوا اس غلط اور برباد کن جمہوریت کے نظام کو توڑنے اور اس کو مٹا دینے کے ولولے ظہور پذیر ہوئے۔

یعنی وہی جو ۱۹۳۸ء میں حضرت علامہ نے ارشاد فرمایا تھا۔ لیکن جناب مدنی کا سینہ احساس غلط روی اور اعتراف حقیقت کی جس کشمکش کی آماجگاہ بن رہا ہے اس کا مظاہرہ اس تضاد سے ہوتا ہے جو چند ہی صفحات کے بعد ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے ۔ اپنے خطبہ کے صفحہ ۲۶ پر اٹلانٹک کے نوشتہ کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں

کہ جب مسٹر چرچل نے اعلان کیا تھا کہ جنگ کے بعد کمزور قوموں کو آزادی دی جائے گی تو
ہندوستان کی مردہ امیدوں میں پھر زندگی کی ایک لہر پیدا ہوئی اور یہ خیال کیا گیا کہ جنگ کے بعد
دنیا میں زندگی۔ آزادی اور جمہوریت کا جو نیا نظام قائم کیا جائے گا ہندوستان بھی اس نظام
میں اپنا باعزت مقام حاصل کرے گا۔"

یعنی ابھی ابھی مغربی جمہوریت کو انسانیت کی لعنت بتایا جا رہا تھا اور ایک ہی سانس کے بعد ارشاد ہے کہ اس
احساس سے کہ جنگ کے بعد ہندوستان جمہوریت کے نئے نظام میں باعزت مقام حاصل کرے گا ہندوستان
کی مردہ امیدوں میں زندگی کی ایک لہر پیدا ہو گئی۔

اب دوسری شق لیجئے۔ یعنی کیا مسلم و غیر مسلم کی مشترکہ حکومت کا تصور اسلامی ہو سکتا ہے؟ جناب مدنی
صاحب کا سنہ ۱۹۳۰ء کا ارشاد ہم پہلے نقل کر چکے ہیں اب حکومت کے بارے میں آپ کا سنہ ۱۹۴۶ء کا خیال ملاحظہ
فرمائیے ارشاد ہے۔

اس لئے اوس خالق الکل رب العالمین کا بنایا ہوا انسانی نظام ہی ہر خاص و عام اور ہر فرد
و جماعت کے لئے مفید اور کار آمد اور انتہائی منفعت کا کفیل ہو سکتا ہے نہ کہ انسانوں کا
خود ساختہ نظام۔

اس کے بعد فرماتے ہیں :۔

ان اصول نے صاف طور پر یہ بھی روشن کر دیا ہے کہ کوئی امیر اور سلطان نہ مطلق العنان ہے
اور نہ صرف اپنے خاندان یا کسی پارٹی کا نمائندہ ہے اور نہ کسی استبدادی آمریت کا مالک ہے
بلکہ وہ خداوند کریم کا نائب اور خدائی قانون کو نافذ کرنے والا حاکم ہے اور اسی کے قانون
کے ماتحت جوابدہ اور مسئول ہے۔

پھر ارشاد ہے۔

بہرحال آج ہم تمام دنیائے انسانی کو دعوت دیتے ہیں کہ اگر وہ امن عام اور کار آمد ترقی اور
حقیقی رفاہیت اور خوشحالی چاہتے ہیں تو صرف اسلامی نظام میں ہی پا سکتے ہیں۔ بالشویزم یا
نازی ازم یا ایمپیریلزم یا فیشلزم ڈیموکریسی، یا اور کوئی نظام جو کہ انسانی عقل و دماغ کا اختراع کیا
ہوا ہے ہرگز اس کی کفالت نہیں کر سکتا اس لئے رب العالمین کے حقوق کی کفالت ہے نہ مخلوقات اور اقوام
و افراد انسانی کے حقوق کی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ جب اسلامی نظامِ حکومت وہ ہے جس کی تصریح ارشادات بالا میں کی گئی ہے تو پھر حضرات علمائے کرام نے اپنا موجودہ مسلک جس میں کفر اسلام کے امتزاج سے خالص انسانی حکومت۔ اور وہ بھی مغربی اندازِ جمہوریت کی۔ قائم کرنا مطمح نگاہ ہے کیوں اختیار فرمایا؟ اس کے متعلق ارشاد ہے۔

آپ کو تاریخ کے صفحات دیکھنے بالخصوص "علمائے ہند کا شاندار ماضی" کے دیکھنے سے پتہ چل جائے گا کہ علماء ہند نے ہمیشہ سے اسی مقصد کی تکمیل کے لئے کوشش کی ہے (حالانکہ شاندار ماضی میں ان کی جدوجہد کے سمندر میں سے چند قطرے ہی دکھائے گئے ہیں) مگر وائے بدقسمتی کہ باوجود انتہائی جدوجہد اور بے شمار قربانیوں کے اصل مقصد حاصل نہ ہو سکا، تب موجودہ احوال اور گردوپیش کی انتہائی مشکلات جو کہ داخلی اور خارجی بیحد و بے شمار ہیں ضروری معلوم ہوا کہ اہون البلیتین کو اختیار کیا جائے اور ہندوستان کی آزادی کے لئے مشترکہ جدوجہد میں حصہ لیا جائے۔ اہون البلیتین کو اختیار کرنا شرعی اصول ہے اور ہر زمانہ میں معمول بہ رہا ہے۔ اور اگرچہ مشترکہ جدوجہد سے حاصل ہونے والی آزادی نظام اسلامی نہ کہلا سکے گی تاہم بہت سی مشکلات اور سخت موانع کے رفع ہو جانے سے حقیقی نصب العین کے لئے راستہ کھل جائے گا۔

یعنی حضرات علماء کرام کا ہندوؤں کی آزادی کی تحریک میں حصہ لینا "دو مصیبتوں میں سے کمتر درجہ کی مصیبت اختیار کر لینے" کے شرعی اصول کے مطابق ہے۔ بہت اچھا! لیکن ذرا یہ بھی سنئے کہ ۱۹۲۳ء میں جناب مدنی کا اس قسم کی آزادی کے متعلق کیا خیال تھا۔ آپ نے جناب شوکت علی صاحب (مرحوم) کے محولہ بالا چٹھی کے دوران میں تحریر فرمایا تھا۔

"میں آنجناب کی توجہ ایک خاص طریقہ پر اور ایک حقیقت نفس الامری کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ آزادی کامل ہمارا مذہبی سیاسی۔ اور وطنی نصب العین ہے۔ اور ہر حیثیت سے ہم کو اس کی کوشش کرنی چاہیئے مگر اس کے ساتھ ہم اپنے مذہب اور قوم کو ضروری سمجھتے ہیں بلکہ آزادی کو بھی مذہب اور قوم کی وجہ سے ڈھونڈھتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ مذہب برباد ہو جائے اور مسلمان فنا ہو جائیں تو ایسی آزادی سے کیا فائدہ ہے"

یعنی خود جناب مدنی صاحب کے نزدیک وہ آزادی جس میں مسلمانوں کا مذہب اور قوم باقی نہ رہے مسلمان کے نزدیک قطعاً قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ایسی تحریک میں شمولیت اور تعاون یکسر غیر اسلامی ہوگا۔

یہ چیز کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد۔ ملک کی متحدہ قومیت کے جمہوری نظام حکومت میں مسلمانوں کے مذہب اور قوم کی کیا حالت ہوگی! اب کسی تشریح کی محتاج نہیں رہی۔ اس آنے والی آزاد حکومت کے ارباب حل وعقد کھلے کھلے الفاظ میں بتاچکے ہیں کہ

"اب یہ ناممکن ہوگا کہ کوئی ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جائے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آچکا ہے کہ ہم اس امر کا اعتراف کرلیں۔ اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھدیا جائے اور انھیں خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تو تصور بھی ناممکن ہے کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظامِ حکومت قائم ہوسکتا ہے ......

عہدِ حاضر میں بہترین نظامِ حکومت کی بنا اس نظریے پر قائم ہوسکتی ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتہ میں منسلک ہو کر ایک متحدہ قومیت بن جائیں"

(ہندوستان ٹائمز مورخہ ۹/۱۸ ۴۵ء)

یہ اسمبلی کی کانگریس پارٹی کے لیڈر مسٹر ڈیسائی کے ارشادات ہیں۔ اس ضمن میں پنڈت نہرو کے ارادے بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔

"جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں اسے ہندوستان میں یا دوسری جگہ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہوگیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اُسے یکسر مٹا دینے تک کی آرزو کی ہے۔ قریب قریب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا بے دلیل عقیدت اور تعصب کا، توہم پرستی اور لوگوں سے بیجا فائدہ اٹھانے کا۔ قائم شدہ حقوق اور مستقل حقوق کی بقا کا حامی ہے" (میری کہانی صفحہ ۔۔۔)

مسلم قومیت کے متعلق بھی سن لیجئے۔

"ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے بس یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم موجود ہے جو یکجا نہیں منتشر ہے مبہم ہے۔ اور غیر متعین ہے اب سیاسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نقطۂ نظر سے یہ

بہت دور از کار ہے ...... مسلم قومیت کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ہی نہیں بس مذہبی اخوت کا رشتہ ہی ایک چیز ہے" (میری کہانی جلد دوم ص۲۳۳)

پھر فرماتے ہیں۔

مسلم قوم کا تخیل تو صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے اور اگر زیادہ لوگوں کو اس پر اعتقاد ہوتا بھی تو حقیقت سے دوچار ہونے کے بعد اس کا خاتمہ ہو جاتا"

کس قدر تاسف سے لکھتے ہیں :-

ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں، گویا دو ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں"

اب اس کے بعد خود ہی اندازہ فرمائیے کہ یہ دلیل کہ علماء کرام نے "متحدہ قومیت" اور "مشترکہ حکومت" کا مسلک "اہون البلیتین" کے شرعی "اصول" کے ماتحت اختیار فرمایا تھا۔ کس قدر کمزور اور سست بنیاد ہے۔

اب اس مقام پر پہونچئے جہاں اس "دوراہے" کی کشمکش اور بھی نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ ہندوستان کی موجودہ جدوجہد کے مطامح نگاہ کے متعلق فرماتے ہیں۔

آئندہ آزاد ہندوستان میں برطانیہ نے اپنے مقاصد میں استعمال کرنے کی غرض سے مسلمانوں کے لئے کونسا سیاسی مقام تجویز کیا ہے؟ میں اس وقت اس بحث کو چھیڑ کر الجھنوں میں اضافہ کرنا نہیں چاہتا لیکن خود ہندوستان کے سیاسی مفکرین کے سیاسی تصورات کا جہاں تک تعلق ہے انھیں تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جو ہندوستان کے آئندہ آئین حکومت کی تشکیل اس طریق پر کرنا چاہتا ہے کہ فرقہ وارانہ اکثریت کی ایسی مستحکم مرکزی حکومت قائم ہو کہ مسلمانوں کو تمام ہندوستان میں ایک اقلیت کی جگہ ملے اور ان کی زندگی اور بقاء تمام تر ایک طاقتور اور ناقابل تسخیر اکثریت کی مرضی سے وابستہ ہو لیکن یہ تصور محض ایک پریشان خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا یہ تصور مذہبی سیاست ہونے کے علاوہ صائب الرائے مفکرین کے نزدیک ناقابل عمل بھی ہے اس تصور کو جس قدر جلد دماغوں سے محو کر دیا جائے اسی قدر ہندوستان کے مجموعی مفاد کے لئے بہتر اور ہندوستانیوں کے لئے

مفید ہوگا۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو پہلے گروہ کے تصور اور اس کے عواقب و نتائج سے گھبرا کر مسلمانوں کی نجات اور خوش عیشی کیلئے صرف یہ راستہ تجویز کرتا ہے کہ ہندوستان کی وحدت کو پارہ پارہ کرکے اپنا جداگانہ سیاسی منطقہ بنا کر براہ راست تاج برطانیہ کے ساتھ اپنی قسمت کو وابستہ کردے اس گروہ نے اپنے تقسیم ہند کے مطالبہ کو تو نہایت بلند آہنگی اور شدت کے ساتھ منظر پر لانا شروع کردیا ہے لیکن اس کے کسی پہلو پر ہلکی سی روشنی بھی نہیں ڈالی ظاہر ہے کہ ہندوستان کے ہر صوبہ میں مسلمانوں کی آبادی ان کے مذہبی مقدس شعائر، مساجد، مزارات علمی ادارے اوقاف وغیرہ اس قدر کثیر تعداد میں موجود ہیں کہ مسلمان کسی حالت میں ان کو نظر انداز نہیں کرسکتے اور تقسیم ہند کی صورت میں ان کا حشر کیا ہوگا اس پر مجوزین تقسیم بالکل خاموش ہیں اس لئے جب تک یہ نظریہ پوری تفصیل کے ساتھ روشنی میں نہ آئے اس وقت تک اس پر کوئی بحث بے سود اور بے نتیجہ ہے۔

یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ مجوزین تقسیم کے نزدیک بھی اسلامی منطقہ میں قائم ہونے والی حکومت کا دستور اساسی اسلامی اور الٰہی حکومت کا دستور نہ ہوگا اس کی بنیاد بھی یورپین طرز حکومت پر ہوگی اور اپنے تحفظ کے اطمینان ہوجانے پر اسے قبول کرنے میں بھی وہی اصول البلیتین اختیار کرنے کا اصول برتنا ہوگا۔ نیز اس نظریہ کے ماتحت ہندو منطقے اور مسلم منطقے قائم ہوجانے کی صورت میں ہندو منطقوں میں مسلمان جن کی پوزیشن زیادہ سے زیادہ ۱۴ فی صدی اور اکثری طور پر پانچ فی صدی ہوگی بالکل بے دست و پا اور زندہ درگور ہوجائیں گے اور مسلم منطقوں میں غیر مسلم جن کی تعداد ۴۵ فیصدی تک ہوگی مسلم حکومت کے لئے وبال جان ہوں گے۔

" پس مسلم منطقے ہندو منطقوں کے تقریباً ساڑھے تین کروڑ مسلمانوں کی تباہی اور ہلاکت کی دستاویز پر خود دستخط کرکے اور اپنی جگہ ایسی حکومت جس میں غیر مسلم متعصب موثر اقلیتیں ان کے لئے وبال جان ہوں حاصل کرکے کون سی فلاح و بہبود اور اطمینان و مسرت حاصل کرسکیں گے۔ کیا یہ غضب کچھ کم ہے کہ مسلم اقلیتوں کے مسلمانوں کی حفاظت کے لئے جو کام کیا گیا ہو وہ ایسے طرز پر کیا جائے کہ انھیں غریب بے کس مسلمانوں کی ساڑھے تین کروڑ کی تعداد ہلاک و برباد کردی جائے

اور اپنی اکثریت بھی شدید خطرات میں مبتلا ہو جائے۔

مسیر اگر وہ شہے جو ہندوستان کے آئندہ آئین کو وفاقی، لامرکزی اصول پر مرتب کرنا ہندوستان کے لئے اور اس کے تمام صوبوں اور قوموں کے لئے مفید اور قابلِ عمل سمجھتا ہے۔ وفاق میں شامل ہونے والی حکومتیں اپنی اپنی جگہ کلیتاً آزاد اور خود مختار رہیں گی، مرکزی حکومت ان کی آزادی میں کوئی مداخلت نہیں کرسکیگی۔ مرکز کو صرف وہ اختیارات ملیں گے جو وفاق کے اجزاء اس کو اتفاق رائے سے سپرد کریں گے اور غیر مصرحہ اختیارات صوبائی حکومتوں کو حاصل رہیں گے۔ ہر حکومت میں اقلیتوں کے تہذیبی، سیاسی، مذہبی حقوق کی حفاظت کی جائیگی اور ان کی صوابدید کے موافق تحفظات دیئے جائیں گے۔ اکثریت اپنے حقوقِ اکثریت سے مستفید ہوگی اور اقلیتیں امن و اطمینان کی زندگی بسر کریں گی۔ غیر مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمان اقلیت کو کسی تکلیف اور بے انصافی کا خوف نہ ہوگا۔ ان کے تمام سیاسی اور مذہبی حقوق اور مقدس شعائر بجائے خود محفوظ ہو جائیں گے۔ اور مسلم اکثریت کے صوبوں میں غیر مسلم اقلیتیں امن و اطمینان سے زندگی بسر کریں گی۔ اور ان کے ساتھ کوئی بے انصافی نہ کی جائے گی۔ اور ان کے تمام سیاسی اور مذہبی حقوق اور شعائر محفوظ ہو جائیں گے۔ ہندوستان کے ذی بصیرت اصحاب رائے اس تجویز کو موجودہ ماحول میں قابلِ عمل اور ہندوستان کے پیچیدہ مسائل کے حل کرنے کا واحد راستہ سمجھتے ہیں۔"

آپنے غور فرمایا کہ جناب مدنی کس طرح دوراہے کے بیچوں کے بیچ کھڑے ہیں۔ ایک طرف ہندوؤں کا مطالبہ کہ تمام ہندوستان کا مرکز ایک ہو۔ اور مستحکم ہو۔ دوسری طرف مسلمانوں کا مطالبہ کہ وحدت مرکز مسلمانوں کی غلامی کا استمراری پٹہ ہے۔ اس لئے مرکز بالکل اڑا دیا جائے اور ان دونوں کے درمیان ہمارے "علماء کرام" کا یہ مطالبہ کہ مرکز رہے لیکن کمزور سا رہے ؎

دینا وہ اس کا ساغرِ مے یاد ہے نظام
منہ موڑ کر اُدھر کو اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

بہر حال ہمیں خوشی ہوئی کہ یہ حضرات کچھ تو روبہ کعبہ ہوئے۔

اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

آپ ہنوز ترش رو ہونگے کہ یہ حضرات مسلمانوں کے مطالبہ کی کامل ہمنوائی کیوں نہیں کرتے جو یکسر مسلمانوں کی آزادی کے مرادف ہے۔ لیکن ہم خوش ہیں کہ یہ حضرات۔ غیروں سے کٹ کر ایک قدم اپنوں کی طرف تو بڑھے۔ بھلا ایک ہی جست میں کس طرح کاشی سے کعبہ جا پہونچیں۔ ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھکر سوچئے کہ غلطی کے کھلے کھلے اعتراف کے لئے کس قدر ہمت اور حوصلہ کی ضرورت ہوتی ہے جلدی نہ کیجئے کسی کو مطعون کرنے سے بیشتر اس کی مجبوریوں پر ضرور نگاہ ڈالئے۔

اک عمر کا رشتہ ٹوٹا ہے! مدت کا سہارا چھوٹا ہے!

دل سنبھلتے سنبھلتے سنبھلے گا! صبر آتے آتے آئے گا

گھبرائیے نہیں ان حضرات کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے۔ اب انشاء اللہ آہستہ آہستہ ؎

آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک

ہم اس لئے پر امید ہیں کہ ان حضرات نے اپنے دعوے کے ثبوت میں جو دلیل پیش کی ہے وہ اس قدر بودی ہے کہ اسے محض منہ رکھنے کی خاطر دلیل کہا جا سکتا ہے۔ جب یہ حضرات ذرا اور ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں گے تو ان پر اس کی کمزوری خود بخود واضح ہو جائے۔ جھگڑا تو سارا مرکز کا ہے۔ اب دیکھئے کہ مرکز کے مفید اور مضر ہونے کے متعلق ان حضرات نے کیا فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ

(۱) ایک مستحکم مرکز کے ماتحت نظام حکومت مسلمانوں کے غلامی کے مرادف ہوگا۔

(۲) اس مرکز کو کمزور کر دیا جائے (جیسا کہ جمعیۃ العلماء کا خیال ہے) تو مسلمانوں کے مذہبی حقوق۔ مقدس شعائر۔ خواہ وہ اقلیتوں کے صوبوں میں ہوں یا اکثریت کے سب محفوظ ہو جائیں گے۔ اور

(۳) اگر اس مرکز کو بالکل اڑا دیا جائے (جیسا کہ مسلمانوں کا مطالبہ ہے) تو اس سے (جمعیۃ العلماء کے خیال میں) مسلمان تباہ ہو جائیں گے۔ ان کے مذہبی حقوق پامال ہو جائیں گے ان کے مقدس شعائر منہدم ہو جائیں گے وغیرہ وغیرہ

آپ نے اس منطق پر غور فرمایا کہ

(۱) مرکز کو مستحکم رکھنے میں مسلمانوں کی غلامی اور بربادی

(۲) اسے کمزور کرنے میں آزادی اور

(۳) اسے بالکل فنا کر دینے میں پھر غلامی اور بربادی یعنی

(۱) سانپ کو کھلا چھوڑ دینے میں ہلاکت۔

(۲) اسے زخمی کر کے چھوڑ دینے میں عافیت اور

(۳) اسے مار ڈالنے میں پھر ہلاکت

ہمارا خیال ہے کہ جناب مدنی صاحب نے جان بوجھ کر ایسا کمزور مسلک پیش کیا ہے۔ تاکہ اگلا قدم اٹھانے میں آسانی رہے۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو اور ان لوگوں کا خیال غلط ثابت ہو جو ان حضرات کو ختم اللہ علی قلوبھم کی فہرست میں سمجھے ہوئے ہیں
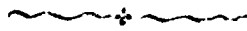
~~~~~ ❖ ~~~~~

اب ذرا پاکستانی اسکیم کے خلاف اعتراض ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہے

"یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ مجوزین تقسیم ہند کے نزدیک بھی اسلامی منطقہ میں قائم ہونے والی حکومت کا دستور اساسی بھی اسلامی اور دینی حکومت کا دستور نہ ہوگا۔ اسکی بنیاد بھی یورپین طرز پر ہوگی"

ہم اس اعتراض کی تردید میں زیادہ کچھ عرض کرنا نہیں چاہتے۔ اس نظریہ کو حضرت علامہ اقبالؒ نے سنہ ۱۹۳۰ء میں ان الفاظ سے ساتھ پیش فرمایا تھا۔

"ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے"

اور آج اس اسکیم کے علمبردار جناب جناح کا اسلامی حکومت کے متعلق کیا خیال ہے اس کے لئے طلوع اسلام کے اسی اشاعت کے اولین اوراق (بعنوان قائد اعظم) ملاحظہ فرمالیجیے بات خود بخود واضح ہو جائے گی۔

یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ پاکستان سے کیا مفہوم ہے۔ ایک سچے مسلمان کی کیا روش ہونی چاہیئے یہ ہم سے نہیں خود مدنی صاحب سے سنئے۔ ارشاد فرماتے ہیں۔

اگر کسی جدوجہد کے نتیجہ میں خدا کی ایک فرمانبردار ملت کو دنیا کے کسی حصہ میں خدائی احکام کے مطابق یا اس سے قریب تر کوئی اجتماعی نظام قائم کرنے کے مواقع حاصل ہوتے ہوں تو اس کو اسلام کی تائید حاصل ہو سکتی ہے اور صرف اسی جدوجہد کو اسلام نے جہاد فی سبیل اللہ اور
~~~~~

قتال فی سبیل اللہ قرار دیا ہے۔

ہم اس جدوجہد کی طرف آپ کو دعوت دیتے ہیں مسلم لیگ اسی جدوجہد کی حامل ہے۔

اس کے بعد جناب مدنی فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات محض انگریز کے پیدا کردہ ہیں (یعنی وہی دلیل جو سائے وارد ہاسے نازل ہوا کرتی ہے) ان سے پہلے کہیں اختلافات دکھائی نہیں دیتے تھے اس کے بعد کئی صفحات میں ایسے تاریخی شواہد پیش کئے ہیں جن سے ثابت کرنا چاہا ہے کہ انگریزوں سے پیشتر مسلمانوں اور ہندوؤں کے دور میں مسلمان اور ہندو سب شیر و شکر ہو کر رہتے تھے۔ کہیں اختلافات و تنازعات نہ تھے۔ وغیرہ وغیرہ

لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے عہدِ حکومت میں اگر باہمی تنازعات نہ تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ جہاں مسلمان حاکم تھے۔ ہندو محکوم کی حیثیت سے رہتے تھے۔ اس لئے محکوم کا حاکم سے جھگڑا کیا۔ اسی طرح جہاں ہندو حاکم تھے مسلمان ان کی رعایا تھے۔ راجہ اور پرجا میں لڑائی کیسی! جھگڑے اور تنازعے اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب قوت کی تقسیم کا سوال پیدا ہو آپ تو ہندوؤں اور مسلمانوں کی یاد دلاتے ہیں ڈیڑھ سو برس ادھر خود انگریز کے عہدِ حکومت میں دیکھئے۔ کہیں ہندو مسلم سوال نظر آئے گا۔ اس لئے کہ قوت ساری کی پوری انگریز کے ہاتھ میں تھی۔ ہندو مسلمان دونوں رعایا تھے جھگڑا اس وقت شروع ہوا جب قوت انگریز کے ہاتھ سے منتقل ہو کر ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آنے لگی۔ اس وقت ہندو نے تہیہ کر لیا کہ مسلمان سے اس کی آٹھ سو سالہ حکومت کا انتقام لیگا۔ جب تک مسلمان سویا رہا اور قومیت پرست حضرات نے اسے تھپکیاں دے دیکر اور بھی گہری نیند میں سلائے رکھا۔ ہندو اپنی من مانی کرتا رہا۔ کہیں لڑائی جھگڑا نہ تھا۔ لیکن جونہی مسلمان بیدار ہوا اور اس نے ہندو ہمسایہ سے کہا کہ مہاراج! خدا کی اس زمین میں دوسروں کو بھی زندہ رہنے کا حق دیجئے تو وہیں جھگڑا شروع ہو گیا۔ یہ ہے ہندو مسلم تنازعات کا پس منظر۔ چونکہ ہندوؤں نے ایک مدت سے شور مچا رکھا ہے کہ سب جھگڑے انگریز کے پیدا کردہ ہیں۔ اسے یہاں سے نکال دو سب جھگڑے طے ہو جائیں گے اس لئے آپ حضرات بھی ان کے دامِ فریب میں آ گئے۔ اور یہ نہ سوچا کہ ہندو ایسا کیوں کہہ رہا ہے!

اختلافات و تنازعات کی داستان دہرانے کے بعد جناب مدنی جس نتیجہ پر پہونچے ہیں۔ وہ یہی ساز کہن ہے کہ جداگانہ انتخاب بھی انگریزہی کا کرشمہ ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں۔

مسلمانوں کے ایک طبقے ذی بصیرت اور ماہر سیاست طبقہ کی رائے میں جداگانہ انتخاب مسلمانوں کیلئے زیادہ مضر ہے اور یہ تو یقینی ہے کہ اس کی موجودگی میں مختلف فرقوں کے درمیان آشتی اور سیاسی اور معاشرتی یگانگت اور اتفاق پیدا ہونا ناممکن ہے جو ہندوستان میں ترقی کیلئے ناگزیر ہے جمعیت علما ہند نے اس پر متعدد مجالس میں غور و بحث کر کے یہ سمجھا ہے کہ جمہوری اور نیابتی طرز حکومت کی صورت میں مخلوط انتخاب ہی پبلک کے درمیان رابطہ مودت و اتحاد قائم رکھ سکتا ہے اور جداگانہ انتخاب ہمیشہ ہمیشہ باہمی اختلاف اور کشمکش بلکہ فتنہ و فساد پیدا کرنے کے سوا کسی مفید نتیجے پر نہیں پہنچا سکتا جمعیۃ علماء نے اپنے سہارنپور والے فارمولا میں مسلم حقوق کی حفاظت کے تمام ذرائع اور شرائط محفوظ کرتے ہوئے مخلوط انتخاب قبول کرنے کی تجویز اسی نظریہ کے ماتحت رکھی تھی۔

ذرا اس ٹکڑے پر دوبارہ غور فرمائیے:۔

"جمعیۃ العلماء ہند نے اس پر متعدد مجالس میں غور و بحث کر کے یہ سمجھا ہے کہ جمہوری اور نیابتی طرز حکومت کی صورت میں مخلوط انتخاب ہی پبلک کے درمیان رابطہ مودت و اتحاد قائم رکھ سکتا ہے"۔

یعنی (۱) وہی جمہوری حکومت جسے ابتدائی صفحات میں لعنت قرار دیا گیا ہے۔ اس کے استحکام کے لئے مخلوط انتخاب ضروری قرار دیا جا رہا ہے۔

(۲) مخلوط انتخاب کا فائدہ یہ بتایا گیا ہے کہ اس سے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں مودت کا رشتہ محکم ہو گا! کیا ہم جناب مدنی سے دریافت کر سکتے ہیں کہ کافر و مومن میں سلسلہ مودت و مواخات قرآن کریم کی کونسی آیت اور اسوۂ نبی اکرمؐ کی کونسی شق کے مطابق جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد نفس مضمون پر آئیے یعنی مخلوط انتخاب میں مسلمانوں کے لئے کیا کیا خطرات ہیں۔ سو اس کی تفصیل ہم سے نہیں۔ جناب مدنی سے سنئے! آپ نے ۱۹۳۲ء میں جناب شوکت علی مرحوم کے خط میں لکھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے مخلوط انتخاب قبول کرنے سے حالانکہ وہ مشروط تھا فائدہ اٹھایا گیا اور قبل از تحقق اعلان کر دیا گیا کہ مسلمانوں نے مخلوط انتخاب قبول کر لیا ہے اب نشستوں کے

تعین کو بھی اٹھادو اور اس حیلہ سے اٹھادو کہ اکثریت کے لئے کسی جگہ نشستیں متعین نہ رہیں مسلمانوں کے لئے اپنی کمزوریوں کی وجہ سے مخلوط انتخاب ہی میں خطرہ تھا یعنی ہندو اثرات کی بناء پر ایسے بھیس بھرے مسلمان منتخب ہوں جو بے دین، ایمان فروش اور ہندو پرست ہوں۔ صورت ظاہر میں مسلمان ہوں اور باطن میں ہندو ہوں۔ ان سے جن کی تعلیم یافتہ طبقوں میں کثرت ہے کس اسلامی مفاد کی امید کی جا سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ اب جبکہ نشستیں بھی اٹھ گئیں تب تو مسلمان کا کسی بھی صوبہ میں اپنی شمار کے موافق ان نشستوں کا حاصل کرنا مستحیل ہوگا۔"

یہ دلیل کسی اضافے کی محتاج نہیں۔ یہ حقیقت ہے اور واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ ہندو کو اعتماد ہی اس مسلمان پر ہوتا ہے جو بے دین۔ ایمان فروش۔ اور ہندو پرست ہو۔ اور ہمیشہ بھیس بھر کر ان کے ایجنٹ کی حیثیت سے ملت اسلامیہ سے غداری کرتا رہے!

ہم یہ سطور لکھ رہے ہیں اور ہماری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے ہیں اس لئے کہ ایک سچے عالم کی جتنی قدر ہمارے دل میں ہے شاید ہی کسی اور قلب میں ہوگی۔ ہم ایسے عالم کی خاکِ رہگذر کو اپنی چشم بصیرت کا سرمہ سمجھتے ہیں۔ لیکن ہمارا دل خون ہو کر رہ جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان حضرات نے اپنی غلط روی اور بے راہ روی کی بنا میں عالم کے صحیح مرتبہ کو خاک میں ملا دیا اور آج مولوی کا لفظ انتہائی جہالت اور تنگ نظری کا مظہر قرار پا گیا۔ ملّت اسلامیہ کی اس سے بڑی بدبختی اور کیا ہو سکتی ہے! آج وقت وہ تھا کہ یہ گروہ علماء کرام۔ ہندوستان کی تحریک آزادیٔ اسلام میں سب سے پیش پیش ہوتا۔ ان کی ہر مجلس اور ہر محفل۔ ہر منبر اور ہر مسند سے یہ صدائے حق بلند ہوتی کہ ہم انسانوں کی حکومتوں کا خاتمہ کر کے ہندوستان کے (کم از کم) ایک گوشہ میں خالص خدائی حکومت کو قائم کریں گے اور یہاں اپنی قوتوں کو مستحکم کر کے پھر سارے ہندوستان اور ساری دنیا میں لوائے محمد الرسول اللہ کو سربلند و سرفراز کریں گے۔ یہ اٹھتے اور مسلمانوں کو دعوتِ سرفروشی اور جاں سپاری دیتے۔ پھر دیکھتے کہ ان کی عزت اور قوم کی عظمت کا کیا رنگ ہوتا۔

لیکن اللہ کی شان کہ آج یہ سعادت اسے نصیب ہے جس نے عمر بھر کبھی کسی مکتب کی شکل نہیں دیکھی۔ آج وہ اعلان کر رہا ہے کہ اسلامی حکومت کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اطاعت کا مرجع خدا کی ذات اور اس کی عملی شکل قرآنی احکام کا عملی نفاذ ہے۔ اس کی طرف سے یہ آواز بلند ہو رہی ہے۔ اور علماء کرام "سے اس کی

مخالفت ہو رہی ہے۔ توبہ توبہ۔

چنیں دور آسماں کم دیدہ باشد

ہم ان حضرات کی خدمت میں مؤدبانہ گذارش کریں گے کہ ضد اور حسد کو چھوڑ کر اب حقیقتِ ثابتہ کا کھلے کھلے الفاظ میں اقرار کر لیں۔ اس میں کسی قسم کی تحقیر نہیں غلطی کس سے نہیں ہو جاتی۔ آئیں۔ اور نہایت خندہ پیشانی سے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت میں بصدق دل شامل ہو جائیں جس کا نصب العین ہندوستان میں اسلامی حکومت کا قیام ہے۔ بلطف اس میں شامل ہوں اور پھر اللہ کی حکومت کے قیام کے لئے مسلمانوں کی قیادت کریں۔ دنیا میں بھی سرفرازی ہو اور عاقبت میں بھی سرخروئی۔

ہمیں یقین ہے کہ آپ حضرات جب مسلمانوں کے مطالبے کے اس قدر قریب ہو چکے ہیں تو اس کے بعد بیک کر بچھڑے ہوئے بھائیوں کے گلے مل جانے میں کچھ حجاب ہوگا؟ خدا آپ کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

جمعیۃ العلماء نے اپنے اجلاس لاہور میں چند تجاویز ایسی بھی پاس کی ہیں جنھیں دیکھ کر ہمیں خوشی ہوئی کہ اب ان حضرات کا قدم صحیح راستہ کی طرف اٹھتا دکھائی دے رہا ہے۔

تجویز (۱) جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بھی کہ فقہ اسلامی، عبادات، معاملات، تمدن اور معاشرت، سیاست اور اقتصادیات کے تمام اصول پر حاوی ہے۔ دیکھ رہا ہے کہ عصری ایجادات اور غیر اسلامی اصول اقتصادیات کے رواج سے ایسی صورتیں پیش آرہی ہیں کہ ان کے جواز و عدم جواز کے بارے میں علماء مختلف الرائے ہو جاتے ہیں اور ان کا باہمی اختلاف مسلمانوں کے لئے موجب تشویش و پریشانی ہوتا ہے۔

اس لئے یہ اجلاس طے کرتا ہے کہ جمعیۃ علماء ایسے جدید پیش آنے والے مسائل میں علماء متبحرین کی معتد بہ جماعت سے تبادلۂ خیالات اور بحث و مباحثہ غور و فکر کے بعد ایسے فیصلے مرتب کرائے جن پر علماء متبحرین کی زیادہ سے زیادہ جماعت متفق ہو پھر ان فیصلوں پر عمل کرنے کے لئے مسلمانوں میں شائع کر دیا جائے"۔

یہ وہ مسلک ہے جس کی طرف ہم چار برس سے مسلسل دعوت دے رہے ہیں اور جس کی بنا پر ہمیں ہدف طعن و ملامت بنایا جا رہا ہے۔ الحمد للہ کہ ان حضرات کو اس ضرورت کا احساس ہو گیا۔ لیکن ہم ان کی خدمت میں ایک اہم گذارش ضروری سمجھتے ہیں اور وہ یہ کہ آپ لاکھ جتن کر لیجئے۔ کوئی متفقہ علیہ مسلک اختیار نہ کر سکیں گے تاوقتیکہ آپ اپنے اختلافی معاملات کا حل قرآنِ کریم سے طلب نہیں فرمائیں گے۔ اختلافات صرف قرآن کریم سے مٹ سکیں گے

کہ قرآنِ کریم کا مقصد ہی اختلافات کا مٹانا ہے۔

ایک دوسری تجویز میں کہا گیا

(۲) جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس مسلمانوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ وقت کی نزاکت اور باہمی افتراق والشقاق کی ہلاکت خیزی اور اس کے عواقب ونتائج مشئومہ کا پورا پورا احساس کریں اور ان مختلف فیہ مسائل میں جو دورِ اول یعنی حضرات صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) اور تابعین وائمہ مجتہدین کے زمانہ سے مختلف فیہ چلے آتے ہیں، باہم دست وگریباں نہ ہوں۔ اپنی اپنی جگہ اپنے عقیدہ کے موافق مذہب راجح پر عمل کرتے ہوئے دوسرے خیال کے مسلمانوں پر زبان طعن دراز نہ کریں اور سب وشتم سے محترز رہیں۔ انما المومنون اخوۃ کے اتحت بھائی بھائی کی طرح زندگی بسر کریں اور باہمی تعاون وتعاضد کرکے کالبنیان یشد بعضہ بعضًا ایک مستحکم اور مضبوط دیوار بن جائیں جس کو کسی مخالف کی دشمنی کسی قسم کا گزند نہ پہونچا سکے۔

اسی طرح یہ جلسہ موت وحیات کی کشمکش کے اس دور میں تمام مسلم جماعتوں سے دردمندانہ اپیل کرتا ہے کہ اسلام اور قوم کی فلاح ونجات کی خاطر آپس کے اختلاف کو دلائل وبراہین کی روشنی میں تحقیق حق کے اصول پر وضع کرنے کی سعی کریں۔ اور اختلاف رائے کے باوجود باہمی منافرت اور توہین وتذلیل کا مذموم طریقہ اختیار نہ کریں کہ یہ اسلامی وقار اور قومی زندگی کے لئے تباہ کن اور اسلامی تعلیم کے سراسر خلاف ہے۔

یہ تجویز بھی موجب اطمینان ہے۔ اور مقام مسرت ہے کہ وہ حضرات جو اپنی ہستی کا راز فرقوں کے قیام میں دیکھتے تھے۔ آج زمانہ کے ہاتھوں اتنے مجبور ہو چکے ہیں کہ فرقہ بندی کی لعنت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی ضرورت محسوس فرما رہے ہیں خدا کا احسان ہے کہ اس نے ان حضرات کے دل میں یہ نیک خیال پیدا کر دیا۔ اس تجویز کے بارے میں ہم اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ بحالاتِ موجودہ اس مسلک پر کاربند ہوجئے کہ اصول دین میں اتفاق کرکے فروعات کے اختلافات کو اہمیت نہ دیجائے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ دین کے حقیقی نظام کے قیام کی فکر کیجئے۔ اور وہ نظام اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی اپنی حکومت ہو جس میں قرآنِ کریم کا قانون عملاً نافذ ہو اور اختلافات کی صورت میں مرکزِ ملت کی طرف رجوع کیا جائے۔ جب تک یہ نظام

قائم نہ ہوگا۔ دین اپنے صحیح اور حقیقی خطوط پر منتقل نہ ہوگا۔ حضور نبی اکرم کے اسوۂ مقدسہ نے دین کے تمکن کی یہی شکل بتائی ہے

ایک اور تجویز میں کہا گیا ہے۔

تجویز بابت مدارس عربیہ کا نصاب جمعیۃ علما ہند کا یہ اجلاس مدارس عربیہ دینیہ کے مروجہ نصاب میں دورِ حاضرہ کی ضرورتوں کے موافق اصلاح و تبدیلی کی ضرورت شدت سے محسوس کرتا ہے اور مدارس عربیہ کے ذمہ دار حضرات اور تعلیمی جماعتوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ ماہرینِ تعلیم کی ایک کمیٹی اس پر غور کرنے کے لئے باہمی مشورے اور تعاون سے مقرر کر کے ایک ایسا نصاب مرتب کرائیں جو دینی علوم کی تکمیل کے ساتھ ضروریاتِ عصریہ میں بھی مہارت پیدا کرنے کا کفیل ہو۔

اللہ کا شکر ہے کہ ان حضرات نے اس ضرورت کو بھی محسوس کر لیا۔ ورنہ ہمیں تو جب کبھی ان کے نصاب پر تنقید کی۔ ہمیشہ پیشانی کے تیوروں سے اس کا جواب ملا۔

ایک اور تجویز میں کہا گیا۔

جمعیۃ علماء ہند کا یہ جلسہ مسلمانوں سے اپیل کرتا ہے کہ ایک شہر میں بلا ضرورت دس دس بیس بیس مساجد میں نماز جمعہ قائم کرنے سے احتراز کریں۔ کیونکہ اس تعداد و انتشار سے نمازِ جمعہ قائم کرنے کا مقصد فوت ہو جاتا ہے اور شوکتِ اسلامیہ کے اظہار میں خلل پڑتا ہے حتی الامکان ایک مسجد میں تمام مسلمان نماز جمعہ ادا کریں۔ صرف وسیع شہروں میں نہایت شدید ضرورت کی بنا پر دو یا تین مساجد میں جمعہ پڑھا جائے تو مضائقہ نہ ہوگا۔ غیر ضروری تعداد کو جس نے جمعہ کی نماز کو بھی پنجگانہ نمازوں کی حیثیت دیدی ہے، جہاں تک جلد ممکن ہو موقوف کر دیا جائے۔

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی فرما دیا ہوتا کہ جمعہ کا خطبہ اس زبان میں دیا جائے جسے سامعین سمجھتے ہوں۔ ورنہ اس کے بغیر خطبہ اور اس طرح جمعہ کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ مساجد اس صورت میں آباد ہوں گی کہ ان میں صحیح دینی کشش پیدا کی جائے اور مسلمانوں میں وحدت اس شکل میں پیدا ہوگی کہ اختلافی مسائل کو چھوڑ کر جمعہ میں دین کے اصول کے متعلق خطبات دئے جائیں۔

ہم ان تجاویز کو دیکھ رہے ہیں اور ہماری جبینِ نیاز اس درگاہِ صمدیت کے عتبۂ عالیہ پر بہ ہزار خشوع و خضوع جھک رہی ہے کہ اس نے ان ناتواں وضعیف بندوں کی آواز میں یہ اثر پیدا کر دیا کہ چار سال کے قلیل ترین عرصہ میں مولوی صاحبان کے گروہ میں یہ انقلاب نظر آرہا ہے۔ حالانکہ ان حضرات کے سب و شتم سے بظاہر یہ نظر آتا تھا کہ یہ کبھی اس راہ کی طرف نہیں آئیں گے لیکن صداقت کی آواز ضرور اثر کرتی ہے۔ یہ اللہ کا احسان ہے جس کے لئے ہم اس کے حضور ہمہ تن سجود ہیں۔

ایک اور تجویز میں کہا گیا۔

جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس اسلامی ممالک خصوصاً عراق، ایران شام فلسطین وغیرہ کے موجودہ نازک ترین حالات کو نہایت خطرہ کی نظر سے دیکھتا ہے۔ کہ ان اسلامی ممالک کو استعمار پسند طاقتیں کس طرح اپنے اغراض فاسدہ میں استعمال کرنے کے لئے مقہور و مجبور کر رہی ہیں۔ ان کی تسلیم شدہ آزادی کو پامال کیا جارہا ہے یا ان کے فطری حقِ آزادی سے انھیں محروم کرنے یا رکھنے کے لئے کیسے کیسے حیلے تراشے جارہے ہیں جمعیۃ علماء بار بار اس امر کا اعلان کر چکی ہے اور آج بھی اس اعلان کا اعادہ کرتی ہے کہ اسلامی ممالک پر کسی اجنبی طاقت کا تسلّط اور قہر و غلبہ مسلمانانِ عالم کسی طرح برداشت نہیں کرینگے اور جب تک اسلامی ممالک پر سے استعمار پسند طاقتیں اپنا تسلّط بالکلیہ نہ اٹھالیں گی اور ان کو آزادئ کامل کی فضا میں سانس لینے کا موقعہ نہ دینگی اس وقت تک مسلمان چین سے نہیں بیٹھیں گے اور مطمئن نہ ہوں گے۔

اس تجویز کی تائید میں جناب احمد سعید صاحب نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم سے اگر کہا جائے کہ تمہیں دوسری سلطنتوں کے رہنے یا جانے کا کیا فائدہ یا غم۔ تو ہم کہیں گے کہ تمام دنیا کے مسلمان اسلامی اخوت کے رشتہ میں منسلک ہیں۔ وہ غیر نہیں ہیں۔ اور جس طرح اگر کسی غریب آدمی کا کوئی رشتہ دار امیر ہو تو گو وہ اس کی دولت میں حصہ دار نہیں ہوتا لیکن پھر بھی اسے ہمیشہ یہ خوشی اور حوصلہ ہوتا ہے کہ میرا ایک رشتہ دار امیر ہے اور یہی اس کی عزت کا باعث ہے۔ دوسرے لوگ بھی اس کو کچھ کہنے یا نقصان پہنچانے سے ڈرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ امیر رشتہ دار اس کی مدد کو آجائے۔ اسی طرح غلام مسلمان بھی ہمیشہ اس احساس سے سرشار رہتا ہے کہ میرے دوسرے بھائی برسرِ حکومت ہیں اور مجھے کسی دشمن سے گزند پہنچنے کا احتمال نہیں۔ اگر کوئی اس قسم کا ارادہ بھی کرے گا تو میرا آزاد مسلم

بھائی میری مدد کو آئے گا۔

اس تقریر کو سامنے رکھیے اور اس کے بعد جناب حسین احمد صاحب مدنی کے خطبۂ صدارت کے اس حصہ پر غور کیجیے جو پچھلے صفحات میں نقل کیا جا چکا ہے اور جس میں انھوں نے پاکستان کی اسکیم کے خلاف یہ اعتراض عائد فرمایا ہے کہ اس سے ہندو منطقوں میں مسلمان جن کی پوزیشن زیادہ سے زیادہ ۱۴ فیصدی اور اکثری طور پر سات یا پانچ فیصدی ہو گی۔ بالکل بے دست و پا اور زندہ درگور ہو جائیں گے۔"

ہم جناب مدنی سے دریافت کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ جب جناب احمد سعید صاحب کے خیال کے مطابق۔ پنجاب کے غلام مسلمان کے لئے یہ امر باعث ہزار اطمینان ہے کہ افغانستان میں اس کا بھائی خوش حال آزاد اور طاقتور ہے اور اس کی وجہ سے یہاں کا کوئی دشمن اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ تو کیا پنجاب کے آزاد اور طاقتور ہونے کی صورت میں۔ یو۔ پی کے مسلمان کو یہی اطمینان نصیب نہ ہو جائیگا کہ اس کا بھائی پنجاب میں طاقت اور حکومت کا مالک ہے۔ اس لئے اس کی طرف کوئی دشمن آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ مسلم اکثریت کے صوبوں کی کامل آزادی اور اپنی جداگانہ حکومت جس میں دفاع۔ امور خارجہ۔ مالیات وغیرہ کا نظم و نسق سب اپنے ہاتھ میں ہوگا۔ اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کے لئے ہزار تقویت کا باعث ہوگا۔ اگر مدراس کے مسلمان کے پاؤں میں کانٹا چبھیگا تو پنجاب کے مسلمان کی آنکھ میں نیند حرام ہو جائے گی۔ اور جب کسی دست دراز کو یہ معلوم ہو کر مظلوم بے کس و بے یار نہیں بلکہ اس کی تکلیف اس کے کروڑوں طاقتور اور آزاد بھائیوں کے لئے وجہ اضطراب ہو گی۔ تو وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے سے پیشتر سو مرتبہ سوچے گا۔

بہر حال جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا ہے یہ امر موجب اطمینان ہے کہ ہمارے ان غلطی خوردہ بھائیوں کا قدم اب صحیح راستہ کی طرف اٹھ رہا ہے۔ خدا کرے کہ اب ان میں یہ توفیق پیدا ہو جائے کہ کشادہ ظرفی سے اپنی غلطی کا کھلے بندوں اعتراف کر کے بچھڑی ہوئی ملت سے پھر آملیں اس میں یقیناً ملت اسلامیہ کی بھی بہبود ہے۔ لیکن ملت سے زیادہ خود ان حضرات کے وقار کا راز بھی اس میں مضمر ہے۔ اب وہ زمانہ گذر گیا کہ غیروں کو ان حضرات کی ضرورت تھی اب ہندو اور انگریز دونوں جانتے ہیں کہ ملت کا ساتھ چھوڑنے والوں کی مسلمانوں کی نگاہ میں کیا وقعت رہتی ہے۔ اس لئے نہ تو اس اعتبار سے ہی انھیں ان کی ضرورت ہے اور نہ ہی ان کی سیاسی بصیرت کی بنا پر جس کے افلاس کی مثال خود جناب مدنی کا خطبۂ صدارت ہے۔ خدا کرے کہ ان حضرات کی سمجھ میں یہ بات

۱۔ جمہوریت مغرب کے جمہوری نظام کے متعلق۔ مشرق کے دیدہ ور نے کہا تھا

گریز از طرزِ جمہوری۔ غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید

تو اس پر مغرب بھی ہنسا اور مغرب کی نقالی کرنے والے بھی۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک یہ نظام حکومت انسانی فکر کے ارتقار کا نقطۂ آخرین تھا اور اس سے بہتر نظام حیطۂ تصور میں بھی نہ آسکتا تھا۔ لیکن ابھی اس دعوے کو کچھ زیادہ عرصہ نہ گذرنے پایا تھا کہ خود اہل مغرب نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ مشرق کے دیدہ ور نے سچ کہا تھا۔ چنانچہ دارالعوام میں ایک بحث کے دوران میں "سر الفرڈ ناکس" نے کہا کہ

"جمہوریت اس کے سوا اور کیا ہے کہ سروں کو گن لیا جائے۔ بلا لحاظ اس امر کے کہ ان سروں کے اندر کیا ہے!" (ہندوستان ٹائمز 26 2/42)

دیکھئے۔ لفظ بلفظ ترجمہ ہے اس مصرعہ کا۔ "کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید"۔ ابھی آگے آگے دیکھئے کہ مغرب کو اپنے غیر فطری نظامِ زندگی کی کون کون سی کڑیوں کو لعنتی قرار دینا پڑتا ہے۔ ابھی تو اس نظام کے عواقب کی ابتدار ہے۔ لیکن مغرب سے کہیں بدتر حالت اس کے مشرقی نقالوں کی ہے۔ وہاں اس نظام کے متعلق یہ آوازیں بلند ہو رہی ہیں اور یہاں اسے ابھی تک نوعِ انسانی کی تمام مصائب و مشکلات کا مداوا قرار دیا جا رہا ہے۔ ہندو تو ایک خاص مقصد کے ماتحت اسے ابھارتا ہے۔ وہ اس جمہوری قبا کے پردہ میں اپنی اکثریت کی حکومت قائم کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ لیکن ذرا ان نیشنلسٹ مسلمانوں سے پوچھئے کہ یہ کس مقصد کے ماتحت اس کی حمایت کئے جا رہے ہیں؟ کیا محض اس لئے نہیں کہ ہندو ایسا کہلوانا چاہتے ہیں؟

۲۔ بڑے بوڑھوں کی غلطی

یوں تو بیکاری ہر جگہ لعنت ہوتی ہے لیکن جب کوئی عورت بیکار ہو جائے تو وہ ایک عجیب قسم کی مصیبت بن جاتی ہے اور ایسی بہکی بہکی باتیں کرنے لگتی ہے جس سے ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی۔ اس مرض کا شکار محترمہ بیگم شاہنواز صاحبہ ہیں، جنھیں بیکاری اور فارغ البالی کے ہاتھوں مجبوراً لیڈر بننا پڑا ہے۔ اور اب آئے دن ان کی طرف سے کوئی نہ کوئی ایسی بات کان میں پڑتی رہتی ہے جسے سن کر افسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں گورنمنٹ کالج کے جلسہ تقسیم انعامات کی صدارت کے موقع پر آپ نے فرمایا۔

"جتنا کوئی شخص فرقہ داری کے اس خار دار مسئلہ کا مطالعہ کرے گا اتنا ہی وہ اس امر کا احساس کرے گا کہ ملک کی موجودہ صورتِ حالات کے ذمہ دار ہمارے بڑے بوڑھے تھے انھوں نے ہر ایک جماعت کے کلچر (ثقافت) کو اس طرح دوسروں سے الگ تھلگ رکھا کہ ہر جماعت کا تشخص جداگانہ رہا اور اس طرح نہ تو ہندوستان میں ایک مشترکہ کلچر ہی تیار ہو سکا، اور نہ ہی ہندوستان کی متحدہ قومیت ہی بن سکی" (ہندوستان ٹائمز ۲۵ ۳/۴۳)

اپنے بڑے بوڑھوں کی جس غلط روش کا رونا جناب بیگم صاحبہ نے رویا ہے اس کا تو کچھ کچھ مطلب سمجھ میں آگیا لیکن انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ اگر بزرگوں نے اس باب میں کوتاہی کی تھی تو انھوں نے اس کی تلافی کس طرح سے کی اور وہ کون سا ایسا قدم اٹھایا جس سے ہندوستان میں ایک مشترکہ اور متحدہ قومیت کی بنیاد پڑ جائے!

کس قدر رنجدہ ہے اس حقیقت کا احساس کہ یہ خیالات سر شفیع مرحوم کی نورِ چشم کی طرف سے باہر آرہے ہیں اور وہ بھی اس وقت جب ہندوستان کی "متحدہ قومیت" کا تصور اپنوں بیگانوں سب کی نگاہ میں زعمِ باطل بن چکا ہے۔ اگر مقصود فقط شہرت اور ہر دلعزیزی ہی ہے تو اس کے لئے بھی اب کسی جدت کی ضرورت ہے۔ یہ پامال۔ فرسودہ اور پیش پا افتادہ مضمون تو اب کسی کے لئے بھی جاذبِ توجہ نہیں رہا۔

ہم حیران ہیں کہ جن بچوں کی تربیت ایسی ماں کی گود میں ہوئی ہو قوم ان سے کیا توقع رکھ سکتی ہے؟ مسلمان خاتون کے لئے تو ایک ہی طرزِ زندگی وجہ افتخار و سعادت تھا۔ یعنی

اتباعِ اُسوۂ حضرت سیدۃ النساء میں۔

آسیا گرداں و لب قرآں سرا

لیکن لیڈری میں یہ چیزیں کہاں !

۳۔ جشنِ میلاد | گزشتہ اشاعت میں ہم نے محکمۂ ریڈیو کے اربابِ بست و کشاد کی توجہ اس طرف منعطف کرائی تھی کہ وہ مسلمانوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے حضور تاجدارِ مدینہ سرورِ کائنات (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی تعریف و توصیف میں اس قسم کی نعتیں نشر کیا کریں جو اس ذاتِ عالی مرتبت (فداہ ابی و امی) کی شانِ گرامی کے منافی ہوں۔ اس اشاعت کے بعد یہ مہینہ ربیع الاول کا آیا جس کی بارھویں تاریخ وہ مقدس دن ہے جس کے احترام میں آسمان جھک کر زمین کو سلام کرتا ہے اور ہر اس مسلمان کے نزدیک جس کے دل میں ایمان کی کوئی رمق بھی موجود ہے دنیا کی ہر عزیز سے عزیز تر متاع سے گراں قدر ہے۔ اس تقریبِ سعید پر محکمۂ ریڈیو کی طرف سے خاص پروگرام نشر کیا گیا۔ لیکن وہ پروگرام کیا تھا! ملاحظہ فرمائیے۔

33477

جشنِ میلاد۔ (لاہور)

شمشاد بیگم اور امراؤ ضیاء بیگم	۔	سلام حفیظ جالندھری
فضل محمد اور سرفراز خاں	۔	نعت خوانی
طمنچہ جان	۔	نعتِ محسن
نسیم اختر	۔	نعتِ نصیر

لکھنؤ کے پروگرام میں "ہندوستانی میں بات چیت" اور درود و سلام کے بعد عرشی منیر، گوہر سلطانہ اور بے نظیر بائی کے نام نعت خوانی میں پیش کئے گئے۔

غور فرمایا آپ نے کہ اس جشنِ مقدس کو کس انداز سے منایا جا رہا ہے جس کی ایک ایک ساعت دنیا کے چالیس کروڑ فرزندانِ توحید کے لئے وجہِ صد ہزار سعادت ہے اور جس کی یاد میں اللہ اور اس کے

فرشتے درود و سلام بھیجتے ہیں۔ ہم محکمۂ ریڈیو سے کچھ نہیں کہنا چاہتے کہ انھیں کچھ کہنا بے سود ہے
لیکن ہزار تاسف ہے خود مسلمانوں کی بے حسی اور (معاف فرمائیے) بے حمیتی پر کہ وہ ان تمام چیزوں کو دیکھتے
اور سنتے ہیں اور نہایت خاموشی سے آگے گذر جاتے ہیں۔ گویا اُن سے ان باتوں کا کچھ واسطہ ہی نہیں۔ غیرت،
ایمان کی سب سے بڑی نشانی ہے بلکہ یوں کہئیے کہ ایمان ماپا ہی اسی مقیاس سے جاتا ہے۔ سو جس قوم پر اس درجہ
افسردگی اور بے حمیتی چھا جائے کہ وہ زندگی کے ایسے اہم معاملات سے یوں بے تعلق ہو جائے اس کی موت پر جس قدر
بھی ماتم کیا جائے۔ کم ہے۔ اور پھر طرفہ تماشا یہ کہ ان چیزوں کی اصلاح میں کسی ایثار اور قربانی کی بھی ضرورت نہیں۔
اس کے لئے نہ کسی ہنگامہ آرائی کی ضرورت ہے نہ غوغا آرائی کی۔ کرنا صرف اتنا ہوتا ہے کہ محکمۂ ریڈیو کو اطلاع دیدی جائے
کہ پروگرام میں فلاں فلاں شق ہمارے ذوق۔ عقیدہ اور احترام کے خلاف ہے۔ آئندہ اسے بدل کر یوں
کر دیا جائے۔ جب عوام کی طرف سے اس قسم کا مطالبہ ہو تو وہ ایسے مطالبہ کو کبھی رد کر ہی نہیں سکتے۔ لیکن
ہمیں مسلمانوں سے اُمید نہیں کہ وہ اتنا بھی کر سکیں گے۔ تو پھر گلہ کس پر!

۴۔ اُلٹا اثر | ناخدائے کشتی ملت۔ قائدِ اعظم مسٹر محمد علی جناح کی چندے کی اپیل ملک کے
چاروں گوشوں میں پھیل چکی ہے۔ اور اس وقت تک کی اطلاعات سے مترشح ہے کہ ملک کے اطراف و اکناف سے اس کا
استقبال انتہائی جوش و عقیدت سے ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جناب جناح اپنی بے لوث خدمات کی وجہ سے
ملتِ اسلامیہ کے قلوب کے نازک ترین گوشوں میں گھر کر چکے ہیں۔ اور ہر مسلمان بلا جبر و اکراہ انتہائی مسرت
و محبت سے اپنی عزیز ترین متاع۔ اپنے محبوب و محترم قائد کے قدموں میں نچھاور کرنے کے لئے تیار ہے۔ اور کیوں
نہ ہو! جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کے چند پیسوں سے یہ رہبر فرزانہ ملک و سلطنت خرید کر دے رہا ہے۔
چنانچہ ایک غریب آدمی نے (جس کا بیان اخبارات میں شائع ہوا ہے) کہا کہ مجھ پر اس اپیل کا ایسا اثر
ہوا کہ میرے پاس جو کچھ موجود تھا۔ سب جناب جناح کی خدمت میں بھیجدیا۔ فی الواقع یہ موقع اسی قسم کی درخشندہ
مثالیں قائم کرنے کا ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ مثال بھی ہمارے سامنے آئی کہ لاہور کے میاں امیر الدین صاحب
ایم۔ ایل۔ اے۔ فنانشل سکرٹری صوبہ مسلم لیگ نے قائد اعظم کی اپیل شائع کرتے وقت اخبار میں اپنے

عطیہ کا بھی اعلان فرمایا ہے۔ میاں امیرالدین صاحب کی پوزیشن کو سامنے رکھتے ہوئے یقیناً آپ متوقع ہوگئے کہ اُن کا عطیہ (جس کا اعلان بھی ضروری سمجھا گیا) یقیناً ایک گراں قدر رقم ہوگی۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ وہ رقم کتنی تھی! ایک سو روپیہ! اس میں شبہ نہیں کہ اس باب میں کسی پر کچھ جبر نہیں کیا جاسکتا۔ جو کچھ کسی کی طرف سے ملے بہرحال قوم کے لئے باعثِ شکریہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایسی رقم کے اعلان سے فائدہ کیا تھا؟ خیرات علانیہ بھی ہوتی ہے اور پوشیدہ بھی۔ علانیہ سے مقصد دوسروں کی ترغیب و تشویق ہوتی ہے۔ لیکن جس اعلان سے دوسروں پر اُلٹا اثر پڑے اُسے پوشیدہ ہی رکھا جائے تو بہتر ہے۔ اب ہر شخص کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جائے گا کہ جب اتنی بڑی پوزیشن کے آدمی نے سو روپیہ دیا ہے تو ہمارے دو روپے ہی کافی ہیں۔ اس کا مجموعی اثر جو کچھ ہوگا ظاہر ہے۔ لہٰذا دیگر حضرات اس امر کا خیال رکھیں کہ اعلان صرف اُن رقوم کا کیا جائے جو دوسروں کے لئے زیادہ سے زیادہ عطیہ کی ترغیب دلائیں۔ نہ اُن رقوم کا جو اُبھرے ہوئے دلوں کو بھی بٹھا دیں۔

۵۔ نیک مشورے کانگریس کے متشدد لیڈر سردار پٹیل نے پچھلے دنوں احمد آباد میں ایک تقریر کے دوران میں فرقہ وارانہ فساد کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ

> "جو لوگ ایک جداگانہ قومیت کے مدعی ہیں اُن میں سے نوے فی صدی وہ ہیں جو اس ملک کی مٹی کی پیداوار ہیں۔ اس لئے اگر یہ لوگ پھر اپنی اصل میں جذب نہیں کئے جاسکتے تو یہ ان لوگوں کا قصور ہے جن سے نکل کر یہ لوگ الگ ہوگئے تھے۔" (ہندوستان ٹائمز ۱۶ جون)

آپ نے غور فرمایا کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا یہ کیا حل تجویز کیا جارہا ہے اور یہ حل کسی مہاسبھائی کی طرف سے نہیں بلکہ ایک کانگریسی کی طرف سے ہے اور کانگریسی بھی کوئی غیر ذمہ دار نہیں بلکہ سردار پٹیل کی پوزیشن کا کانگریسی آگے چل کر تشدد اور عدمِ تشدد کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے سردار صاحب فرماتے ہیں:

> "لوگوں کو فرقہ وارانہ فساد کے موقع پر بھاگ نہیں اٹھنا چاہئے بلکہ ایسے فساد کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ اوّل تو عدمِ تشدد سے۔ لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو حفاظتِ خود اختیاری کی

قانونی اختیار کو استعمال میں لاکر ۔ عدم تشدد کو کسی صورت میں بھی بزدلی کی نقاب نہیں بنانا چاہیے۔"

یہ وہ حضرات ہیں جو "عدم تشدد" کو دھرم اور عقیدہ کی حیثیت سے پیش کیا کرتے ہیں !

الہ آباد

سنہ ۱۹۳۰ء ———— سنہ ۱۹۴۲ء

دنیا میں کوئی حرکت نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی جب تک سامنے کوئی واضح اور غیر مبہم نصب العین نہ ہو۔ جو شخص منزلِ مقصود کو متعین کئے بغیر گھر سے چل نکلتا ہے۔ ہر چند اس کے قدم اُٹھتے ہیں، لیکن وہ صبح سے شام تک چلتا رہے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔ بلکہ عرفِ عام میں اُس کی اِس حرکت کو "آوارگی" سے تعبیر کیا جائے گا۔ برعکس اِس کے اگر وہی قدم تعیینِ مقصد کے بعد اٹھیں تو ہر قدم کامیابی و کامرانی کو اپنی طرف کھینچ لائے گا اور یہ راہی زود یا بدیر منزلِ مقصود تک پہنچ کر رہے گا۔

ہندوستان میں موجودہ سیاسی تحریک کی ابتدا کچھ ایسی آندھی کی طرح ہوئی کہ اس میں ہندوؤں کے سامنے تو ایک متعین مقصد تھا لیکن مسلمان محض اپنے جوشِ ورقص میں بگولے کی طرح ساتھ ہو لیا۔ اور اس بات کے متعلق پوچھا تک بھی نہیں کہ بالآخر اس بادیہ پیمائی اور دشت نوردی سے مقصد کیا ہے! جب کسی قوم کی رگوں میں خون اور خون میں حرارت ہو تو بہت سے خود غرض انسان قوم کے اِس جوش اور ولولہ کو اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ ان کا فائدہ اسی میں ہوتا ہے کہ کوئی نہ کوئی ہنگامہ برپا رہے۔ طوفان اُٹھتا رہے کہ ان کے نزدیک

> اک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
> نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

ہندوستان کی سیاسی فضا میں اِس قسم کی ہنگامہ خیزی ہو رہی تھی۔ شور و شغب سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ "انقلاب زندہ باد" کے فلک بوس نعرے ایشر کی موجوں میں طغیانی پیدا کر رہے تھے لیکن دیکھنے والی آنکھ دیکھتی تھی کہ ایک خاموش انسان۔ لاہور کے ایک خستہ اور بوسیدہ مکان کے ایک گوشہ میں

کمبل اوڑھے۔ چارپائی پر لیٹے حُقّے کے کش لگاتا رہتا۔ باہر کی دُنیا کے طوفان سے بظاہر ایسا غیر متاثر گویا اُن سے کچھ واسطہ ہی نہیں۔ لیکن درحقیقت قوم کی آوارگی سے اس قدر دل گرفتہ کہ کوئی وقت ایسا نہیں کہ اس کی بصیرت نواز آنکھوں میں آنسو نہ ڈبڈبا رہے ہوں۔ وہ لوگ جن کے حصولِ مقاصد کا راز ہی "جھکڑ اور آندھی" میں تھا۔ اس مردِ خاموش کو "بے عمل" کہتے۔ وہ سنتا اور مُسکرا دیتا۔ کہ اس کی نگہِ دور رس "عمل" کے ان دعویداروں کے بے نتیجہ اعمال کا انجام دیکھ رہی تھی۔ ذہنی نقش کے دلدادہ اسے شاعر کہتے تو وہ ہنس دیتا کہ شاعروں کی بے مقصد صحرانوردیاں اس سے پوشیدہ نہ تھیں۔ منطقی گورکھ دھندوں کے شیدائی اسے فلاسفر کہتے تو اس کی آنکھوں کا ہلکا سا تبسم کہہ دیتا کہ یہ دل کی دنیا کو کیا جانیں!

یہ مردِ حق آگاہ اسی طرح خاموش رہا۔ خاموش۔ اور ایک گہری سوچ میں ڈوبا ہوا خاموش۔ وہ خاموش تھا اور باہر کی دنیا سے بظاہر غیر متعلق لیکن بڑے سے بڑے اربابِ حکمت و تدبر کی یہ حالت تھی کہ وہ چپکے چپکے اس کے پاس جاتے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ کچھ لے آتے کہ قوم پھر ان کو سر آنکھوں پر بٹھا لیتی۔ لیکن وہ خود خاموش تھا۔ بالکل خاموش۔ کبھی کبھی اس کی آہِ سحرگاہ ایک مُغنّیِ آتش نفس کے نغمۂ لاہوتی کی طرح خاموش فضا میں تحرک پیدا کرتی اور سمجھنے والوں کے رگ و پے میں دیپک کے سروں کی طرح شعلہ بار ہو جاتی۔ لیکن اس کے بعد وہ پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتا اور فضا پر پھر وہی خاموشی چھا جاتی۔

افکار و اعمال کی پریشانی سے قوم کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی تو بالآخر یہ مردِ خاموش اللہ کا نام لے کر اُٹھا اور ۱۹۳۰ء میں الہ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے خطبۂ صدارت میں مسلمانوں کو بتا دیا کہ ہندوستان میں اُن کی سیاسی جدوجہد کا نصب العین کیا ہے؟ اس مردِ خود شناس نے سب سے پہلے تعارف کے طور پر کہا:

"آپ حضرات نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لئے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہے اور اپنے اس عقیدہ میں مایوسی کا کوئی شائبہ نہیں پاتا کہ اسلام ایک زندہ اور پائندہ قوت ہے جو نگہِ انسانی کو جغرافیائی حدود و قیود کے قفس سے آزاد کر کے اسے اس کی فطری وسعتوں میں اِذنِ بال کشائی دیگا۔ جس کا عقیدہ ہے کہ مذہب، انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک اہم ترین طاقت کا حامل ہے

اور جس کا محکم یقین ہے کہ اسلام خود تقدیر الٰہی ہے۔ زمانہ کی تقدیریں اس کے ہاتھ میں رہیں گی اور اس کی تقدیر کسی کے ہاتھ میں نہ ہوگی۔ ایسا شخص مجبور ہے کہ تمام مسائل کو اپنے خاص زاویہ نگاہ سے دیکھے۔ یہ ہرگز خیال نہ فرمایئے کہ جس مسئلہ کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ خالص نظری مسئلہ ہے۔ نہیں، یہ تو ایک زندہ اور عملی مسئلہ ہے۔ جو خود نفسِ اسلام پر بحیثیت ایک نظام حیات و عمل کے اثر انداز ہوگا۔ اس مسئلہ کے صحیح اور مناسب حل پر ہی اس امر کا انحصار ہے کہ آپ حضرات ہندوستان میں ایک ممتاز تہذیب کے علمبرداروں کی حیثیت سے زندہ رہ سکیں گے"

اس کے بعد ہندوستان کی مختلف قوموں (ہندو اور مسلمانوں) میں باہمی اتحاد و اتفاق کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن اس تلخ حقیقت کے بیان کرنے سے صدمہ ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے ملک کی اندرونی یکجہتی کے لئے اس قسم کے اصول دریافت کرنے میں جتنی کوششیں کیں وہ ابتک بالکل ناکام رہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ کوششیں کیوں ناکام رہی ہیں؟ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ایک دوسرے کی نیتوں کو شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور دل میں یہ آرزوئیں چھپی ہوتی ہیں کہ کسی نہ کسی طرح فریقِ مقابل پر تغلب و تسلط حاصل کر لیا جائے یا اس کی یہ وجہ ہے کہ باہمی اشتراکِ عمل کے بلند مقاصد تباہ ہوتے ہوں تو ہوں لیکن وہ استمراری اجارہ داری ہاتھ سے نہ جانے پائے جو اتفاقات زمانہ سے ایک فریق کے قبضہ میں آچکی ہے۔ حالت یہ ہے کہ دماغ میں اَنَا الْمَوجُودُ لَا غَیرِی کا سودا سما رہا ہے۔ لیکن ان جذبات کو قومیت یکجہتی کے مقدس چولے میں چھپایا جاتا ہے۔ بلند آہنگ دعاوی کو دیکھو تو حبّ الوطنی کی وسعتِ قلبی کے مظاہرے ہو رہے ہیں لیکن دل کی گہرائیوں میں اتر کر جائزہ لو تو وہاں "ذات اور قبیلہ" کی وہی پرانی تنگ نظری جلوہ فرما ہے۔ ہاں! اور اس کا یہ بھی باعث ہو سکتا ہے کہ اس حقیقت کے تسلیم کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ اس ملک میں ہر ایک جماعت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ

اپنی تمدنی روایات کے مطابق آزادانہ طور پر اپنی اجتماعی نشوونما کر سکے۔

اس کے بعد فرمایا:۔

"جو قوم دوسری قوموں کے متعلق اپنے دل میں بدخواہی کے جذبات کی پرورش کرتی ہے وہ نہایت پست نظرت اور رذیل قوم ہے۔ میرے دل میں دوسری قوموں کے رسوم و شعائر۔ قوانین و ضوابط مذہبی و معاشرتی ادارات کا بے حد احترام ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو میں دوسری قوموں کے معابد کی حفاظت بھی کروں۔ بایں ہمہ مجھ اس ملت سے عشق ہے جو میری زندگی کی طبعی اعتماد کا سرچشمہ ہے اور جس نے اپنے مذہب، اپنے لٹریچر، اپنی حکمت اور اپنے کلچر کی تجلیات سے اقبال کو اقبال بنا دیا ہے اور یوں اپنے درخشندہ ماضی کو ایک جیتے جاگتے زندگی بخش عنصر کی صورت میں میرے حال میں سمو دیا ہے۔"

پھر اپنے اصل موضوع کی طرف آ کر بتایا کہ ہندوستان میں ملتِ اسلامیہ کا سب سے پہلا نصب العین حیات کیا ہونا چاہیے۔ فرمایا:۔

"میری آرزو ہے کہ پنجاب۔ صوبہ سرحد۔ سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے۔ (ہندوستان کو) حکومت خود اختیاری زیر سایۂ برطانیہ ملے۔ یا اس سے باہر۔ کچھ بھی ہو مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔

اس مقصد کی صداقت اور اس نصب العین کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا:۔

"ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بہ حیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ مسلمانانِ ہند کے اس زندہ اور جاندار

طبقہ میں کہ جس کے بل بوتے پر یہاں برطانوی راج قائم ہے (باوجودیکہ برطانیہ نے ان سے کبھی منصفانہ برتاؤ نہیں کیا) اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو یہ آخرالذکر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھا دے گا۔"

آگے چل کر فرمایا:-

"یہ مطالبہ مسلمانوں کی اس دلی خواہش پر مبنی ہے کہ انھیں بھی کہیں اپنی نشو و ارتقا کا موقع ملے۔ اس لئے کہ اس قسم کے مواقع کا حاصل ہونا اس وحدتِ قومی کے نظامِ حکومت میں قریب قریب ناممکن ہے جس کا نقشہ ہندو اربابِ سیاست اپنے ذہن میں لئے بیٹھے ہیں اور جس سے مقصدِ وحید یہ ہے کہ تمام ملک میں مستقل طور پر انھیں کا غلبہ اور تسلط ہو۔"

اس کے بعد اس حقیقت کو واضح فرمایا کہ یہ مطالبہ کسی جذبۂ تغلب و استیلاء پر مبنی نہیں بلکہ دنیا میں حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی آرزو پر مبنی ہے جو مسلمان کیلئے ایمان کی حیثیت لئے ہوئے ہوتا ہے۔ اس لئے کہ

"حقیقت یہ ہے کہ اسلام خدا اور بندے کے درمیان ایک "روحانی واسطہ" کا ہی نام نہیں ہے۔ یہ ایک نظامِ حکومت ہے جس کی ہیئتِ ترکیبی میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ وہ ہر عملِ خیر کو اپنے اندر جذب کر لے۔ اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جبکہ دنیا میں کسی روسو کے دماغ میں ایسے نظام کا خیال تک بھی نہ آیا تھا۔ اس نظام کی بنیاد ایک ایسے اخلاقی نصب العین پر رکھی گئی ہے جس کی رو سے انسان جمادات اور نباتات کی طرح بالکل مخلوق نہیں سمجھا جاتا کہ اس کو کبھی اس خطۂ زمین سے منسوب کر دیا اور کبھی اس سے۔ بلکہ وہ ایک ایسی روحانی ہستی سمجھا جاتا ہے جس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک خاص معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ پر فٹ ہو۔ وہ اس مشینری کا ایک فعال پرزہ ہوتا ہے اور اسے ٹھیک انداز میں چلانے کیلئے اس پر حقوق و فرائض کی

ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں "

اس نصب العین کو ایسے واضح اور درخشندہ الفاظ میں سامنے لانے کے بعد راستہ کے خطرناک مراحل کی طرف بھی اشارہ کر دیا تاکہ یہ کاروانِ شوق رو بہ منزل ہو تو زادِ سفر اور سامانِ حفاظت کو بھی ساتھ رکھے۔ فرمایا:۔

"ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں پر جو نازک وقت آج آچکا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے اندر وحدتِ افکار و عمل پیدا کر کے مکمل طور پر منظم ہو جائیں۔ ان کی تنظیم، ملّتِ اسلامیہ اور ہندوستان دونوں کے حق میں مفید ہوگی۔ ہندوستان کی سیاسی غلامی ایشیا بھر کے لئے لامتناہی مصائب کا سرچشمہ بنی رہی ہے اور اس وقت بھی وہی کیفیت ہے۔ اس غلامی نے مشرق کی روح کو کچل ڈالا ہے اور اس سرزمین کو اظہارِ خودی کی اس مسرت سے یکسر محروم کر دیا ہے جس کی برکت سے یہ کبھی ایک عظیم الشان اور درخشندہ کلچر کی تخلیق کا موجب بنی تھی۔ جس سرزمین (یعنی ہندوستان) کے ساتھ ہمارا جینا اور مرنا وابستہ ہو چکا ہے۔ اس کی طرف سے ہم پر ایک اہم فریضہ عائد ہوتا ہے۔ علاوہ بریں ہم پر ایشیاء کی طرف سے اور علی الخصوص مسلم ایشیاء کی طرف سے بھی کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ تنہا ایک ملک میں سات کروڑ فرزندانِ توحید کی جماعت کوئی معمولی چیز نہیں۔ تمام مسلم ایشیاء کے ممالک مجموعی طور پر بھی اسلام کے لئے اتنی گراں بہا متاع نہیں جتنی اکیلے ہندوستان کی ملّتِ اسلامیہ۔ اس لئے ہمیں ہندوستان کے مسئلہ کو صرف اس زاویۂ نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہئے کہ ہندوستان میں اسلام کا کیا حشر ہوگا بلکہ اپنی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس نقطۂ خیال سے بھی کہ ہماری موت و حیات کا عالمِ اسلامی پر کیا اثر ہوگا۔ ہندوستان اور ایشیاء کی طرف سے جو فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں ان سے ہم کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ جب تک ہمارا نصب العین متعین نہ ہو اور اس کے حصول کے لئے ہم سب منظم طور پر عزم نہ کر لیں۔ ہندوستان کے دیگر

سیاسی گروہوں میں ہماری مستقل ملی ہستی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم منظم ہوں، متحد ہوں،
ہم آہنگ ہوں۔ ہمارا بکھرا ہوا شیرازہ ان تمام سیاسی مسائل پر جن کے ساتھ ہماری ملت
کی موت اور زندگی وابستہ ہے بہت بُری طرح اثر انداز ہو چکا ہے۔ میں فرقہ وارمسائل
میں سمجھوتہ کی طرف سے نا امید نہیں ہوں، لیکن مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ مستقبل قریب
میں ہندوستان میں شاید ایسے خطرناک حالات پیدا ہو جائیں کہ مسلمان کو اپنا جداگانہ
محاذ قائم کر کے اُن کا مقابلہ کرنا پڑے۔ اور ایسے خطرناک حالات میں آزاد راہِ عمل
وہی قومیں اختیار کر سکتی ہیں جو حصولِ مقاصد کے لئے تُلی بیٹھی ہوں اور اپنے تمام عزائم
کو ایک متحدہ نصب العین پر مرکوز کئے ہوئے ہوں۔"

حضرت اتنا ہی نہیں کہا کہ راستہ کی مشکلات کی طرف ہی اشارہ کر دیا ہو بلکہ اس نبض شناس نے یہ
بھی بتا دیا کہ قوم میں کس کس چیز کی کمی ہے۔ فرمایا :-

"میں صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ دورِ حاضرہ میں مسلمان دو مصیبتوں میں مبتلا ہیں
پہلی مصیبت قحط الرجال کی ہے۔ سر میلکم ہیلی اور لارڈ ارون کی یہ تشخیص بالکل صحیح تھی کہ
مسلم قوم میں رہناؤں کا فقدان ہے جیسا کہ انھوں نے علیگڑھ یونیورسٹی کے طالب علموں
کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔ لیڈروں سے میری مراد ایسے حضرات ہیں جنھیں مبدأ فیض کی
کرم گستری یا مشاہدات و تجربات کی بنا پر ایک طرف اسلام کی روح اور اس کے
منتہائے نگاہ کے متعلق بصیرتِ تامہ حاصل ہو اور دوسری طرف عصرِ حاضرہ کے تاریخی شواہد
بھی ان کی نگاہوں کے سامنے بے نقاب ہوں۔ ایسے لوگ درحقیقت وہ زندہ قوتیں
ہوتے ہیں جو قوم کے عروقِ مُردہ میں خونِ زندگی پیدا کر دیتے ہیں لیکن اس کا کیا علاج
کہ وہ اللہ کی دین ہوتے ہیں۔ جسے چاہے دے۔ حسب فرمائش بنوائے نہیں جا سکتے۔
دوسری مصیبت جو مسلمانوں کو تباہ کر رہی ہے یہ ہے کہ ان کے دل سے احساسِ اجتماعیت
فنا ہو رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ افراد اور چھوٹے چھوٹے فرقے الگ الگ راستوں پر

گامزن ہو رہے ہیں اور اُن کا کوئی کام ملّت کے اجتماعی افکار و اعمال کو کچھ فائدہ نہیں پہنچاتا۔ ہم آج میدانِ سیاست میں وہی کچھ کر رہے ہیں جو صدیوں تک مذہب کے دائرے میں کرتے رہے ہیں۔ لیکن فرقہ بندی کے فروعی جھگڑے ہماری اجتماعیت کو اتنا نقصان نہیں پہنچاتے۔ ان جھگڑوں سے کم از کم یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اصلِ اصول (مذہب) جو ہماری اجتماعیت کا نقطۂ ماسکہ ہے اس سے ہمیں گہری دلچسپی ہے۔ پھر یہ اصول اپنے اندر اتنی وسعت رکھتا ہے کہ کوئی گروہ یا فرقہ اس حد تک سرکش نہیں ہو سکتا کہ وہ مسلمانوں کی جماعت سے کٹ جائے لیکن سیاسیات کے دائرے میں انتشار اور بالخصوص ایسے مواقع پر انتشار جب کہ قوم کی زندگی کا انحصار ہی اتحادِ عمل پر ہو قوم کو فنا کر کے رکھ دیتا ہے۔

یہ تھا وہ نصب العین جو اس حکیم الامّت علیہ الرحمت نے ۱۹۳۰ء میں قوم کے سامنے رکھا۔ کہنے والے کا کام کہہ دینا تھا۔ بتا دینا تھا۔ لیکن اس ہنگامہ آرائی کے دور میں اس پہ کون کان دھرتا۔ کسی نے اسے شاعر کا تخیل کہا۔ کسی نے فلاسفر کا ناممکن العمل نظریہ بتایا۔ اور یوں صدائے جرسِ کارواں، خود کارواں کے شور و غوغا میں گُم ہو کر رہ گئی۔

وقت گذرتا گیا۔ حالات بدلتے گئے۔ موسم میں تبدیلیاں آئیں۔ آندھیاں رکیں۔ بگولے تھمے۔ بادل چھٹے۔ فضا میں قدرے سکون پیدا ہوا۔ لیکن یہ مردِ دانا اسی طرح خاموش، اپنے کمرے کے ایک گوشہ میں چارپائی پر لیٹے گہری سوچ میں ڈوبا رہتا۔ آنے جانے والے اتنا محسوس کرتے کہ اُسے کسی چیز کی تلاش ہے۔ اس کی متجسس نگاہیں ہر آنے والے کے چہرے کی طرف للچا کر اٹھتیں لیکن حسرت بن کر لوٹ جاتیں۔ یوں ہی دن گذرتے گئے۔ کہ ایک دن دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس دیدہ ور کی نگاہوں میں چمک سی پیدا ہوئی ہے۔ اس کی پیشانی پر اطمینان کے آثار ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسے جس کی تلاش تھی وہ مل گیا۔

جو ڈھونڈھتا تھا وہ پالیا! یہ کون تھا؟ ایک نحیف ونزار مشتِ استخواں۔ بظاہر مغربی سانچوں میں ڈھلا ہوا پیکر۔ لوگوں میں ایک قانون داں کی حیثیت سے مشہور۔ اس مردِ خاموش نے اسے پاس بلایا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہا اور پھر کامل سکون واطمینان سے مسکراتے ہوئے یہاں سے چل دیا۔

اب یہ شمع کاروانِ ملّت ایک مفکر سے ایک مدبّر کے ہاتھوں میں آچکی تھی۔ مفکر کا کام سفر کی آخری حد یعنی منزل کا تعین تھا۔ مدبّر کا کام راستہ کی عملی مشکلات کا جائزہ لے کر قدم بقدم منزل کی طرف جادہ پیما ہونا تھا۔

دنیا اس مدبّر سے کافی عرصہ سے واقف تھی۔ لیکن انھوں نے دیکھا کہ اب اس میں غیر محسوس طور پر کچھ تبدیلی پیدا ہو رہی ہے اس نے سب سے پہلا نشانِ راہ یہ کہکر متعین کیا کہ مسلمانوں کی نمایندگی کا حق صرف اسلامی جماعت کو ہو سکتا ہے۔ مخلوط جماعت کو نہیں ہو سکتا۔ اس آواز پر اِدھر اُدھر سے چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ غیر تو غیر، خود اپنوں کی سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا کہ یہ کیا کہتا ہے۔ جب فضا میں ذرا سکون ہوا تو اس نے یہ کہکر اگلا نشان قائم کر دیا کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں۔ ہندو اور مسلمان مل کر ایک قوم نہیں بن سکتے۔ اس پر ان چہ میگوئیوں نے ہنگامہ کی سی صورت اختیار کرلی۔ لیکن یہ صاحب تدبّر وفراست بھی عجیب تھا کہ کسی کی چہ میگوئیاں اس پر اثر کر سکتی تھیں نہ اب یہ غوغا آرائیاں۔ جوں جوں غیروں کی طرف سے شورش برپا ہوتی تھی۔ اپنے خود بخود سمٹ کر اس کے گرد ونواح جمع ہوتے جاتے تھے۔ ہنگامہ ذرا فرو ہوا تو اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور اعلان کر دیا کہ مغربی انداز کا نظامِ جمہوریت مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول نہیں۔ اس پر تو بہت سوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس ہنگامے میں اور تیزی پیدا ہو گئی۔ اب کچھ کچھ اپنوں نے بھی سمجھا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے اور کیوں کہہ رہا ہے۔

وہ مسلسل دو برس تک اس طرح غیر محسوس طور پر قدم بقدم آگے بڑھتا گیا۔ تاآنکہ ۱۹۴۰ء میں اس نے اُس مردِ خاموش کی قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر ایک لاکھ کے مجمع میں اسی نصب العین کو دہرایا جس کا اعلان ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں ہوا تھا!

اعلان کیا گیا۔ گویا بھِڑوں کے چھتّہ میں ڈھیلہ دے مارا۔ چاروں طرف سے وہ شور وغوغا ہوا کہ

کر تو بھلی! لیکن سب سے بڑی حیرت یہ کہ اس طوفانِ مخالفت میں وہ بھی شریک جو اپنے آپ کو بڑے فخر و ناز سے "مسلمان" کہلاتیں۔ مسلمان! اور مسلمانوں کی خوشحالی کی تجویز سے نالاں!! اسلام کے نام لیوا اور اسلام کی سرفرازی کے دشمن!! خدا کے بندے اور خدا کی حکومت کے قیام کے مخالف!! بہرحال یہ مردِ ہوشمند۔ اپنی دھن کا پکا۔ نصب العین کی صداقت پر یقین۔ خدا پر بھروسہ۔ اپنوں اور بیگانوں کی مخالفت کی کچھ پرواہ نہ کرتے ہوئے آگے بڑھتا چلا گیا۔ مخالفوں کے اعتراض کا جواب دیتا۔ اپنوں کا اطمینان کراتا۔ مستانہ وار آگے بڑھتا گیا۔ دو برس اسی تگ و دو میں گذر گئے۔ بظاہر ایسا نظر آتا تھا کہ مسلمانوں کے اس نصب العین کی کہیں سے بھی تائید نہیں ہو رہی اور شاید سیاسی حلقوں میں اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا رہا۔ تا آنکہ مارچ ۱۹۴۲ء کے آخری ہفتہ میں حکومت برطانیہ کے نمائندۂ خصوصی کی طرف سے اس دستورِ اساسی کے بنیادی خطوط کا اعلان ہوا۔ جس کی رو سے جنگ کے بعد ہندوستان کے نظامِ حکومت کی تشکیل کی امید کی جاتی ہے۔ اعلان ہوا اور لوگوں نے حیرت کی نگاہ سے دیکھا کہ اس میں اس اصول کو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ جو علاقہ چاہے اپنا مرکز الگ قائم کر کے اپنی جداگانہ حکومت متشکل کرے۔

دستورِ اساسی کی ان تجاویز کو لے کر یہ سالارِ کاروانِ ملتِ اسلامیہ۔ رواں دواں۔ الہ آباد کی طرف روانہ ہوا اور بارہ برس پہلے جس سرزمین سے اُس مفکرِ اسلام۔ حکیم الامت نے مسلمانوں کے اس نصب العین کا اعلان کیا تھا اسی خطۂ زمین میں بیٹھ کر اس نصب العین کے اصول کی فروعات پر غور و فکر کیا۔ حکومت کی یہ تجاویز مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول ہوں یا کسی تصریح۔ ترمیم و اضافہ کی محتاج۔ بہرحال یہ حقیقت دنیا کے سامنے آ گئی کہ وہ نصب العین جسے آج سے بارہ برس پیشتر محض ایک شاعر کی دنیائے تصورات اور ایک فلاسفر کا جہانِ تخیلات قرار دیا جاتا تھا اُسے ایک قابلِ عمل سیاسی اصول کی حیثیت سے تسلیم کئے بغیر چارہ نہ ہوا۔

حالی مرحوم نے ملتِ اسلامیہ کے مرثیہ میں اس حقیقت کی طرف باچشمِ نم اشارہ کیا تھا کہ دینِ حجازی کا وہ

بے باک بیڑہ جو نیل و قلزم سے باصد شان و شوکت صحیح و سلامت گذر گیا

وہ ڈوبا دہانے میں گنگا کے آکر

لیکن قدرت کا کرشمہ ہے کہ گنگا اور جمنا کے جس سنگم میں وہ بیڑا ڈوبا تھا۔ اس کے دوبارہ اُبھرنے کی امید بھی

ہی سنگم میں پیدا ہوئی ۔ حالیؒ نے وہ کہا تھا اور حکیم الامتؒ نے یہ کہ

سفینۂ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ طوفاں سے پار ہو گا

وہ بھی ٹھیک تھا۔ اسے بھی اللہ تعالیٰ اپنی رحمتوں کے صدقے سچ کر دکھائے گا۔

سوداگر کی نگہِ دوررس

هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝

کیا تمھیں ایک ایسی تجارت کا نشان راہ بتاؤں جو تمھیں (غلامی کے) دردناک عذاب سے نجات دِلا دے! (۶۱/۱۰)

مسلم لیگ کے اجلاس (الٰہ آباد) میں ایک رضا کار نے اپنی تلوار قائدِ اعظم کی خدمت میں پیش کی۔ ملت کے امین نے یہ تلوار قوم کے مال خانہ میں داخل کردی۔ وہاں سے اسے اربابِ نظر کی بیتابیِ شوق کی وجہ سے بازارِ بیع و شریٰ میں لایا گیا۔ صلائے عام میں پانچ ہزار۔ دس ہزار۔ پندرہ ہزار۔ بیس ہزار۔ اکیس ہزار تک بولی بڑھی اور ٹھہر گئی۔ لیکن ایک گوشے میں ایک بہت بڑا سوداگر بیٹھا تھا۔ اس کی دوررس نگاہ نے بھانپ لیا کہ یہ متاعِ گراں بہا کتنی سستی جارہی ہے۔ وہ اٹھا اور اس نے دس ہزار بڑھا کر اکتیس[۳۱] ہزار میں تلوار خریدلی۔

حاجی سیٹھ سر عبداللہ ہارون نے اپنی زندگی میں ہزاروں سودے کئے ہونگے لیکن یہ سودا ایسا ہے جس پر ہم اُن کی خدمت میں دلی ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔

جمادے چند دادی۔ جاں خریدی! تعالی اللہ عجب ارزاں خریدی!!

قرآن پہلے سے موجود ہے۔ تلوار اب ہاتھ میں آگئی۔ اب اور کیا چاہیئے۔

این دو قوت حافظِ یک دیگر اند
کائناتِ زندگی را محور اند

طلوعِ اسلام کا لٹریچر

(بحوالۂ " لمعات ")

حسبِ ذیل پمفلٹ دفتر میں موجود ہیں۔ ان کی اشاعت سے ہمارا بلند مقصد بھی عام ہوگا اور موجودہ نامساعد حالات میں ادارہ سے تعاون کی شکل بھی پیدا ہو جائے گی۔

اسلامی معاشرت ۔ مسلمان کی زندگی ۔ سوراجی اسلام ۔ راشٹرپتی ابوالکلام آزاد
شخصیت پرستی ۴ر ۔ علم حدیث ۲ر ۔ جہانِ نو یعنی پاکستانی اسکیم ۲ر قرآن کریم کی روشنی میں
اسلام اور مذہبی رواداری ۲ر ۔ واردھا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان ۴ر ۔ زبان کا مسئلہ ۲ر
متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد ۲ر ۔ خدا کی بادشاہت ۲ر
شاہ ولی اللہ اور قرآن و حدیث ۲ر

محصول ڈاک علاوہ (پورے سٹ پر محصول ڈاک ار بصیغۂ رجسٹری ۹ر لگتا ہے)

طلوعِ اسلام مئی ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت سے آج تک کے تمام پرچے باستثنائے ذیل موجود ہیں۔ فی پرچہ چار آنہ۔ محصول ار کے حساب سے منگائیے۔

جون، جولائی، اگست — سنہ ۳۸ء
جنوری — سنہ ۳۹ء
مارچ — سنہ ۴۰ء

ناظم
ادارہ طلوعِ اسلام دہلی

اسلامی معاشرت

نقشِ ثانی

ازجناب پرویز صاحب

دیکھنے کو تو یہ ایک چھوٹا سا پمفلٹ ہے لیکن افادی حیثیت سے بڑی بڑی تصانیف پر بھاری ہے مسلمانوں کی روز مرہ کی زندگی کس قسم کی ہونی چاہیے۔ اس کا ماحول کیسا ہونا چاہیے اس کی عادات و اخلاق کا خاکہ اس کے رہنے سہنے کا ڈھنگ اس کے تمدن و معاشرت کے خط و خال اس کی تعلیم و تہذیب اس کے دنیاوی معاملات اپنوں اور بیگانوں سے اس کے تعلقات غرض کہ اسکی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر انداز و اسلوب قرآنی آئینہ میں کیسا ہونا چاہیے۔ اس چھوٹے سے پمفلٹ میں یہ سب کچھ آگیا ہے اور اس قدر سادہ اور دلنشین پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ ہر بات سیدھی دل میں اتر جاتی ہے اور لطف یہ کہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا گیا۔ بلکہ ہر چیز قرآن کریم کی چھوٹی چھوٹی آیات میں بیان کی گئی ہے بچوں کے لئے یہ پمفلٹ بہت ہی مفید ہے۔ اسلامی مدارس میں بطور نصاب کے داخل کر لیا جائے تو طلباء کے قلب و دماغ کی تعمیر صحیح اسلامی بنیادوں پر ہو جائے۔

قیمت ۴ر محصول ۱ر

ادارۂ طلوعِ اسلام دہلی

لمعات

اشاعتِ حاضرہ سے طلوعِ اسلام کی زندگی کے چار سال پورے ہو جاتے ہیں یوں تو قوموں کی زندگی میں چار سال کا عرصہ آنکھ جھپکنے سے زیادہ نہیں ہوتا لیکن جس برق رفتاری سے آجکل دنیا میں انقلابات رونما ہو رہے ہیں۔ اور جن تبدیلیوں کی آماجگاہ خود ہمارا ملک بن رہا ہے۔ ان کے پیش نظر چار سال کا قلیل سا عرصہ بھی ناقابلِ اعتنا نہیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں مسلمانانِ ہند کی نشاۃِ ثانیہ کی ابتدا ہوئی یہی وہ عرصہ ہے جس میں ہندؤں اور مسلمانوں کے نظریاتِ زندگی کا بنیادی اور اصولی فرق نمایاں طور پر دنیا کے سامنے آیا۔ اسی دور میں مسلمانانِ ہند کی جدوجہد کا درخشندہ نصب العین عزم کیسا متعین کیا گیا پھر اسی زمانہ میں موجودہ عالمگیر جنگ کی ابتدا ہوئی جس میں چشمِ فلک نے بڑی بڑی سلطنتوں کو مٹتے اور حکومتوں کو اجڑتے دیکھا۔ بہت سے تاجدار خانماں خراب ہو گئے۔ بڑی بڑی عظیم الشان بستیاں ویرانوں میں تبدیل ہو گئیں رفیع المنزلت عمارتیں کھنڈرات ہو گئیں سینکڑوں میدان انسانوں کے خون سے لالہ زار بن گئے امیدوں کی ہزاروں کھیتوں کو آگ کی شعلہ باریوں نے راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ تباہی۔ بربادی۔ بھوک۔ موت کے خوفناک عفریت۔ انسانیت کا گلا گھونٹنے کے لئے چاروں طرف سے آگ اور خون کی ہولی کھیلتے لپک پڑے غرضیکہ اس مختصر سے عرصہ میں دنیا جن انقلابات کی اسٹیج بنی۔ شاید گذشتہ ہزار برس میں بھی ایسے انقلابات سطحِ ارض پر نمودار نہ ہوئے ہوں۔ یہ تھا وہ چہار سالہ دور جس سے گذر کر طلوعِ اسلام آج اپنی چوتھی منزل تک پہنچا ہے۔

طلوعِ اسلام (دورِ جدید) کا پہلا پرچہ حکیم الامت حضرت علامہ اقبال (علیہ الرحمتہ) کی مقدس آرزوں کی روشنی میں ۸ اپریل ۱۹۳۸ء کو شائع ہوا۔ اور فطرت کی ستم ظریفی کہ اس کے گیارہ روز بعد حضرت علامہ عالمِ جاودانی کی طرف تشریف لے گئے اور اس طرح طلوعِ اسلام ان کی "سرپرستی" کے بجائے ان کی "یادگار" میں تبدیل ہو گیا۔ ان کا سایہ ہمارے سر سے اٹھ گیا لیکن ان کا پیغام اسی آب و تاب کے ساتھ ہماری

راہ نمائی [illegible] موجود تھا۔ یہ پیغام کچھ اپنی جداگانہ حیثیت نہیں رکھتا۔ بلکہ درحقیقت خدائے لم یزل کے آخری پیغام ہی کی تفسیر ہے۔ اس لئے ہماری راہ نمائی کے لئے اللہ کی اس کتاب زندہ کی روشنی موجود تھی اور یہ وہ روشنی ہے جو اپنی موجودگی میں کسی انسان کی عدم موجودگی کا زیاں محسوس نہیں ہونے دیتی۔

طلوع اسلام کے سامنے مقصد کیا تھا! اس کی تصریح کے لئے طلوع اسلام کا سب سے پہلا پرچہ سامنے لائیے۔ مقصد واضح ہو جائے گا! اس مقصد کے سمجھنے کے لئے ذرا آج سے چار سال پیشتر کے حالات پر پچھلی سی نگاہ ڈالئے۔ پھر معلوم ہوگا کہ طلوع اسلام کن حالات میں شائع ہوا اور اس کی اشاعت سے غرض و غایت کیا تھی۔ ہندوستان میں مسلمان بہ حیثیت **مسلمان** تو بہت پہلے سے ختم ہو چکا تھا (ہمارا مقصد کفر اور اسلام کے امتیاز سے نہیں بلکہ انفرادی (یعنی عجمی) اور اجتماعی (یعنی اسلامی) زندگی سے ہے) لیکن مخالف قوتوں کی آتش حسد فتنہ سامان اس سے بھی فرو نہ ہوئی تھی۔ انھوں نے ایک منظم سازش کر رکھی تھی کہ جس حیثیت میں مسلمان یہاں موجود ہے اس کی وہ حیثیت بھی (خاکم بدہن) ختم کر دی جائے اور اسے اس طرح اپنے اندر جذب کر لیا جائے کہ من و تو کا جھگڑا ہی مٹ جائے اس گہری سازش کو بروئے کار لانے کے لئے بڑے بڑے نظر فریب پردے لٹکائے اور دام ہمرنگ زمین بچھائے گئے تھے۔ یہ کچھ غیروں کی طرف سے ہو رہا تھا لیکن اس سے مہیب تر مصیبت یہ تھی کہ بہت سے مسلمان۔ کچھ اپنے اغراض کے ماتحت کچھ سادہ لوحی کی بنا پر غیروں کے دام فریب میں جکڑے جا چکے تھے۔ ان سب میں قابل افسوس طبقہ علمائے کرام کا تھا اور یہی وہ طبقہ تھا جو سب سے زیادہ نقصان کا موجب بنا تھا۔ اس لئے کہ عوام پر علماء کا بڑا اثر ہوتا ہے اور اسی وجہ سے ایک عالم کی لغزش سب سے بڑی تباہی کا موجب بن جاتی ہے۔

لہٰذا طلوع اسلام کے سامنے دو مقصد تھے۔ ایک یہ کہ مسلمان جس حیثیت میں بھی ہندوستان میں موجود ہیں۔ ان کے تحفظ و بقا کے لئے کوشش کرنا اور دوسرے یہ کہ انھیں صحیح معنوں میں مسلمان بننے کے راستہ کی طرف لیجانا۔

•

شق اول اس لئے اہم تھی کہ جب ہندوستان میں (خدانکردہ) مسلمان ہی باقی نہ رہے تو پھر اصلاح کس کی کیجائے گی! جب آب و گل ہی باقی نہ رہے گا تو پیکر کس چیز کا بنے گا اور روح کس میں پھونکی جائے گی۔ اور شق دوم اس سے بھی اہم تھی کہ مسلمان کے لئے حقیقی زندگی تو **مسلمان** ہی کی زندگی ہے۔ اور یہ زندگی اس اجتماعیت کے بغیر ناممکن ہے جس کا مرکز حکومت الٰہیہ ہو۔ اس کے لئے رجعت الی القرآن

شرط اولین ہے۔

شق اول کے لئے مسلمانوں کی ٹوٹی پھوٹی جماعت (مسلم لیگ) کی از سر نو تشکیل شروع ہو چکی تھی اس لئے طلوع اسلام نے اپنے مقصد پیش نظر کے حصول کی خاطر۔ اس جماعت کی تائید و حمایت کو اپنا فریضہ سمجھا۔ لیکن اندھی تائید و حمایت کو نہیں۔ اس لئے کہ اس کے سامنے شق اول کے ساتھ ساتھ شق دوم بھی تھی۔ اس لئے اس نے مسلم لیگ کے ہر ایک قدم کو اپنی نگاہوں سے پرکھا اور قرآن کی روشنی میں جانچا۔ اور تائید حق و صداقت کی۔ کی طلوع اسلام کا مسلم لیگ کے ساتھ اس سے زیادہ کچھ تعلق نہیں تھا۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے مسلم لیگ کے مدمقابل (بدقسمتی سے) علماء کرام کی جماعت تھی جو متحدہ قومیت کے نظر فریب و جاذب نگاہ دام کا شکار ہو چکی تھی۔ علماء کرام کے پاس عوام پر اثر اندازی کے لئے مذہب کا نام سب سے مؤثر ذریعہ تھا۔ اتفاق سے مسلم لیگ کے ارباب بست و کشاد (بالعموم) اس راہ سے زیادہ واقف نہ تھے۔ طلوع اسلام کا مدار ہی کتاب و سنت پر تھا اس لئے مسلم لیگ کے نصب العین کی حقانیت کی تائید میں قال اللہ اور قال الرسول کی سند پیش کرنے کی سعادت مبداء فیض کی طرف سے اس کی پیشانی کے خطوط میں لکھی تھی۔ طلوع اسلام نے اس خدمت کو کس انداز سے سرانجام دیا۔ اس کے متعلق اپنی طرف سے کچھ کہنا خود ستائی ہوگی۔ اس چار برس کے متغیر حالات اس کی زندہ شہادت ہیں۔ اور اصل شہادت تو اللہ کی میزان میں ہی مل سکتی ہے جو صرف حرکات و سکنات ہی کو نہیں تولتی بلکہ نیت اور ارادہ کو بھی پرکھتی ہے۔ کسی اور کی نگاہ میں اس خدمت کی جو قیمت ہو سو ہو۔ ہماری تو یہ حالت ہے کہ جب اپنی ان ناچیز مساعیٔ ناتمام کے اثرات و نتائج پر نگاہ جاتی ہے تو جبین نیاز اس بارگاہ صمدیت کے آستانۂ عالیہ پر جھک جھک کر سجدے کرتی ہے۔ یقیناً نتائج ہماری مساعی سے کہیں بڑھ کر اور اثرات ہماری جد و جہد سے کہیں زیادہ ہیں۔ اور یہ سوائے اس رب ذو المنن کی رحمت اور نوازش کے اور کیسے ہو سکتا تھا! جی چاہتا ہے کہ بطور تحدیث نعمت قطع کردہ منزل کے چند ایک نشانات راہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھیں۔

(۱) جون ۱۹۴۳ء کی اشاعت میں "سوراجی اسلام" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا گیا جس میں بصراحت بتایا گیا کہ مسلمان نیشنلسٹ حضرات کے نزدیک اسلام کا مفہوم مسلک قومیت پرستی سے پہلے اور بعد میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ یہ مضمون اس قدر مقبول اور اثر انداز ہوا کہ اسے جداگانہ پمفلٹ کی صورت میں شائع کرنا پڑا۔ اس وقت تک اس کی مانگ برابر چلی آ رہی ہے۔

(۲) جولائی ۱۹۳۸ء میں جب کانگریسی حلقوں سے مسلم لیگ کے ساتھ مصالحت کی سلسلہ جنبانی ہو رہی تھی۔ گفتگوئے مصالحت کے عنوان سے ایک بسیط مقالہ شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں صلح کن بنیادی اصولوں پر ہو سکتی ہے۔ اس کا بھی الگ پمفلٹ شائع ہوا۔ اور دوسرے ایڈیشن میں اس کا عنوان "مسلم لیگ کا بنیادی مطالبہ" رکھا گیا۔

(۳) اگست ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں "واردھا کی تعلیمی اسکیم" کے متعلق وہ معرکتہ الآرا مضمون شائع ہوا جس نے ہندوستانی سیاست میں فی الواقعہ ایک نشانِ راہ کا کام دیا۔ یہ رسوائے عالم اسکیم درحقیقت ایک گہری لیکن خاموش سازش تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی آیندہ نسلوں کو یکسر اسلام سے بیگانہ بنا دیا جائے۔ الحمد للہ علیٰ ذالک کہ اس کے خلاف پہلی اور مؤثر آواز اٹھانے کی سعادت طلوع اسلام کو نصیب ہوئی مضمون کی اہمیت، مقبولیت اور اثر اندازی کا اس سے اندازہ فرمائیے کہ اس کا ترجمہ ملک کی تمام بڑی بڑی زبانوں میں ہوا۔ متعدد رسائل و جرائد نے اسے نقل کیا۔ اور صرف اردو میں اس کے بیس ہزار کے قریب پمفلٹ شائع ہوئے اسوقت تک اس کی طلب بڑھتی چلی جارہی ہے۔ اس ایک پمفلٹ سے (بتوفیق ایزدی) واردھا اسکیم کے واضعین کے منصوبے خواب پریشاں بن کے رہ گئے۔ یہ اللہ کا احسان ہے اور اس کی رحمت

(۴) اکتوبر ۱۹۳۸ء میں ایک مضمون بہ عنوان "زبان کا مسئلہ" شائع ہوا۔ جس میں اس سازش کا انکشاف کیا گیا جس کی رو سے اردو کے بجائے "ہندی اتھوا ہندوستانی" کو رائج کر کے مسلمانوں کو ان کی متاعِ علمی کی وراثت سے محروم کئے جانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ اس موضوع پر اس پمفلٹ نے حرفِ آخر کا کام دیا (فالحمد للہ علیٰ ذالک)

(۵) جنوری ۱۹۳۹ء میں "متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد" کے عنوان سے مضمون شائع ہوا جس سے اس غیر اسلامی نظریہ کی تردید کی گئی کہ "قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں" اس پمفلٹ میں قومیت کے بنیادی اصول۔ مسلم اور غیر مسلم قومیت کے تصورات کا فرق۔ کتاب و سنت کی روشنی میں اسلامی قومیت کی تشکیل اور نصوص صریحہ سے جناب مدنی کے عجمی نظریہ کا ابطال اس انداز سے کیا گیا کہ اس کا جواب نہیں بن پڑا۔

(۶) مارچ ۱۹۳۹ء میں دہلی میں جمعیتہ العلماء کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا تو حضرات علمائے کرام کی خدمت میں ایک کھلی عرضداشت بھیجی گئی۔ جس میں بدلائل و براہین بتایا گیا کہ اسلامی مرکزیت کو چھوڑ کر قومیت پرستی

کا مسلک کس طرح اسلام کی رُوح کے منافی ہے۔ اس مضمون کا بھی الگ پمفلٹ شائع کیا گیا۔

اسی اشاعت میں حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمتہ کے ۱۹۳۰ء کے مشہور خطبۂ صدارت کا اردو ترجمہ شائع کیا گیا جس میں اصل خطبہ کی روح نہایت آب و تاب سے جھلک رہی تھی۔

(۷) جون ۱۹۳۹ء میں ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب (حیدر آبادی) کی منطقوں کی تقسیم کی مشہور اسکیم شائع کی گئی۔ اس کا بھی الگ پمفلٹ شائع ہوا۔

(۸) جولائی ۱۹۳۹ء میں "سوشلزم اور اسلام" کے عنوان سے ایک مبسوط مقالہ شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ حقیقی سوشلزم کیا ہے اور دورِ حاضرہ کا سوشلزم اسلام سے کیا نسبت رکھتا ہے۔ الگ پمفلٹ کی صورت میں بھی چھاپا گیا۔

(۹) اگست ۱۹۳۹ء میں "کفار سے دوستی" کے عنوان سے ایک جامع مضمون شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات کی صحیح نوعیت کیا ہو سکتی ہے۔

(۱۰) ستمبر ۱۹۳۹ء میں "کانگریس بے نقاب" کے عنوان سے ایک حقائق پرور مضمون شائع ہوا جس میں کانگریس کے چہرے سے نظر فریب نقاب اتار کر اس کے اصل خط و خال دیدۂ بینا کے سامنے پیش کئے گئے۔ الگ پمفلٹ بھی شائع ہوا۔

(۱۱) دسمبر ۱۹۳۹ء میں "اسلام اور جمہوریت" کے عنوان سے ایک بصیرت افروز مقالہ شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ مغربی انداز جمہوریت کس طرح اسلامی تعلیم کے خلاف ہے اور حقیقی جمہوریت کیا ہے۔

(۱۲) جنوری ۱۹۴۰ء میں ہندی سیاست میں ایک ایسا موڑ آیا جس نے فی الواقعہ جناب جناح کے حسنِ تدبر کی دھاک بٹھادی۔ طلوع اسلام نے اس اہم موقعہ پر "یوم نجات" کے عنوان سے ایک مقالہ شائع کیا جس میں واضح کیا کہ "اس دن" کی اہمیت کیا ہے۔

اس اشاعت میں نیشنلسٹ علماء کے مسلک پر قرآنی روشنی میں مزید تنقید کی گئی۔

(۱۳) ابتدائے ۱۹۴۰ء میں "کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی" کا عام چرچا تھا جو کانگریسی بساطِ سیاست کا ایک خطرناک مہرہ تھا۔ فروری ۱۹۴۰ء میں اس مہرے کی چالوں کو بے نقاب کیا گیا۔

(۱۴) مارچ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس (لاہور) منعقد ہوا جس میں پاکستان کے نصب العین کا ریزولیوشن پاس ہوا۔ طلوع اسلام نے اس تقریب پر اسلامی سیاست کے مختلف

گوشوں پر قرآنی روشنی میں تبصرہ کیا اور بتایا کہ پاکستان کیا ہے!

(۱۵) جناب ابو الکلام صاحب آزاد ایک عرصہ کی طویل خاموشی کے بعد۔ کانگریس کے سالانہ اجلاس کے خطبۂ صدارت میں لب کشا ہوئے تھے۔ اپریل ۱۹۴۰ء میں راشٹرپتی کے عنوان سے خطبۂ صدارت پر تفصیلی تبصرہ کیا گیا۔ یہ الگ پمفلٹ کی صورت میں بھی طبع ہوا۔

(۱۶) جون ۱۹۴۰ء میں "جہانِ نو" کے عنوان سے وہ حقیقت کشا مقالہ شائع ہوا جس میں نظریۂ پاکستان کی تشریح و تفصیل اور مخالفین کے اعتراضات اور ان کے جواب واضح طور پر پیش کئے گئے پاکستان کے متعلق یہ مقالہ فی الواقعہ قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا پمفلٹ بیحد مقبول ہوا۔ اور ابھی تک اس کی مقبولیت کی رفتار بدستور جاری ہے۔

(۱۷) فروری ۱۹۴۱ء میں "قیاس کن زگلستان من بہار مرا" ... "کجا واعظ" کے عنوان سے ایک مرتبہ پھر قومیت پرست حضرات کے مسلک کا تجزیہ کرکے ان کی غلطی کو ان پر واضح کیا گیا ہے۔

(۱۸) ستمبر ۱۹۴۱ء میں "لمحۂ فکریہ" کے عنوان سے مسلمانوں کو آنے والے خطرات سے آگاہ کیا گیا۔ اور ان کا مستقبل جن ہولناک مصائب سے پٹا پڑا ہے۔ ان سے متنبہ کیا گیا۔

(۱۹) جنوری ۱۹۴۲ء میں "دنیا کی نجات" کے عنوان پر ایک حقیقت افروز مقالہ میں مسٹر آرتھر مور (ایڈیٹر اسٹیٹسمین) کے ایک مضمون کے جواب میں بتایا گیا کہ دنیا کی حقیقی نجات کس اندازِ زندگی میں ہے

(۲۰) فروری ۱۹۴۲ء میں رازِ حیات کے عنوان سے اس حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی زندگی کا راز کس طرح نظم و اطاعت میں مضمر ہے۔

اپریل ۱۹۴۲ء کا پرچہ آپ کے سامنے ہے۔

یہ وہ ابھرے ہوئے عنوانات ہیں جو اس وقت سامنے آگئے۔ ان کے علاوہ متعدد دیگر مضامین انہی حقائق کو لئے ہوئے زینت دہ اوراق ہوئے۔ ان کے علاوہ طلوع اسلام کے "حقائق و عبر" اور "لمعات" درحقیقت گذشتہ چہار سالہ ہندی (اور اسلامی) سیاست کی زندہ تاریخ ہیں۔ جس قدر واقعات و حوادث مہینہ بھر میں سامنے آتے رہے۔ ان پر بے لاگ تنقید اور بے لوث تبصرہ۔ ان عنوانات کے ماتحت آجاتا تھا۔ اگر ان دو عنوانوں کو اکٹھا کرکے الگ شائع کر دیا جائے تو ہمارے اس انقلابی دور کی بصیرت افروز تصویر نگاہوں کے سامنے آجائے

نشر و اشاعت کی وسعتِ داماں کا اندازہ اس سے فرمائیے کہ ساٹھ ہزار کے قریب پمفلٹ اس وقت تک شائع کئے جا چکے ہیں۔

یہ سب کچھ اُس قادرِ مطلق کی ذرہ نوازیوں کے صدقے ہوا جس کی توفیق کے بغیر نہ ذہن میں کوئی خیال وارد ہو سکتا ہے۔ نہ قلب میں جلا پیدا ہو سکتی ہے اور نہ ہی قلم میں حرکت آفریں جنبش آ سکتی ہے۔

یہ شق اول تھی۔ شق دوم (یعنی دعوت الی القرآن) پہلی شق سے کہیں زیادہ مشکل اور نازک تر تھی۔ اس لئے کہ شق اول میں غلط روش کے نتائج و عواقب محسوس شکل میں سامنے آجاتے تھے اور اس طرح صحیح راستہ کی اہمیت جلدی سمجھ میں آ سکتی تھی۔ لیکن شق دوم میں سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ اس کا تعلق عقائد سے تھا۔ اور عقائد۔ خواہ کیسے ہی غلط کیوں نہ ہوں۔ انسان کی ایسی عزیز ترین متاع ہوتے ہیں کہ انھیں آسانی سے چھڑایا نہیں جا سکتا ذرا غور فرمائیے کہ مسلمان کتنے طویل عرصہ سے قرآن سے بیگانہ ہو کر غیر قرآنی نظریاتِ زندگی کو عین اسلام سمجھے ہوئے ہے۔ ان تمام غیر قرآنی معتقدات کو چھوڑ کر قرآن کریم کی صحیح راہ پر گامزن ہونا۔ جوئے شیر کا لانا ہے۔ یہ تمام مشکلات ہمارے سامنے تھیں اور ہم نے ہر ایک مشکل کا اندازہ لگا کر اس وادی میں قدم رکھا تھا اپنے مسلک کی صداقت پر غیر متزلزل یقین اور اللہ کی نصرت و توفیق پر محکم بھروسہ۔ یہ تھا ہمارا زادِ راہ اور سامانِ سفر۔ انہی کے بل بوتے پر ہم جادہ پیما ہوئے اور آج چار سال کی طے کردہ منزل پر جب ہم نگہِ بازگشت ڈالتے ہیں تو ہماری ناتواں گردن اس محسنِ حقیقی کے بارِ احسان سے جھک جاتی ہے۔ یہ اس کا فضل ہے جسے وہ عطا فرما دے۔ اس باب میں حسب ذیل مقالات ایسے ہیں جو نمایاں طور پر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

(۱) مئی ۱۹۳۸ء میں حضرت علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ العالی کا اہم مضمون بہ عنوان "فہم قرآن" شائع ہوا اور جون ۱۹۳۸ء میں اس کی دوسری کڑی "اصول قرآن" کے عنوان سے طبع ہوئی۔ ان ہر دو مضامین نے اذہان کو دعوت غور و فکر دی اور قلوب کی دنیا میں ان سے ایک امید افزا حرکت پیدا ہوئی۔

(۲) جولائی ۱۹۳۸ء کے پرچہ میں جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز کا مقالہ بہ عنوان "اجتماعی زندگی" شائع ہوا۔ جو اس سلسلۂ زریں کی پہلی کڑی تھی جس سے مسلمانوں کی انتشار و افتراق کی زندگی کی جگہ مرکزیت و اجتماعیت کی زندگی کی طرف قدم اٹھانا مقصود تھا۔

(۳) اکتوبر ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں علامہ اسلم صاحب کا مضمون "اسلامی نظام" شائع ہوا جس نے اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول

کے قرآنی مفہوم کو اپنے اصلی رنگ میں پیش کیا۔

(۴) نومبر ۱۹۳۸ء میں جناب پرویز کا ایک مبسوط مضمون بہ عنوان "مرکزیت" شائع ہوا جس میں اسلامی نظام کے نقطہ اسکی تشریح کی گئی۔

(۵) فروری ۱۹۳۹ء میں علامہ اسلم صاحب کا مضمون بہ عنوان "اسباب زوال امت" شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ ملت اسلامیہ قرآن کریم سے الگ ہو کر کن مصائب و نوائب کا شکار رہی ہے۔ اور اس کی باز آفرینی کی صورت کیا ہے!

(۶) اپریل ۱۹۳۹ء میں علامہ اسلم صاحب کا مضمون "علم تفسیر" شائع ہوا جس میں قرآنی تفاسیر پر ایک ناقدانہ تبصرہ کیا گیا اور بتایا گیا تھا کہ قرآن کریم کی صحیح تفسیر کس طرح ہو سکتی ہے۔

(۵) مئی ۱۹۳۹ء میں جناب پرویز کا مقالہ "خدا کی بادشاہت" شائع ہوا جس نے حکومتِ الٰہیہ کے بنیادی خط و خال کو نمایاں طور پر واضح کر دیا اور یوں بتایا کہ انسان کی بادشاہت اور خدا کی بادشاہت میں کیا فرق ہے اس کا پمفلٹ آج تک مقبولیتِ عامہ کا آئینہ دار ہے۔

(۶) اس سے اگلے ماہ جناب پرویز کا اس سلسلہ کا دوسرا مضمون "اسلام اور مذہبی رواداری" شائع ہوا۔ جس میں تاریخی شواہد سے بتایا گیا تھا کہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں سے کس قسم کا عدل و انصاف اور احسان اور فیاضی کا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ اس کا بھی الگ پمفلٹ شائع کیا گیا۔

(۷) ستمبر ۱۹۳۹ء میں علامہ اسلم صاحب کا مضمون "نادر شاہ اور اتحاد شیعہ و سنی" شائع ہوا جس میں تاریخ کی روشنی میں بتایا گیا تھا کہ مسلمان ایک مرکز کے قیام تک کے درمیانی دور میں اپنے اپنے جزئی اختلافات کے باوجود کس طرح اصولی اتحاد کر سکتے ہیں۔

(۸) اکتوبر ۱۹۳۹ء میں جناب پرویز کا معرکتہ الآرا مضمون "مسلمان کی زندگی" شائع ہوا متن خود عنوان سے ظاہر ہے یعنی مسلمان کی زندگی کیا ہونی چاہیئے اس کا پمفلٹ بھی متعدد بار چھپ چکا ہے۔

(۹) جنوری ۱۹۴۰ء میں جناب پرویز کا مضمون "تمسک بالکتاب" شائع ہوا ہے جس میں قرآن کی طرف رجعت کی دعوت نہایت دلنشین انداز میں دی گئی۔

(۱۰) مارچ ۱۹۴۰ء میں انہی کا مشہور مضمون "شخصیت پرستی" شائع ہوا جس میں شرح و بسط سے بتایا گیا کہ مذہب میں خدا۔ رسولؐ۔ ائمہ۔ علماء۔ مشائخ۔ وغیرہ کی صحیح صحیح پوزیشن کیا ہے۔ اس پمفلٹ نے فی الواقعہ قلوب

کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔

(۱۱) مئی سنہ ۱۹۴۰ء میں علامہ اسلم صاحب کا بصیرت افروز مضمون "علم حدیث" شائع ہوا جسے صحیح تاریخی تنقید کا شاہکار کہنا بیجا نہ ہوگا۔ اس مضمون نے علمی دنیا میں تموج پیدا کر دیا۔ اس کا الگ پمفلٹ بھی شائع کیا گیا۔

(۱۲) اگست سنہ ۱۹۴۰ء میں شاہزادہ سعید حلیم پاشا مرحوم کا مشہور مضمون "حکومت الٰہیہ" شائع ہوا۔

(۱۳) اسی ماہ جناب پرویز کا مضمون "ختم نبوت" شائع ہوا جس میں اس اہم مسئلہ کو ایک جدید اور خالص قرآنی روشنی میں پیش کیا گیا۔

(۱۴) مارچ سنہ ۱۹۴۱ء میں پرویز صاحب کا مضمون "سائنس اور اسلام" شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ مسلمانوں نے اپنے دور عروج میں سائنس میں کیا کیا معرکتہ الآرا کارنامے سرانجام دیئے۔

(۱۵) اپریل سنہ ۱۹۴۱ء میں انہی کا ایک اور مضمون "فردوس گم گشتہ" شائع ہوا جس میں انہوں نے ملت اسلامیہ کی بازآفرینی کی قرآنی شکل پر اپنے مخصوص دلکش و جاذب توجہ انداز میں بحث کی۔

(۱۶) مئی سنہ ۱۹۴۱ء میں "نظام جدید" کے عنوان سے ایک اہم مقالہ شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ دنیا کو جس نظام نو کی تلاش ہے وہ اسلام کے باہر اور کہیں نہیں مل سکتا۔

(۱۷) اگست سنہ ۱۹۴۱ء میں جناب پرویز کا مضمون "کیا تمام مذاہب یکساں ہیں" شائع ہوا۔ اس مضمون نے دنیائے مذاہب کو صحیح صراط مستقیم کی طرف دعوت غور و فکر دی اور بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کر دیا۔

(۱۸) اکتوبر سنہ ۱۹۴۱ء میں جناب پرویز کا ایک اور حقیقت کشا مضمون "نجات کا قرآنی نظریہ" شائع ہوا۔ اور دسمبر سنہ ۱۹۴۱ء میں اس کا تکملہ بہ عنوان "نظریۂ ارتقا" ان ہر دو مضامین نے موجودہ زندگی اور حیات اخروی کے متعلق قرآنی نظریہ کی نہایت مبصرانہ انداز میں وضاحت کر دی اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے دلوں میں پیدا ہونے والے بہت سے شکوک کا ازالہ کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جناب پرویز کے مضامین کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر شے کو قرآن کی روشنی میں پیش کرتے ہیں اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے شکوک و شبہات کی تسکین قرآن ہی کے چشمۂ سلسبیل سے اس انداز سے کرتے جاتے ہیں کہ رفتہ رفتہ عدم یقین کی آگ ایمان کی طمانیت میں بدل جاتی ہے۔

یہ مشتے از خروارے چیدہ چیدہ عنوانات ہیں۔ ان کے علاوہ شمس العلماء سید محب الحق صاحب کے محققانہ بصیرت افروز مقالات اور جناب اشتاق احمد خاں صاحب کے سلسلہ "اصلاح" میں قرآنی مقالات اس

سلسلہ کی دوسری کڑیاں ہیں ۔ علاوہ بریں سلیم کے نام خطوط " کا دلنشین اور دل میں اتر جانے والا سلسلہ اس دور
کا بہترین یادگار قرار دیا جا سکتا ہے ۔

پھر حصہ نظم میں جناب اسد ملتانی کی نوازش ہائے پیہم نے خمخانۂ اقبال کی صہبائے نور و بصیرت
کے وہ چھلکتے ہوئے ساغر دئے کہ جن کی لذت نگاہوں کی دنیا میں بسنے والوں کے سوا کوئی اور نہیں سمجھ سکتا۔
یہ سب کچھ محض اللہ کے فضل و کرم کے تصدق ہوا۔ ورنہ ہمارے بس میں کہاں تھا کہ اتنی سی قلیل مدت
میں معارف و حقائق کا ایسا گراں بہا مجموعہ قارئین طلوع اسلام تک پہنچا سکتے جی چاہتا ہے کہ ان حضرات کی
خدمت میں دل ہدیۂ تشکر و امتنان پیش کیا جائے جن کی نظر التفات نے طلوع اسلام کے دامن کو گوہر ہائے
نایاب سے بھر دیا لیکن پھر یہ سوچ کر اس کی جرأت نہیں پڑتی کہ ان حضرات نے کچھ ایسا قلبی یگانگت کا رشتہ پیدا کر رکھا
ہے جس کے پیش نظر اتنی سی رسم " بھی بیگانگی کی غماز معلوم ہوتی ہے۔ بہتر ہے کہ دل کی باتیں دل ہی کی زبان سے
کہی جائیں۔ الفاظ اس کی ترجمانی سے شرمندہ نہ کریں۔

جان تم پر نثار کرتا ہوں　　　میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

ان سب سے بلند و بالا اور سب سے بڑی سعادت جو ادارۂ طلوع اسلام کے حصہ میں آئی وہ جناب پرویز
کی نادر روزگار تالیف "معارف القرآن" کی اشاعت تھی۔ اس سعادت پر ہم جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ یہ بھی اللہ کے
ان احسانات میں سے ہے جن کا شکریہ ادا نہیں کیا جا سکتا۔

ہمیں یقین ہے کہ ہماری ان معروضات کو خودستائی پر محمول نہیں کیا جائیگا کیونکہ خودستائی نہیں بلکہ بارگاہ
صمدیت میں تشکر و امتنان کے اظہار کی والہانہ تمنا ہے۔ اس تحدیثِ نعمت کو خودستائی تصور نہ کیجئے کہ
ستائش و نیائش سب اسی ذاتِ بے ہمتا کو زیبا ہے جس کے آستانۂ عالیہ کے ہم سب بھکاری ہیں۔ گداگر
کی جھولی میں اگر موتیوں کی مالا ہے تو اس کا حقیقی فخر اس متاعِ گراں بہا کے بخشندہ کے لئے ہے نہ کہ گداگر کے لئے

اس تمام حرف شیریں کے ساتھ ساتھ ایک تلخ حقیقت بھی۔ شومئی قسمت کہ ہماری اس تمام تگ و دو
میں مولوی حضرات کا طبقہ جسے نہ صرف ہمارے ساتھ ساتھ بلکہ پیش پیش ہونا چاہیئے تھا بطور مدمقابل سامنے آگیا۔

شق اول میں اس لئے کہ قوم کی بدبختی سے موجودہ سیاسی کشمکش میں ان حضرات نے (بالعموم) متحدہ قومیت کا غیر اسلامی مسلک اختیار کر لیا اور ان کے دعاوی کا کتاب و سنت کی روشنی میں ابطال۔ طلوع اسلام کے مقدر میں لکھا گیا۔ اور شق دوم میں اس لئے کہ قرآن کی تعلیم کی طرف دعوت کئی ایک ایسے غیر اسلامی نظریات زندگی کے خلاف جاتی تھی جو ایک عرصہ سے مسلمانوں میں پختہ عقائد کی حیثیت اختیار کر چکے تھے اور جن کے اجارہ دار ہمارے یہ مولوی صاحبان تھے۔ لہٰذا ان حضرات کی طرف سے طلوع اسلام کی مخالفت ضروری تھی۔ اگر یہ حضرات دلائل و براہین سے اپنے مسلک کی حقانیت اور طلوع اسلام کے پیش کردہ نظریات کی مخالفت کرتے تو ہمیں اس سے خوشی ہوتی۔ لیکن افسوس کہ ان حضرات نے اپنی مخصوص روش کو اس مقام پر بھی نہ چھوڑا۔ اور دلائل اور براہین کی بجائے "سیاسی اور مذہبی گالیوں" پر اتر آئے۔ شق اول میں انگریز پرست۔ ٹوڈی۔ حکومت کے کاسہ لیس۔ برطانیہ کے پٹھو۔ اور اسی قسم کی گالیاں۔ اور شق دوم میں ملحد۔ بے دین۔ گمراہ۔ نیچری۔ منکر حدیث۔ چکڑالوی اور خدا جانے کیا کیا نام رکھے۔ اور یوں اپنی آتش انتقام کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ہزار ہزار احسان اس دلوں کی کائنات کے مالک کا جس نے ہمارے دامن کو راستہ کی ان خار دار جھاڑیوں میں الجھنے سے محفوظ رکھا۔ اور جوں جوں راستہ کا یہ ہنگامہ بڑھتا تھا۔ چراغ منزل روشن سے روشن تر ہو کر ہمارے قریب آ گیا اور اس کی جاذبیت نے ہمیں فرصت ہی نہ دی کہ ہم ان ہنگامہ خیزیوں میں جذب ہو کر رہ جائیں۔ ان مقامات سے صحیح و سالم گذار کرلے جانا۔ توفیق ایزدی کے سوا اور کس کے بس میں تھا۔

بہرحال یہ ہے مختصر سی روئداد اس راستہ کی جسے طے کرنے کے بعد ہم آج توفیق ایزدی اپنی چوتھی منزل تک پہنچ رہے ہیں جنگ کی وجہ سے پیدا شدہ نامساعد حالات ایسے نازک سے نازک تر ہوتے جا رہے ہیں کہ ان کے اثر سے محفوظ رہنا ناممکن ہے۔ ان حالات کی وجہ سے پیدا شدہ مشکلات کا ضمنی تذکرہ اس سے بیشتر ان صفحات پر آتا رہا ہے ان مشکلات کا روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور صورت حالات کے بہتر ہونے کی ابھی کوئی شکل نظر نہیں آتی۔ اس ضمن میں آپ حضرات سے اتنے سے تعاون کی درخواست ہے کہ طلوع اسلام کا شائع کردہ لٹریچر (جس کی تفصیل الگ دی جا رہی ہے) خرید فرما کر اس کی عام اشاعت کریں۔ اس کے علاوہ ایک درخواست اور بھی ہے۔ طلوع اسلام نے اپنی اس چہار سالہ زندگی میں کبھی ناغہ نہیں کیا۔ لیکن چار سال کے مسلسل سفر کے بعد جی چاہتا ہے کہ ایک ماہ کی آپ سے رخصت مانگ لی جائے۔ چار سال میں ایک عید کی

رخصت کا حق تو ملنا ہی چاہئیے - گذشتہ چند ماہ سے کاغذ کی کمیابی اور گرانی کی وجہ سے طلوع اسلام کی ضخامت ۲۴ صفحات کی کردی گئی ہے - لیکن موجودہ پرچہ ۱۱۶ صفحات پر مشتمل ہے اس لئے اگر ہم لے - ایک ماہ کی رخصت کی بنا پر - اپریل اور مئی کا مشترکہ پرچہ قرار دیں لیں تو ہمیں امید ہے کہ قارئین اپنی کشادہ دلی سے کام لیتے ہوئے ہمیں اس کی اجازت دیدیں گے - لہذا مئی کا پرچہ الگ شائع نہیں ہوگا - ہم اس غیر حاضری کو خود بھی محسوس کرتے ہیں اور ہمیں اس کا بھی احساس ہے کہ قارئین اسے کس طرح محسوس کریں گے - اس کے لئے ہم اپنے احباب سے معذرت خواہ ہیں -

---

مارچ ۱۹۴۲ء کا مہینہ بھی ہندوستان کی تاریخ سیاست میں یادگار رہیگا - جن لوگوں کی نگاہیں رفتارِ زمانہ اور انگلیاں نبضِ اقوام پر رہتی ہیں انھوں نے برطانیہ کے ایوانِ حکومت کے پردوں کی جنبش سے بھانپ لیا کہ ہندی سیاست کے مسئلہ میں ایک نیا دور آنے والا ہے چنانچہ اس کے بعد فضا میں یہ خبر گشت لگانے لگی کہ حکومت برطانیہ کے ارباب بست و کشاد مسئلہ ہند کی پیچیدہ گتھی کو سلجھانے کی فکر میں منہمک ہیں - ادھر یہ ہو رہا تھا اور ادھر ہندوستان میں ہندو راج کے منصوبے گانٹھنے والوں کے دل طلسم پیچ و تاب بن رہے تھے - انھوں نے وقت کی نزاکت اور مسئلہ کی اہمیت کا خوب احساس کیا اور سمجھ لیا کہ بساط سیاست پر آخری چالیں چلنے کا زمانہ آپہنچا ہے چنانچہ انھوں نے اپنے مخصوص "نسکاریانہ" انداز میں آوازیں دیں اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ادھر اُدھر سے سدھے ہوئے پرندے پھڑ پھڑاتے باہر نکل آئے - دہلی میں غلاموں کے غلام یعنی آزاد مسلم کانفرنس کے بورڈ کا جلسہ ہوا - یہ وہی کانفرنس ہے جسے دو برس ادھر تجویز پاکستان کی مخالفت کی غرض سے دہلی میں جمع کیا گیا تھا اور جس کا اس کے بعد کہیں نام تک بھی سننے میں نہ آیا تھا - چنانچہ یہ حضرات دہلی کے کسی گمنام گوشے میں جمع ہوئے اور آپس ہی میں فیصلہ کرلیا کہ وہ ہندوستان کی نو بڑی بڑی جماعتوں کے نمایندہ ہیں - اور ہندوؤں کے اخبارات نے بڑے بڑے جلی حروف سے اعلان کردیا کہ

"آزاد مسلم کانفرنس نے یہ ثابت کردیا ہے کہ مسلمانوں کی کثیر جماعتیں مسلم لیگ کے روڑا اٹکانے والے رویہ کو پسند نہیں کرتیں" (ہندوستان ٹائمز ۴۲-۴-۳)

جب یہ تماشا یہاں دکھایا جاچکا تو یہ "کمپنی" لاہور چلی گئی اور انہی "ایکٹروں" سے وہاں نئی "سین سینری" سے اور ڈرامے اسٹیج کئے گئے - وہاں کانگریس کے (SHOW BOY) جناب راشٹرپتی صاحب بھی اپنی اداکاری

کے لئے تشریف فرما تھے۔ وہاں ان حضرات نے پنجاب کے وزیر اعظم۔ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن رکین۔ جناب سر سکندر حیات خاں سے بھی گفت و شنید کی اور کچھ وقت کے لئے اخبارات میں یہ خبر گشت لگاتی رہی کہ جناب سر سکندر مسلم لیگ اور کانگریس میں باہمی مصالحت کی سعی فرما رہے ہیں۔ دو فریقوں میں ایک تیسرے فریق (ثالث) کی وساطت سے مصالحت کے تذکرے تو دنیا نے عام سنے تھے۔ لیکن مصالحت کی یہ انوکھی کوشش لاہور ہی کے حصہ میں آئی کہ ایک جماعت (مسلم لیگ) کا ذمہ دار رکن۔ اپنی جماعت اور فریق مقابل میں صلح کی کوشش کر رہا ہے! مصالحت و مفاہمت کی یہ مساعی جمیلہ اس تذبذب کی بری طرح غمازی کر رہی تھیں جس کی رو سے یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا تھا کہ حکومتِ برطانیہ کی تجاویز کی رو سے ملک کی قوت کانگریس کے قبضہ میں منتقل ہونے والی ہے یا لیگ اور کانگریس دونوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ پھر لاہور کے تماشے کے بعد کہیں سے انصار (یعنی جماعتِ مومنین) کے خود ساختہ "نمائندوں" کو تلاش کیا گیا اور ان سے اعلان کرایا گیا کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت نہیں ہے۔ غرضیکہ جہاں کہیں سے کوئی غدارِ ملت ملا۔ ڈھونڈھ کر نکالا گیا اور اس سے کہا گیا کہ

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

غرضیکہ چاروں طرف سے چیخ و پکار کی وہ بھیانک آوازیں بلند کرائی گئیں کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ تار پر تار۔ اعلان پر اعلان۔ ریزولیشن پر ریزولیشن۔ گلے مسلمانوں کے۔ ڈھنڈورا ہندو کا۔ سات سمندر پار ایک طوفان برپا کر دیا کہ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ نہیں ہے۔

اس تمام خلفشار میں خدا کا ایک نحیف و زار بندہ۔ سب کچھ خاموشی سے دیکھ رہا تھا اور نہایت حسرت بھری نگاہوں سے آسمان کی طرف تک رہا تھا کہ اے اللہ! یہ سب مسلمانوں جیسا نام رکھنے والے یہ جہادِ عظیم کس بات کے لئے کر رہے ہیں! اس بات کے لئے کہ کہیں ہندوستان کے کسی گوشہ میں خدا کا نام لینے والوں کو آزادی کا سانس لینا نصیب نہ ہو جائے۔ اس غرض کے لئے کہ کہیں خدا کی زمین پر پھر سے خدا کی حکومت قائم نہ ہو جائے۔ اللہ اکبر!

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں۔

۲۳ مارچ کو حکومتِ برطانیہ کا پیغام بر خصوصی۔ سر اسٹیفورڈ کرپس۔ حکومت برطانیہ کی تجاویز کی دستاویز

بلکہ نئی دہلی پہنچ گیا۔ حساس قلوب سینوں میں دہک دہک کر رہے تھے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ میں ایسا
نازک دن کبھی نہیں آیا تھا۔ ہندوؤں کی سازش۔ ان کی تنظیم۔ دولت۔ قوت۔ باہمی اتحاد۔ نصب العین کی وحدت
مرکزیت۔ پریس۔ اسٹیج۔ پراپیگنڈا۔ انگریز کو مرعوب کر دینے کے تمام حربے ایک طرف اور نشست۔ افتراق
بدلی۔ منافقت۔ خودغرضی۔ لامرکزیت۔ عدم اطاعت۔ بے سروسامانی۔ بے زبانی۔ دوسری طرف
لیکن ان تمام نامساعد حالات کے طوفانوں میں ایک کمزور وناتواں ملاح۔ ٹوٹے پھوٹے تختوں کو جوڑ کر۔
نصب العین کی صداقت اور خدا کے بھروسہ پر روشنی کے بلند ومحکم مینار کی طرح قائم کہ دنیا بھر کی مخالفت
کا موجوں کے تھپیڑے آئیں اور اس کے پائے استقلال میں جنبش پیدا نہ کر سکیں۔ ایوانِ قصر ابیض کا یہ نامور
پیغام بر آیا اور اسی شام جامع مسجد کے میناروں کے سائے۔ شاہجہاں کے لال قلعہ کی دیواروں کے سامنے
اللہ کے نام کی بلندی اور مسلمانوں کی لٹی ہوئی شوکت کی یاد دلاتے ہوئے ملت اسلامیہ کے واحد نمائندہ
قائداعظم محمد علی جناح نے جن الفاظ میں اس تو قیر پیغام بر کا استقبال کیا ہے۔ وہ ہندوستان کی تاریخ میں
قیامت تک کے لئے ثبت کئے جانے کے قابل ہیں وہ جناح جس سے دنیا مقنن و مدبر کی حیثیت سے
ہی متعارف ہے۔ اس شام آہنی عزم کے قالب میں تڑپنے والی بجلیوں کا پیکر نظر آتا تھا۔ افسوس کہ اپنے
پریس کی کمی کی وجہ سے بیرونی دنیا کے لئے نہ تو اس جلسہ کی روئداد ہی صحیح طور پر سامنے آسکی اور نہ ہی جناب
جناح کی پوری تقریر ہی کہیں محفوظ ہوئی۔ ہندو پریس کی تنگ نظری کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ
کم ازکم پچاس ہزار کے بے پناہ مجمع کو صرف تین ہزار بتایا گیا۔ اور تقریر کی یہ کیفیت کہ ہر اخبار نے اپنے
اپنے زاویہ نگاہ سے مختلف طریق پر اسے مسخ شدہ صورت میں شائع کیا۔ بہرحال سننے والوں نے سنا
اور جاننے والوں نے جانا کہ اس شام مسلمانوں کے اس خداداد قائداعظم نے کس حسن وخوبی سے مسلمانوں کے
نیاب قلوب کے جذبات کی صحیح صحیح ترجمانی کی۔

سر کرپس نے مختلف جماعتوں کے نمائندوں کو دعوتِ نمائندگی دی اور ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا
اور بھان متی کے پٹارے کا سارا کھیل خوابِ پریشاں ہوگیا جب سر کرپس نے مسلمانوں کی نمائندگی کے
لئے مسلمانوں کے حقیقی نمائندہ جناب جناح ہی کو مجاز تسلیم کیا۔ یہ سب سے پہلی کامیابی تھی جو جناب جناح کے
حسنِ تدبر اور خلوص وایثار کے صلہ میں اللہ تعالےٰ نے عطا فرمائی۔ لیکن اس نے ملاحظہ فرمایا جہاں ایک طرف

اس دلکشا حقیقت کو دیکھیے تھا اس کے ساتھ ہی دوسری طرف اس کے سامنے یہ تصویر بھی آئے گی کہ مسلمانوں کے خلاف۔ غیر مسلموں کی نمائندگی کے لئے بھی ایک مسلمان ہی بھیجا گیا یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ ھٰذَا وَکُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا ۝ اس "نمائندہ" سے مقصد کیا تھا؟ اس کا جواب خود غیروں کی زبان سے سنئے۔

"سر کرپس کے ساتھ موجودہ گفتگوئے مفاہمت میں کانگریس کی طرف سے ایک مسلمان "روحانی پیشوا" کی نمائندگی۔ اس شور و غوغا کی کھلی ہوئی تکذیب کے لئے کافی ہوگی (جو مسلمانوں کی طرف سے) یہ ظاہر کرنے کے لئے کیا جاتا ہے کہ کانگریس مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے حقوق کی پامالی کی سازش میں شریک ہے" (ہندوستان ٹائمز $\frac{3}{42}$-۲۷)

یعنی اس مسلمان "روحانی پیشوا" کو آگے بڑھانے سے مقصد یہ ہے کہ یہ ہندوؤں کی طرف سے صفائی کی شہادت پیش کرے تاکہ انھیں مسلمانوں کے خلاف ڈگری مل جائے! سچ کہا ہے ترجمانِ حقیقت نے کہ (بہ تبدیلیٔ مفہوم)

اگر ایں آب و جاہے از فرنگ است   جبینِ خود منہ جز بر درِ او!
سرِ پیرِ حرم بہ چولبش دہ کہ آں ضر!   حقے دارد بہ خرِ پالاں گرا او!

پریس کے نمائندوں نے لکھا ہے کہ جب جناب ابو الکلام آزاد سر کرپس سے مل کر باہر آئے ہیں تو ان کے چہرے پر سخت افسردگی چھا رہی تھی! ہمیں جناب آزاد کی اس حالت پر اس قدر ترس آیا کہ کہا نہیں جا سکتا ہمارے نزدیک ان مسلم قومیت پرستوں کے گروہ میں سب سے زیادہ قابلِ رحم حالت جناب آزاد کی ہے۔ ایسا احساس قلب اور اس قدر بے پناہ مجبوریاں! اگر سینہ حق و باطل کی کشمکش سے اضطراب و کاوش کے جہنم کے شعلوں کی آماجگاہ نہ بن جائے تو اور کیا ہو! پریس کے نمائندوں کو ان کے چہرے کی افسردگی پر حیرت ہوئی۔ لیکن اس میں حیرت کاہے کی! ضمیر کی مار کچھ کم جانکاہ نہیں ہوا کرتی۔ اس لئے ان کے چہرے سے افسردگی کی وجہ معلوم کرنے کے لئے کسی لمبی چوڑی تحقیق کی ضرورت ہی نہ تھی یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمٰھُمْ دل کی پریشانی کے حال ماتھے پر لکھے مل جاتے ہیں۔ سر کرپس کی تجاویز میں اس اصول کو بھی تسلیم کیا گیا تھا کہ جو صوبے چاہیں اپنا مرکز جداگانہ قائم کرلیں۔ اس اصول کی روشنی میں مسلمان اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کی جداگانہ حکومت کا امکان نظر آتا تھا۔ دوسری طرف خداوندانِ کانگریس کا ارشاد تھا کہ اور سب کچھ مانا جا سکتا ہے لیکن ہندوستان سے مسلمانوں کی نجات کا اصول نہیں مانا

جاسکتا۔ پھر مسٹر کرپس نے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ کو تسلیم کرلیا اور اسباب کانگریس سب سے زیادہ اسی حق نمائندگی کے خلاف تھے۔ کیئے! اس کشمکش میں اگر جناب آزاد کی چہرے کی ہوائیاں نہ اڑتیں۔ تو اور کیا ہوتا! لہذا جب وہ کمرے سے باہر نکلے ہیں تو کمرے کے اندر کی گذری ہوئی داستان ایک ایک خط و خال سے عیاں تھی۔

یہ اڑی اڑی سی رنگت یہ کھلے کھلے سے گیسو　　　تیری صبح کہہ رہی ہے تیری رات کا افسانہ

حکومت برطانیہ کی تجاویز سامنے آچکی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ جب تک ان اصولوں کی عملی تشریحات کھلے کھلے الفاظ میں طے نہ ہوجائیں جن میں مسلمانوں کو من حیث القوم اپنا جداگانہ مرکز حکومت قائم کرنے کا حق دیا جائے۔ اس وقت تک یہ تجاویز مسلمانوں کے نزدیک قابل قبول نہیں ہوسکتیں لیکن اس اصول کا تسلیم کرلینا بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا عام مسلمان میدان سیاست میں بہت پیچھے ہے۔ اس لئے اس کے لئے ابھی اس قسم کی آئینی تبدیلیوں کے اثرات کا صحیح صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ لگانا ہو تو ذرا غیر مسلموں کے تاثرات کو جانچئے۔ یہ اصول جس کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے۔ ہمارے نزدیک کچھ بھی نہیں تاوقتیکہ اس کی عملی تشکیل کی جزئیات طے نہ پا جائیں۔ لیکن ذرا مخالفین کے شور و غوغا کو دیکھئے کہ انھوں نے اس کے خلاف کس طرح آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔ اصول علیحدگی کے خلاف اس قدر کہرام کیوں مچایا جارہا ہے! اس کے لئے کہنے کو تو قومیت پرستوں کی طرف سے عجیب عجیب دلائل پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غم و غصہ اور شورشین کی خلفشار میں سچی بات بے اختیار منہ سے نکل جاتی ہے۔ چنانچہ ہندوستان ٹائمز نے اپنی ۲۰ مارچ کی اشاعت کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا ہے۔

> "علاوہ بریں۔ یہ حقیقت کہ مسلمانوں کی اکثریت کے دونوں علاقے ہمارے ملک کے شمال مغربی اور شمال مشرقی دروں کو روکے ہوئے ہونگے باقی ملک کی حفاظت کے مسئلہ کو ناممکن بنا دیں گے۔ اس لئے کہ جو لوگ علیحدگی کے خواہاں ہیں وہ اس حقیقت کا کھلا کھلا اعلان کرتے ہیں کہ ان کے قلبی رجحانات۔ ہندوستان کے دوسرے باشندوں کے مقابلہ میں سرحد پار کے لوگوں کی طرف زیادہ ہیں"۔

غور فرمایا آپ نے کہ علیحدگی کے نظریہ کی مخالفت ہندوؤں کی طرف سے کیوں ہورہی ہے؟

بہرحال۔ اس اصول کے تسلیم کئے جانے سے اور کچھ ہوا یا نہ ہو۔ کم از کم اتنا ضرور ہوا کہ پاکستان کا نصب العین اور زیادہ نمایاں حیثیت سے مسلمانوں کے سامنے آ گیا اور اس پختگی سے عوام کے دلوں میں گھر کر گیا کہ اب اگر (بالفرض محال) لیگ بھی اس نصب العین سے ہٹ جائے تو بھی مسلم عوام اس سے کبھی نہیں ہٹ سکتے۔ اب اس نصب العین کو دنیا کی کوئی طاقت مسلمانوں کے دل سے نہیں نکال سکتی۔ سچ کہا تھا حکیم الامت نے کہ پاکستان مسلمانوں کے لئے مقدر ہو چکا ہے۔ فی الواقعہ یہ "ارضِ مقدس" مسلمانوں کے حصہ میں لکھی جا چکی ہے اب یہ مسلمانوں کے اپنے بس میں ہے کہ اسے جلدی حاصل کر لیں یا قوم بنی اسرائیل کی طرح چالیس سال کی دشت پیمائیوں کے بعد حاصل کریں۔ بہرحال یہ زمین ان کے نام لکھی جا چکی ہے۔ اب کام کرنے کا وقت آیا ہے۔ اور وہ کام کیا ہے؟ کوئی لمبی چوڑی قربانی نہیں۔ صرف اتنا کہ پاکستان کا چرچا عام کر دیا جائے مسلم اکثریت کے صوبوں کے ایک ایک گوشے میں کونے کونے میں۔ گاؤں گاؤں۔ قریہ بہ قریہ۔ شہر بہ شہر۔ ہر جگہ ہر مقام پر اس کا چرچا کیا جائے۔ اور یہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ جناب قائداعظم نے جس فنڈ کی اپیل کی ہے اس میں کروڑوں روپے جمع کر دئے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے اللہ کی اس نعمت کی ابھی تک قدر نہیں پہچانی جو اس نے جناب جناح کی ذات میں انھیں عطا کر دی ہے۔ اس لئے نہیں پہچانی کہ یہ نعمت انھیں بالکل مفت ہاتھ آ گئی ہے۔ ذرا آج سے چار برس ادھر اپنی حالت پر غور کیجئے۔ گورنمنٹ اور کانگریس ملک میں دو ہی جماعتوں کا وجود تسلیم کیا جاتا تھا۔ یعنی ۹ کروڑ کی ملتِ اسلامیہ کا وجود ہی کوئی تسلیم نہیں کرتا تھا۔ اور آج چار برس میں حالت یہ ہے کہ ملک میں کسی کو جرأت نہیں ہو سکتی کہ کوئی ایسا نظام مسلط کر دیا جائے جو مسلمانوں کے نزدیک قابل قبول نہ ہو؟ ذرا سوچئے کہ ہم کس مقام سے کس مقام تک پہنچ گئے! اور یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ نہ کہیں ایک قطرہ خون بہایا گیا۔ نہ قیدیں کاٹی گئیں۔ نہ جیل خانے بھرے گئے۔ نہ پولیس کی سختیاں برداشت ہوئیں۔ نہ بھوکے مرے۔ نہ پیاسے رہے حتیٰ کہ پیسہ تک بھی نہ دیا۔ اور سب کچھ مفت میں ہو گیا! لیکن مفت میں نہیں ہوا۔ قدرت کی فیض گستری سے ملتِ اسلامیہ کو ایسا وکیل مل گیا جس کے دل میں شوکتِ اسلامی کے احیاء کا عشق پیدا ہو گیا! اور یہ سب کچھ اس کے حسنِ تدبر اور سوزِ عشق سے ہو گیا! لیکن اب وقت وہ آ گیا ہے کہ اس مردِ راہ بیں کے ہاتھوں کو مضبوط بنا دیا جائے۔ مسلمانو! اگر تم نے ایسا کر دیا تو بغیر ایک قطرہ خون بہائے۔ حکومت تمہاری اپنی ہو جائے گی۔ شاید دنیا کی تاریخ میں یہ پہلی مثال ہو کہ حکومت جیسی

متاعِ گراں بہا ایسی سستی مل جائے! افسوس ہے ان پر جو اس پر بھی اسے نہ خرید سکیں۔

پھر ضرورت ہے اس امر کی کہ اب مسلم لیگ اپنی پوری توجہات مسلم اکثریت کے صوبوں (بالخصوص پنجاب اور بنگال) میں مرتکز کر دے۔ کہ سب سے بڑا خطرہ یہیں پوشیدہ ہے۔ بنگال اور پنجاب کا مسلمان اس مقدس نصب العین کی خاطر سب کچھ کر ڈالے گا بشرطیکہ اس سے کام لینے والے مخلص ہوں!

ہمیں خوشی ہوئی کہ مسلم لیگ نے اپنے سالانہ اجلاس میں دو اہم ریزولیشن پاس کئے۔ ایک کی رُو سے جناب جناح کو کامل اختیارات تفویض کئے گئے کہ وہ موجودہ مفاہمت کے سلسلہ میں ملّت اسلامیہ کے لئے جو کچھ مناسب خیال فرمائیں کریں۔ فی الواقعہ جناب جناح نے اپنی بے لوث قربانیوں سے ثابت کر دیا ہے کہ قوم بلاخوف وخطر اپنا مستقبل (بتوفیق ایزدی) ان کے ہاتھوں میں سونپ سکتی ہے۔ دوسرے ریزولیشن میں حکومت سے استدعا کی گئی ہے کہ وہ خاکساروں اور علامہ مشرقی پر عائد کردہ پابندیوں کو اٹھالے۔ خدا کرے کہ اس میں کامیابی ہو جائے۔ ہم اس مقام پر ایک مرتبہ پھر اس گذارش کو دہرانا چاہتے ہیں کہ علامہ مشرقی کو چاہیئے کہ وہ مسلم لیگ کے عسکری بازو کی حیثیت سے اس مرکزی جماعت کے ساتھ شامل ہو جائیں اور خاکساروں کی جماعت کو مسلم نیشنل گارڈ کی شکل میں تبدیل کر دیں۔ مقصد جب مسلمانوں کی شوکت اور حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہے تو اس میں من اور تو کا کیا سوال؟ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔

وقت کی نزاکت کے اعتبار سے سب سے اہم تجویز وہ ہے جس کی رُو سے مستقبل کے خطرات سے مسلمانوں کی جان ومال اور عزّت۔ آبرو کے تحفظ کے لئے مختلف صوبوں میں حفاظتی کمیٹیاں متعین کرنے کا فیصلہ ہوا! مسلم لیگ کا بنیادی مقصد مسلمانوں کا تحفظ ہے۔ اور ایسے وقت میں جبکہ آنے والے خطرات کی خوفناک گھٹائیں چاروں طرف سے منڈلاتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہیں۔ یہ فریضہ اہم ترین حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ ہم جیسا کہ متعدد بار لکھ چکے ہیں اسلام امن وسلامتی کا مذہب ہے۔ اس کے ہاں کسی کو ناحق نقصان پہنچانا کسی صورت میں بھی روا نہیں۔ اس لئے کسی شریف انسان کو مسلمانوں سے کسی قسم کے خطرے کا بھی اندیشہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اپنی حفاظت کی فکر سے بے اعتنائی برتنا۔ یہ تو خودکشی کے مرادف ہے۔

اس لئے اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان نہایت سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور کریں اور اپنے اپنے مقامی حالات کے مطابق اپنی حفاظت کی عملی تدابیر اختیار کریں۔ اگر ہمیں جرأت عرض سے معاف کیا جائے تو ہم مؤدبانہ گذارش کریں گے کہ اس معاملہ کو محض ریزولیشن کی حد تک ہی نہ رہنے دیا جائے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ چند علاقوں کے علاوہ لیگ کے ارباب ہمم محض ریزولیشن پر ہی اکتفا کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اس لئے ہم مرکزی لیگ سے خاص طور پر درخواست کریں گے کہ وہ اس مسئلہ کو خود اپنے ہاتھ میں لے اور حفاظتی تدابیر کا پورا پورا بندوبست کرے۔ اگر اس غرض کے لئے الگ روپیہ کی ضرورت ہو تو اس کا فوری اعلان کیا جائے۔ سب سے اہم سوال نیشنل گارڈ کی ترتیب و تنظیم کا ہے۔ اس طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے۔ عوام کو چاہیئے کہ اپنے آپ کو لیگ کے مرکز سے وابستہ کر لیں اور کارکنانِ لیگ کو چاہیئے کہ اس نازک وقت میں اپنے اندر خدمتِ خلق کا جذبہ پیدا کریں۔ وَاللہُ المستعان

اشاعتِ زیرِ نظر میں عمداً تاخیر کر دی گئی تھی۔ ایک تو اس لئے کہ سر کرپس کی تجاویز کے متعلق آخری فیصلہ کا انتظار تھا۔ اور دوسرے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی بنا پر۔ سر کرپس کی تجاویز کے متعلق تو ابھی تک کوئی تصفیہ نہیں ہو سکا۔ ان سطور کی تحریر (یعنی ۸ اپریل کی شام) تک یہ مسئلہ مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کے زیرِ بحث ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ ہے بھی اس قدر اہم اور نازک کہ اس کے فیصلہ میں ذرا سی غفلت یا جلد بازی نہ معلوم قوم کو کہاں سے کہاں پہنچا دے۔ اس لئے ، ۲۷ مارچ سے اس وقت تک اس پر کامل غور و خوض کیا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ فیصلہ کچھ بھی ہو۔ مرحلہ بڑا دشوار گذار سامنے ہے۔ اگر ان ضروری تفاصیل کے حسبِ منشا طے ہو جانے کے بعد جن کی تشریح کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ ان تجاویز کو قابلِ قبول سمجھ لیا گیا تو جنگ کے دوران میں اندرونی ضبط و نظم اور بیرونی حرب و ضرب کی ذمہ داری ایسی اہم ہے جس کے لئے فولادی کندھوں کی ضرورت ہے۔ اس ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے لئے قوم کے ہر فرد کے بہترین تعاون کی ضرورت ہوگی۔ اور اگر لیگ کے مطالبات منظور نہ کئے گئے تو پھر قوم کے ذمے جو اہم فرائض عائد ہونگے۔ ان کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ لہٰذہ صورت کچھ بھی ہو۔ اب ہل اگوری کا وقت ختم ہو گیا۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اگر یہ مسئلہ نہ بھی سامنے آتا تو بھی جنگ کے شعلوں کی لپک کے پیشِ نظر قوم کے تحفظ کا سوال ہی اتنا اہم ہے کہ اس کے لئے باتوں کو چھوڑ کر کچھ کر کے دکھانا ضروری ہو چکا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں راسخ عزائم۔ خون میں صحیح حرارت اور بازوؤں میں صالح قوت عطا فرمائے تاکہ دنیا کے امن کے ضامن اور انسانیت کی حفاظت کے کفیل۔ کم از کم اپنے تحفظ کا سامان تو کر سکیں۔

باقی رہا لیگ کا جلسہ۔ سو اس کے متعلق جو روئداد اس وقت تک سامنے آئی ہے وہ بلاشبہ اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ مسلم عوام میں اب بیداری اور جوش پیدا ہو چکا ہے اور وہ اپنے قائد کے حکم کے ماتحت اپنے ملی نصب العین کے حصول کے لئے سچی تڑپ رکھتے ہیں۔ یہ عجیب تماشا ہے کہ ہمارے قومیت پرست حضرات (بالخصوص علمائے کرام) پاکستان کے خلاف ہمیشہ یہ دلیل لاتے ہیں کہ اس سے اقلیت کے صوبوں کے مسلمان بیکسی وکس مپرسی کے عالم میں رہ جائیں گے۔ لیکن کیفیت یہ ہے کہ پاکستان کی حمایت سب سے زیادہ شدومد سے اقلیت ہی کے صوبوں کی طرف سے ہو رہی ہے۔ لاہور میں جب پاکستان کا ریزولیشن پیش ہوا تو اقلیت کے صوبوں کے اسلامی نمائندوں میں سے ایک ایک نے آگے بڑھ کر انتہائی خلوص اور جوش سے اس کی تائید کی اور اب اس ریزولیشن کی عملی تشکیل کے زمانہ میں لیگ کا اجلاس خود اقلیت کے صوبہ میں ہوا۔ ہم اس ملی جشن کے تمام کاربردازان کی خدمت میں ان کی قابل رشک کامیابی پر ہدیۂ تہنیت پیش کرتے ہیں۔

آخر میں ایک مرتبہ پھر دہرا لیجئے کہ آپ نے کرنا کیا ہے۔

(۱) قائداعظم کی اپیل کے جواب میں جو کچھ زیادہ سے زیادہ ہو سکے۔ ۱۰ اورنگ زیب روڈ نئی دہلی کے پتہ پر جلد از جلد بھیج دیجئے (۲) مسلم لیگ کی تجویز کے مطابق مسلمانوں کے تحفظ کی خاطر مقامی کمیٹیاں مرتب کیجئے اور ان میں عملی حصہ لیجئے (۳) نیشنل گارڈ کی تشکیل میں پوری جدوجہد کیجئے۔

(۴) مرکزی لیگ کو اتنا مضبوط بنا دیجئے کہ وہ اکثریت کے صوبوں (بالخصوص پنجاب اور بنگال) میں اپنی پوری پوری توجہات مرکوز کر سکے۔ (۵) اور یہ یاد رکھئے کہ

(ا) طلوع اسلام کا مئی کا پرچہ الگ شائع نہیں ہوگا۔

(ب) اور یہ کہ معارف القرآن کے مجلد نسخے بہت کم باقی رہ گئے ہیں۔ اس کے بعد مجلد کتاب شاید ہی مل سکے۔

دورِ حاضرہ کی عظیم الشان کتاب

معارف القرآن

(از جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز مدظلہٗ)

یعنی حقائق قرآنی کا دائرۃ المعارف۔ جو اس اصول پر مرتب کیا گیا ہے کہ قرآن اپنی تفسیر آپ کرتا ہے اور تکمیل شرفِ انسانیت کے لئے مکمل اور واحد ضابطۂ حیات ہے۔

اس کی ترتیب

کے متعلق یوں سمجھئے کہ قرآن کریم سے متعلق کوئی مسئلہ آپ کے ذہن میں آئے پوری کی پوری قرآنی تعلیم ایک دلکش مربوط مضمون کی صورت میں آپ کے سامنے ہو۔

جلد اوّل

شائع ہو چکی ہے۔ بڑی تقطیع ۲۹×۱۲/۸ کے ۶۷۵ صفحات پر مشتمل۔ کاغذ، کتابت، طباعت، جلد اعلیٰ درجہ کی

قیمت

بلا جلد	پانچ روپے 5/-	محصول ڈاک ۱۲ار
مجلد	ساڑھے چھ روپیہ	محصول ڈاک عہ/

کتاب کا مقدمہ علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہٗ کے تبحرِ علمی کا آئینہ دار ہے جس میں علمِ تفسیر پر بالخصوص محققانہ بحث کی گئی ہے۔

ناظم

ادارۂ طلوعِ اسلام قرول باغ دہلی

رجسٹرڈ ایل نمبر 4240

(۲۰۹)

معاملہ کی ضروری باتیں

(۱) طلوع اسلام ہر انگریزی مہینے کی یکم کو التزاماً شائع ہوجاتا ہے اور نہایت احتیاط سے حوالۂ ڈاک کیا جاتا ہے۔

(۲) رسالہ موصول نہ ہونے کی اطلاع زیادہ سے زیادہ دس تاریخ تک دیجئے ورنہ بعد میں شاید پرچہ موجود نہ ہو اور اگر موجود بھی ہوگا تو بلا قیمت نہ مل سکے گا۔

(۳) تبدیلی پتہ کی اطلاع ۲۰ تاریخ سے پہلے پہلے آنی چاہیئے۔

(۴) جس ماہ کی خریداری کا چندہ ختم ہوجاتا ہے اس مہینے کے پرچہ کے اندر ایک اطلاعی جوابی کارڈ رکھ دیا جاتا ہے جواب ایک ہفتہ کے اندر اندر آنا چاہیئے۔

(۵) چندہ سالانہ پانچ روپیہ معہ محصول ڈاک ہے۔ قیمت فی پرچہ (۸؍) چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجنے میں خریدار کو کفایت اور منتظمین کو سہولت رہتی ہے۔

(۶) ہر رقم موصولہ (خواہ کسی ذریعہ سے موصول ہو) کی ایک رسید بھیجی جاتی ہے۔

(۷) وی۔پی طلب کرنے کے بعد اسے وصول نہ کرنا ادارہ کو بلا جرم سزا دینے کے مرادف ہے۔

(۸) منی آرڈر کرتے وقت اپنا پتہ پورا اور صاف لکھیئے نیز رقم کی تفصیل بھی درج فرمائیے۔

(۹) آپ اپنا تعارف نمبر خریداری کے ذریعہ سے ہی کرا سکتے ہیں اس لئے اس نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولئے ورنہ ہمیں بیجد دقت اور آپکو ناواجب شکایت ہوگی۔

(۱۰) نمبر خریداری یاد نہیں رہا کرتا کہیں نوٹ کر چھوڑیئے۔

(۱۱) طلوع اسلام کوئی تجارتی ادارہ نہیں۔ بلکہ ملتِ اسلامیہ کے اجتماعی مقاصد کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے اس لئے اس سے اشتراکِ عمل اور معاونت ایک ملی خدمت ہے۔

(۱۲) خوش معاملگی کی استواری کی بنیاد یہ ہے کہ فریقین ہر وقت خدا کو اپنے درمیان رکھیں۔ وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَان

(۱۳) نمونے کے پرچہ کے لئے ۴؍ کے ٹکٹ آنے ضروری ہیں۔

(۱۴) تازہ پرچہ ۸؍

ناظم ادارۂ طلوع اسلام دہلی

Printed at the Jayyed Press, Delhi.
Published by Z. A. K. from Toolo-i-Islam Office Delhi.

بنئے کے بیاج کی شرح قرض مانگنے والے کی ضرورت کے مطابق گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ کسان کی آنکھوں میں جس قدر زیادہ درد آلود آنسو ڈبڈبائے ہوں۔ مہاجن اتنی ہی کڑی شرطیں بتائے گا۔ زمیندار اگر مقدمہ میں ماخوذ ہے اور حالت یہ ہو چکی ہے کہ اگر بروقت روپیہ ادا نہ کیا جائے تو جیل خانے بھجوا دیا جائے تو ساہوکار روپے کی تھیلی کو اور بھی زور کی گرہ لگا دے گا اگر کسی غریب کا بیٹا بیمار ہے اور علاج کے لئے کچھ پیسے درکار ہیں۔ اگر بوائی کے دن بیتے جا رہے ہیں اور کاشتکار کو تخم ریزی کے لئے غلہ کی ضرورت ہے۔ اگر زمیندار کا بیل مر گیا ہے اور کھیتی خشک ہو رہی ہے تو مہاجن قرض دینے میں سخت سے سخت ہوتا چلا جائے گا۔ غرضیکہ نفسیات مہاجنیت یہ ہے کہ دوسرے کی مصیبت اور پریشانی سے پورا پورا فائدہ اٹھایئے اور ایسے وقت میں عدل۔ انصاف۔ احسان۔ مروت غرضیکہ ہر جوہر انسانیت کو بھول جایئے۔

اس نفسیاتی کیفیت کو سامنے رکھئے اور ایک اور کیفیت کی طرف بھی توجہ دیجئے۔ میچ میں دو ٹیمیں نہایت سخت مقابلہ سے کھیل رہی ہوں۔ دونوں طرف سے برابر کا زور ہو لیکن تماشائیوں میں سے ایک ٹیم کے خلاف شور اٹھنا شروع ہو جائے کہ وہ مار دیا! وہ ہار گئے! وہ ختم ہو گئے!!!۔ تو آپ دیکھیں گے کہ کچھ عرصہ کے بعد فی الحقیقت اس ٹیم کے کھلاڑیوں کے ہاتھ پاؤں پھولنے شروع ہو جائیں گے۔ ٹانگوں میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہو جائے گی۔ حوصلے پست ہو جائیں گے۔ ہمت ٹوٹ جائے گی اور جوں جوں یہ شور بڑھتا جائے گا پریشانی۔ اضطراب سراسیمگی۔ بوکھلاہٹ زیادہ ہوتی چلی جائے گی۔

دوسرا نفسیاتی مسئلہ یہ ہے کہ جب کسی کی پریشانی بڑھ کر اس میں بوکھلاہٹ اور سراسیمگی پیدا کرنا ہو تو زور زور سے شور مچانا شروع کر دیجئے۔ جتنا زیادہ کائیں کائیں ہوگا اتنے ہی دوسرے کے ہاتھ پیر پھولتے جائیں گے۔

ان دونوں کیفیتوں کو سامنے رکھئے اور پھر ذرا ہندی سیاست پر بھی سی نگاہ ڈالئے۔ آپ دیکھیں گے کہ یہاں کے ارباب سیاست کے پاس کچھ اس قسم کے نفسیاتی حربے ہیں جنہیں یہ وقتاً فوقتاً مقصد براری کے لئے استعمال کرتے رہتے ہیں۔ حکومت برطانیہ موجودہ جنگ کی وجہ سے جس تشویش و اضطراب میں ہے وہ کس سے پوشیدہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مہاجنی سیاست ایسے موقعہ سے فائدہ نہ اٹھائے تو یہ حربہ اور کونسے وقت کام آئے گا! چنانچہ عین دوران جنگ میں سول نافرمانی کی منظم تحریک اسی انداز سیاست کی کرشمہ سازی تھی۔ ایک طرف منظم سول نافرمانی دوسری طرف سے دائیں اور بائیں۔ اندر اور باہر ہر طرف سے شور و غل۔ نتیجہ یہ کہ یہاں تو یہاں ولایت تک کے اخبارات نے دہائی مچا دی کہ کسی نہ کسی طرح موجودہ تعطل کو توڑ کر ملک کی

مخالفت اور انضمام حکومت میں ہندوستانیوں کا تعاون حاصل کرنا چاہیے۔ اس شور و غل کا نتیجہ تھا کہ حکومت کو تمام ستیہ گرہی قیدیوں
کو قبل از وقت رہا کر دینا پڑا۔ انھوں نے رہا ہو کر ہار وطن میں جھگڑا کیا اور پھر حکومت پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ جنگ کے بعد
ہندوستان میں اکثریت کے ہندو راج کا وعدہ دے دیا جائے تو ہم حکومت کے ساتھ تعاون کریں گے ادھر یہ ریزولیوشن
پاس ہوا۔ ادھر چاروں طرف سے پھر وہی کائیں کائیں شروع ہو گئی۔ انتہا پسند۔ اعتدال پسند۔ جانب دار۔ غیر جانب دار۔ کانگرسی
ہندو مہا سبھائی۔ یہ وہ مختلف آوازیں لیکن مطمح نگاہ ایک۔ گویا مختلف سازوں کا آرکسٹرا تھا جو کرسمس کی تقریب سعید پر مختلف
نشر گاہوں سے پنچم کے سروں میں بجنا شروع ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ ایک تو جنگ کی وجہ سے اعصابی پریشانی اس پر اس قدر بلا کا
شور۔ اچھا بھلا انسان بوکھلا اٹھتا ہے۔ انگلستان کا پریس۔ مختلف ارباب فکر و نظر۔ دار العوام کے اراکین حتیٰ کہ حکومت کے بعض حکام
سب اس بلند آہنگی سے متاثر ہونے لگے۔ اس ہنگامۂ شور و نشور میں بچارا مسلمان الگ کھڑا دیکھ رہا تھا کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
حالات کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے والوں کے دل دھڑک رہے تھے کہ یا اللہ اگر اس تشویش و پریشانی میں حکومت برطانیہ
اس شور و غوغا سے متاثر ہو گئی تو ہندی مسلمانوں کی غلامی کی دستاویز ہندوؤں کے ہاتھ میں دے دی جائے گی۔ اس تمام نقار خانہ میں
لے دے کے ایک نحیف و نزار طوطی کی آواز تھی جو اپنی پوری قوت و شدت سے پکار پکار کر حکومت برطانیہ کو اس کا وہ وعدہ
یاد دلا رہی تھی جو اس نے مسلمانوں سے کر رکھا ہے کہ ہندوستان کے مستقبل کا دستور اساسی مسلمانوں کے مشورہ اور تصویب کے
بغیر مرتب نہیں کیا جائے گا۔ یہ آواز لاکھ حق و عدل کی آواز سہی لیکن تھی تو بہرحال نقار خانہ میں طوطی ہی کی آواز۔ تجسس و شورش
نگاہیں اٹھا اٹھا کر دیکھ رہی تھیں کہ اس مردِ حق گو کا کوئی اور ہمنوا بھی کہیں سے پیدا ہوتا ہے! گوشِ حقیقت آشنا ہمہ تن اشتیاق تھے
کہ کسی سمت سے اور بھی ایسی آواز اٹھتی ہے! خاسر و ناکام نگاہیں بے بس ہو کر کاشانۂ چشم میں حسرت بن کر لوٹ آتی تھیں۔ شوقِ
سماعت پژمردہ ہو کر خلوت کدۂ گوش میں سر بجیب بیٹھ جاتا تھا۔ آواز اٹھتی تو کدھر سے اٹھتی۔ ہمنوا پیدا ہوتا تو کہاں سے پیدا ہوتا
پنجاب روزِ اول سے آزمایا ہوا۔ وہاں کے ارباب ہمم کی تگ و تاز اور سعی و عمل کو ان کے طرہ ہائے امتیاز کی فرازی سے فرصت ملے تو
کسی اور طرف توجہ دے سکیں۔ باقی رہا بنگال۔ سو وہ بازیچۂ اطفال بنا ہوا۔ آوازۂ حق کدھر سے اٹھتا؟ مسکیں و گم ماندہ دریں کشمکش اند

لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جہاں سے زیادہ ہولناک مایوسی ہو وہیں سے امید کی کرن ضیا بار ہو جاتی ہے
خزاں میں جو شاخ سب سے پہلے اپنے پتوں سے محروم ہو کر ٹھنڈ ہو جائے اسی میں سب سے پہلے زندگی کے آثار نمودار ہونے
لگتے ہیں اور اسی کو تند کار فطرت نے سب سے پہلے دلہن بناتے ہیں۔ اس دور کشمکش میں پنجاب سب سے زیادہ افسوسناک مایوسیوں کا
[illegible] بن رہا ہے اور مقام مسرت ہے کہ یہ آوازۂ حق سرزمین پنجاب ہی کے ایک سرخیل کی زبان سے بلند ہوا اور
وہ بھی کس شان سے! آپ حیران ہوں گے کہ قصر حکومت کی ان بلندیوں سے جہاں پہنچ کر بالعموم ہوتا یہ ہے کہ [illegible] جاتا ہے

کا نظارہ یہ ہے منصوب حق و صداقت کی آواز بلند کرنے میں گلو گیر ہوجاتا ہے اور یاروا داری کا غلط مفہوم ہے بلکہ جہاں تک کا تعلق کر دیتا ہے نتیجہ یہ کہ جن سے قوم کی بڑی بڑی توقعات وابستہ ہوتی ہیں۔ مقاربین سرکار کی شعبدہ بازی سے متاع حق کو اٹھا دینے کی ایک ہی نگاہ میں پیچ ڈالتے ہیں۔ ایسے مقام سے حق و انصاف کی بلند آواز کا اٹھنا۔ یقیناً سید رفیق کی کرم گستری ہے جسے وہ ...

ایک دفعہ پھر اس منظر کو سامنے لائیے کہ برادران وطن کے ہر طبقہ کی طرف سے ایک ہنگامہ بپا کیا جا رہا ہے کہ حکومت برطانیہ کو مجبور کر دیا جائے کہ وہ اعلان کرے کہ جنگ کے بعد ہندوستان میں اکثریت کی (ہندو) حکومت قائم کر دی جائے گی جس کا دستور اساسی تمام ہندوستان کی مشترکہ نمائندہ جماعت (یعنی ہندوؤں) کے ہاتھوں تشکیل ہوگا اس ہنگامہ سے حکومت برطانیہ کے ارباب بست وکشاد کا متاثر ہو جانا کچھ بعید نہ تھا دہ آمخالیکہ انگلستان کا پریس بھی اپنی پریشانیوں کے باعث اس ہنگامہ کا ہم نوا ہوئے جا رہا تھا ایسے وقت میں نہایت ضروری تھا کہ ارباب حکومت پر واضح کر دیا جائے کہ ہندوستان میں کوئی ایسا آئین و دستور کامیاب نہیں ہو سکتا جو صرف کسی ایک قوم کی مرضی کے مطابق وضع کیا جائے۔ اس کے لئے ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کی مشاورت اور تصویب نہایت ضروری ہے عین وقت پر۔ جب کہ چاروں طرف سے یہ ہنگامہ اپنے پورے زوروں پر تھا۔ ایوان حکومت کے ایک رکن رشید کی طرف سے اس کا اعلان ہوا اور نہایت بچے تلے لیکن بالکل واضح اور غیر مبہم الفاظ میں اعلان ہوا۔ انہوں نے کہا:۔

"اگر ہندوستان میں ایسے مدبرین موجود ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے تعاون اور رضامندی کے بغیر ہندو اپنے مقاصد حاصل کر لیں گے۔ یا ہندوؤں کی مدد اور رضامندی کے بغیر مسلمان اپنا مقصود پا لیں گے۔ تو وہ غلطی کر رہے ہیں۔ فرض کر لیجئے کہ انگریز کانگرس کے ساتھ سمجھوتہ کر لیں اور انہیں ان کے مطالبات دے دیں۔ تو اس صورت میں ہندوستان کے مسلمان مقابلے کے لئے کھڑے ہو جائیں گے اور ملک میں ایک سخت خلفشار پیدا ہو جائے گا۔ کیا کانگرس کا خیال ہے کہ اس صورت میں وہ ہندوستانی فوج کی مدد استعمال کرے گی کہ وہ آگر مسلمانوں کو گولیوں کا نشانہ بنا دیں اور انہیں بے دست و پا کر کے یوں ملک میں واحد حکومت قائم کریں؟ اگر ایسا ہی کیا جائے گا تو کہیے کہ یہ حکومت جو قوت کے بل بوتے پر قائم کی جائے گی۔ موجودہ حکومت سے کس طرح مختلف ہوگی جس کے متعلق کانگرس کا الزام یہ ہے کہ وہ قوت کے بھروسہ پر قائم ہے۔ یہی دلیل اس صورت میں بھی منطبق ہوگی اگر حکومت برطانیہ مسلمانوں کے سامنے جھک کر ان کے مطالبات منظور کرے۔ ایسی شکل تمام ہندوؤں کو حکومت برطانیہ کے خلاف کھلی بغاوت پر آمادہ کر دے گی! اس وقت بھی ملک کا امن قائم نہیں رہ سکے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ حکومت برطانیہ کا کسی ایک جماعت کی طرف دار ہو جانا بڑے عظیم الشان تک

کے لئے تباہی اور بربادی کا موجب ہو جائے گا جس قدر جلد یہ دونوں جماعتیں اپنے اپنے دل سے اس وہم باطل کو نکال دیں کہ وہ از خود تمام کے تمام ملک پر حکومت کر سکتی ہیں اسی قدر یہ چیز ہمارے مستقبل کے لئے مفید ہوگی۔

اندریں حالات نیشنل کانگرس کی یہ کوشش کہ مسلم لیگ کے جذبات کے علی الرغم۔ بالا ہی بالا مسلم عوام سے روابط بڑھائے جائیں مسلم عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے اور اس طرح مسلم سیاست کو کانگرس سے دور سے دور لیجانے کے سوا کوئی نتیجہ پیدا نہ کر سکے گی۔ ان کی یہ کوشش کہ ہندوستان اور باہر کی دنیا پر یہ ثابت کر دیا جائے کہ کانگرس ہندوستان کے مسلمانوں کی بھی نمایندہ جماعت ہے۔ صرف ایک ہی نتیجہ پیدا کر سکتی ہے یعنی مسلمانوں کے دل میں (ہندوؤں کی طرف سے) بدگمانی کے تلخ جذبات۔ اور مسلم لیگ کی قوت میں اضافہ۔ میں ان حقائق کو کھلے کھلے الفاظ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں ہندوستان کے اتحاد و اتفاق کا دل سے خواہاں ہوں۔ اور اپنی (یعنی ہندوستانیوں کی) موجودہ کمزور سیاسی پوزیشن کو محسوس کرتا ہوں۔ جب تک ہم حقایق کا مقابلہ نہیں کریں گے اور یوں ہی ایک دوسرے کے سر الزام تھوپنے سے مجتنب نہیں رہیں گے۔ ہم کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکیں گے۔

میں (جوں جوں حالات پر غور کر رہا ہوں) بار بار اسی نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ اس ملک کی دو بڑی قوموں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جب بھی امن قائم ہوگا ان کی عاملہ جماعتوں کے ذریعے سے قائم ہوگا.....

.... (میرے خیال میں) اب وقت آپہنچا ہے کہ ہم کھلے کھلے الفاظ میں باتیں کریں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کبھی امن نہیں قائم ہو سکتا جب تک ان کے لیڈر ایک دوسرے کے سامنے اپنے دلوں کو کھول کر نہ رکھدیں یونہی گول مول انداز سے ٹامک ٹوئیاں مارنے سے دنیا میں کبھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔"

یہ تو تھا ہندوؤں اور مسلمانوں سے مشترکہ خطاب۔ اب چند الفاظ میں خود مسلمانوں سے متعلق بھی سن لیجئے۔ فرمایا۔

"میں اس مجمع کے دل پر اس ملک میں اتحاد و اتفاق کی اہمیت کو نقش کر دینا چاہتا ہوں۔ یہ اتحاد سب سے پہلے ہر ایک جماعت کے اندر الگ الگ بھی ضروری ہے۔ مسلمانوں کے اپنے اندر بھی اتحاد لازمی ہے تاکہ اس اتحاد کے ذریعے سے انھیں اس ملک میں باعزت پوزیشن حاصل ہو سکے اس قسم کی وحدت اور ہم آہنگی حاصل کرنے کے لئے ہمیں ایسے لیڈروں کی ضرورت ہے جو خودغرض نہ ہوں۔ جس وقت ہم میں اس قسم کی وحدت پیدا ہو جائے گی کانگرس کی نگاہوں میں خود بخود ہماری عزت پیدا ہو جائے گی اور جس وقت کانگرسی لیڈروں کے دل میں مسلم لیگ کی اس قسم کی عزت پیدا ہوگی اس وقت اس ملک میں مستقل امن کی بنیاد رکھی جا سکے گی"
(اسٹیٹسمین ۔۔۔)

مذکورہ اقتباسات آپ نے ملاحظہ فرمائے لیکن آپ کو معلوم ہے کہ مقرر کون تھے؟ مقرر تھے جناب وائسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل کے ممبر جناب سر فیروز خان نون! ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

اظہار حقیقت اور کس قدر واضح اور غیر مبہم الفاظ میں۔ بایں ہمہ کہیں لب ولہجہ میں تلخی نہیں۔ درشتی نہیں اور دوسری طرف رواداری کا غلط مفہوم کہیں حق گوئی میں عناں گیر نہیں۔ قدم جادۂ اعتدال پر ہے اور ذمہ داری کا احساس ساتھ ہے عین موقعہ پر ٹھیک ٹھیک بات حق و انصاف کے ساتھ کہہ دینا۔ یہی مسلمان کی شان ہے۔

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق　　　یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

ملت اسلامیہ کے فرزند جلیل سر فیروز خان نون! آپ قوم کی طرف سے مستحق ہزار تبریک و تہنیت ہیں کہ آپ نے قوم کے جذبات کی صحیح صحیح ترجمانی کر دی۔ ہمیں خوشی ہے کہ آپ کی اس حق گوئی کی بنا پر اب پنجاب کا مسلمان بھی دنیا کے سامنے اپنی نگاہوں کو اونچا کر سکے گا خدا آپ کے اس جوہر جرأت و بسالت میں پختگی اور مسلک حق گوئی و بیباکی میں استقامت عطا فرمائے۔

ملت اسلامیہ کو آپ کی ذات سے بہت سی توقعات وابستہ ہو گئی ہیں یورپ کے بت خانہ آذر سے ایمان براہیمی عطا ہو جانا یہ صرف اللہ کی دین ہے۔

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

ب جناب جناح بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں

(۲)

پاکستان کے متعلق ہم اپنی سابقہ اشاعت میں سکریٹری صاحب آل انڈیا مسلم لیگ کی تصریحات درج کر چکے ہیں جن سے حقیقت واضح ہو گئی تھی کہ ہندوستان میں ایک مرکز کے نظریہ کی پاکستان کی اسکیم میں کوئی گنجائش نہیں۔ اس کے بعد جناب جناح صدر مسلم لیگ نے اپنے ایک بیان میں اس حقیقت کو واضح تر کر دیا ہے کانگرس کے بردولی والے ریزولیشن پر تبصرہ کرتے ہوئے آپ ارشاد فرماتے ہیں۔

"ہندی مسلمان اپنی آزادی اور استحکام کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں لیکن کانگرس اور دوسری ہندو جماعتیں تیز رفتاری سے اس کوشش میں مصروف ہیں کہ تمام ہندوستان میں ایک مرکزی حکومت قائم کر کے ہندو [illegible]

یہاں مسلمانوں کی حیثیت اقلیت کی کر دی جائے اور اس طرح ان پر اپنا تسلط واستبداد مستحکم کر دیا جائے یعنی یہ کہ ان حصوں میں بھی جہاں مسلمان ٹھوس اکثریت رکھتے ہیں اور یوں ان اہم قوتوں کے مالک ہوتے ہیں جو لازمی طور پر مرکزی حکومت کی تحویل میں ہونگی۔ مثلاً دفاع۔ رسل ورسائل۔ بحری چونگی۔ مالیات اور دیگر انتظامی امور۔ مسلمانوں کی اکثریت کے علاقوں میں ان کے اندرونی معاملات میں بھی دخل اندازی کرتے رہیں"۔ (اسٹیٹسمین ۴ جولائی)

یعنی جناب جناح نے واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ تمام ہندوستان کے ایک مرکز کا نظریہ پاکستان کی اسکیم کے بالکل منافی ہے۔ پاکستان ایک کامل وکلی آزاد حکومت ہوگی جس کا مرکز بھی اپنا ہوگا اور اس مرکز کے ماتحت دفاع۔ رسل ورسائل امور خارجہ۔ مالیات وغیرہ سب اپنے ہوں گے۔ جس طرح آج کل مثلاً افغانستان کے ہیں۔

ایک آزاد اسلامی حکومت جس میں قانون قرآن کا نافذ ہوگا۔ یہ ہے **پاکستان**۔ وہ پاکستان جس کا تصور حکیم الامت علیہ الرحمۃ نے دیا اور جسے عملی طور پر متشکل کرنے کی سعادت جناب جناح کے حصے میں آئی۔ ولو کرہ المشرکون۔

یہ ہے وہ پاکستان جس کی مخالفت قومیت پرست علمائے کرام کے طرف ہوتی ہے جن کے سرخیل حضرت امام الہند صاحب ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(۳)

جناب جناح کی عظمت کا اعتراف آپ مسٹر آرتھر مور کی زبان سے اس سے پیشتر سن چکے ہیں اب ان کی زبانی سنئے جو اپنوں کے علاوہ کسی اور کی عظمت کا اعتراف جانتے ہی نہیں۔ مسٹر راجہ گوپال اچاریہ اپنی حال ہی کی ایک تقریر میں فرماتے ہیں۔

"مسٹر چرچل بھیا کے ریت کے تودوں میں اپنا سر چھپا کر (شتر مرغ کی طرح) اپنے آپ کو فریب دے لیں تو اور بات ہے ورنہ وہ ان حقایق سے کیسے انکار کر سکتے ہیں جو ان کے سامنے موجود ہیں۔ حکومت اور عوام اور ملک کی ان اہم سیاسی جماعتوں کے درمیان کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا جن کے صدر مہاتما گاندھی اور قائداعظم جناح جیسی درخشندہ ہستیاں ہیں۔ یہ ہستیاں کچھ معمولی درجے کی نہیں ہیں۔ دونوں برابر کی شہرت کے مالک ہیں اور ملک میں دونوں کی مقبولیت اوج کمال تک پہنچی ہوئی ہے۔

یہاں ہمارے سامنے دو قوت اور شہرت کی مالک سیاسی جماعتیں (یعنی کانگرس اور لیگ) موجود ہیں اور دونوں حکومت سے برسرپیکار ہیں"۔ (ہندوستان ٹائمز ۲۳ جولائی)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ حقیقت کس طرح اپنے اعتراف پر مجبور کر دیتی ہے۔ مسٹر راجہ گوپال اچاریہ کے نزدیک گاندھی جی اور جناب جناح یکساں عظمت کے مالک اور یکساں تعریف کے سزاوار!

انقلابات ہیں زمانے کے؟

اور پھر کانگریس اور لیگ ( ) ملک کی اہم ترین سیاسی ادارے! وہی لیگ جو کل تک ہندوؤں کی نگاہ میں گنتی شمار میں بھی نہ تھی ان ہندوؤں کے نزدیک جنہیں ملک میں دو ہی پارٹیاں نظر آتی تھیں، گورنمنٹ اور کانگریس۔

یہ سب کس کا تصدق ہے! توفیق ایزدی جناب جناح کے خلوص، ایثار اور حسن تدبر کا۔ حق کی آواز کا۔ مسلک کی صداقت کا!

اور پھر دیکھئے ہندوؤں کی طرف سے گاندھی جی اور مسلمانوں کی طرف سے جناب جناح آمنے سامنے لائے جاتے ہیں پوچھئے کہ جناب ابو الکلام صاحب آزاد کہاں ہیں؟ اور ان کا شمار کن میں ہے! اپنوں سے کٹ چکے اور غیروں سے ملے۔ نہ ان کے ہاں عزت نہ اُن کے ہاں توقیر۔ ایں سو رانده و آں سو درمانده خسر الدنیا والآخرہ ذالک خسران المبین۔

ابھی ابھی آپ جناب جناح کی عظمت اور مسلم لیگ کی اہمیت کا اعتراف مسٹر راجہ گوپال اچاریہ کی زبان سے سن چکے ہیں ان میں ذیل کے الفاظ کا اور اضافہ کر لیجئے جو مسٹر اچاریہ نے ۲۲ جنوری کو مدراس کی ایک تقریر کے دوران میں استعمال کئے انہوں نے کہا۔

"کسی قوم کے لئے ایسی صورت حالات نہایت بری ہوتی ہے کہ اس کی گورنمنٹ ایسی ہو جس سے قوم کی دو درخشندہ جماعتیں عدم تعاون کر رہی ہوں وہ جماعتیں جن میں سے ایک کا دعویٰ ہے کہ وہ مسلمانوں کے بہترین عنصر کی نمائندہ ہے اور دوسری وہ جس کا دعویٰ ہے کہ وہ ملک کے غیر فرقہ وارانہ اور قومی عنصر کی نمائندہ ہے۔ اگر یہ دو سیاسی ادارے جن کی راہ نمائی مہاتما گاندھی اور مسٹر جناح جیسے مشہور عالم راہنما کر رہے ہیں کسی وجہ سے حکومت سے تعاون نہیں کر رہے تو حکومت کے لئے اتنا کہدینا کافی نہیں کہ اس ملک کے لوگ اس کے ساتھ ہیں۔" (ہندوستان ٹائمز ۲۵ جنوری)

کانگرس کا دعویٰ نمائندگی کیا ہے! اسے چھوڑیئے۔ دیکھئے یہ کہ خود مسٹر اچاریہ جیسے متشدد کانگریسی کو بالآخر اعتراف کرنا پڑا کہ مسلم لیگ مسلمانوں کے بہترین عنصر کی نمائندہ جماعت ہے۔ اس چیز کا اگر کانگریسی ہندو حضرات پہلے دن سے اعتراف کر لیتے تو اتنا عرصہ ملک میں یہ کشمکش کیوں رہتی! خدا کرے کہ اب یہ حضرت اس حقیقت ثابتہ کو بھی مان لیں کہ ہندو مسلم مسئلہ کا واحد حل صرف پاکستان ہے جس دن ہندوؤں نے اس حقیقت کا اعتراف کر لیا۔ اسی دن ملک کی نجات ہو جائے گی۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ جب مسلم لیگ مسلمانوں کے بہترین عنصر کی نمائندہ جماعت ہے تو پھر یہ مسلم نیشنلسٹ حضرات کیا

میں جو اب خود مشرا چار یہ کے الفاظ سے ظاہر ہے! ــــــ ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی۔

(۴)

بالآخر علامہ مشرقی قید و بند کے مصائب سے رہا کر دیئے گئے اور ان ہزاروں قلوب کو جو اس درد سے بیتاب اور ان لاکھوں آنکھوں کو جو اس غم سے پرنم تھیں کچھ سکون و اطمینان ہوا۔ ظاہر ہے کہ حکومت کے جن فیصلوں سے اتنے مضطرب قلوب کو تسکین حاصل ہو جائے وہ بہر حال قابلِ ستائش ہوتے ہیں۔ خدا کرے کہ اب وہ پابندیاں اور شرائط بھی اسی طرح رفع کر دی جائیں جو اس رہائی سے منوز وابستہ ہیں۔ علامہ صاحب کے متعلق ہمارے جذبات تو قیر و تعظیم کسی ثبوت کے محتاج نہیں ان کے غم و الم کے متعلق ہمارے نالۂ نیم شبی اور آہ سحر گاہی پر آسمان کے تارے اور زمین کے ذرے گواہ ہیں۔

تحریک خاکساران کے مستقبل کے متعلق علامہ صاحب نے ارباب حل وعقد سے مشاورت کے بعد کسی فیصلے پر پہنچنے کا اعلان فرمایا ہے ہر چند اس باب میں ہماری کوئی گزارش دخل در معقولات قرار دی جاسکتی ہے لیکن ان قلبی احساسات کی بنا پر جن کے شواہد طلوعِ اسلام کے صفحات پر آپ کی نگاہوں سے گذر چکے ہیں ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ہم جو کچھ محسوس کرتے ہیں اس کا اظہار کر دیا جائے۔ آپکو یاد ہوگا کہ ہم پہلے دن سے ہی متمنی ہیں کہ جناب جناح اور جناب علامہ کسی طرح دوش بدوش کھڑے ہو جائیں تو یہ قران السعدین طالع امت کے لئے مطلع انوار ہو جائے۔ جب مقصد ایک ہے یعنی اسلام کی سرفرازی (جسکا فطری نتیجہ دنیا کے لئے امن و سلامتی کا پیغام اور خدمتِ خلق کی نوید ہے) تو پھر علیحدگی کیا ضرور ہے۔ اللہ کی میزان میں تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑیگا کہ تمہارا نام خاکسار تھا یا مسلم لیگ کے سپاہی۔ وہاں تو دل کی نیتیں اور حسن عمل ہی تو لا جائیگا۔ وائسرائے اور کمانڈر انچیف ایک ہی کشتی کے دو ملاح ہیں فرائض جداگانہ۔ نصب العین ایک اگر خاکسار جناب علامہ کی قیادت میں مسلم لیگ کا عسکری شعبہ بن جائیں تو آج ہی یہ دونوں قوتیں مل کر ملت اسلامیہ کے منتشر ذروں کو بنیان مرصوص (فولادی دیوار) میں تبدیل کر سکتی ہیں کہ حوادث زمانہ کی امواج آئیں اور اپنا سر چھوڑ کر واپس ہو جائیں یہی وہ نکتہ ہے جس میں خاکساروں کی بہبود مسلم لیگ کی تقویت اور ملتِ اسلامیہ کے مقدرات کے ستاروں کی تابندگی کا راز پنہاں ہے۔ خدا کرے کہ ہماری اس گزارش کو صرف ہمارے ہی دل کی آواز نہیں بلکہ ملت اسلامیہ کی اکثریت کی ترجمان پر درخور اعتنا سمجھ لیا جائے اس کے ساتھ ہی ہم جناب علامہ سے بصد منت التجا کریں گے کہ وہ کسی نہ کسی طرح تذکرہ کی باقی جلدوں کی اشاعت کا انتظام فرمادیں تاکہ آنے والی نسلوں میں سے اگر کوئی جماعت قرآن پر عمل کرنے کی خواہش کرے تو جناب علامہ کے تعمق قرآنی کا حاصل اس کے سامنے ہو۔ قومیں اسی طرح سے آگے بڑھا کرتی ہیں۔ بقیہ بر صفحہ ۹۵

رازِ حیات

اسمعوا و اطیعوا ۶۴ / ۱۶

نظامِ کائنات پر غائرانہ نگاہ ڈالئے اور سوچئے کہ یہ محیر العقول سلسلۂ نظم و نسق اور یہ عظیم القدر کارگہ کون و مکان کس تحیر انگیز اصول پہ قائم اور کونسی عدیم النظیر قوت پہ اس حسن و خوبی سے چل رہا ہے۔ آپ غور کیجئے اور بار بار غور کیجئے ہر بار آپ اس حتمی اور قطعی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ پہنائے زمین و آسمان کے اس فقید المثال نظم و نسق اور فضائے ناپیدا کنار کے اس ہوشربا ربط و ضبط کا راز ایک لفظ کے اندر ہے اور وہ لفظ ہے **اطاعت**۔ زمین کا گراں بار کرہ فضا میں معلق و سرگرداں ہے تو اسی کے زور پر۔ زمین سے لاکھوں گنا بڑا سورج اپنے پورے نظام کو سنبھالے ہوئے ہے تو اسی کی بنا پر۔ یہ بڑے بڑے فلک بوس پہاڑ اسی کی قوت کے سہارے کھڑے ہیں۔ یہ حدود فراموش سمندر اسی کے ذریعے مٹی کے ساحلوں میں گھرا بند پڑا ہے۔ ستاروں کی انجمن میں جمال و زینت ہے تو اس سے اور پھولوں کی محفل میں ہجومِ رنگ و تعطر ہے تو اسی کی وجہ سے چاند کی حسین و جمیل کشتی نیلگوں آسمان کی رو دِ نیلگوں میں بسطِ نور بن کر تیرتی پھرتی ہے تو اسی قوت سے اور کہکشاں کی سکوت افزا مرمریں موج فلک الافلاک کے بحرِ عنبر میں آسودۂ خواب ہے۔ تو اسی کے اثر سے۔ یہی وہ جنتر ہے جس سے کڑکتی ہوئی بجلیوں کی ناگن دہوئیں کی جھیل پر لہراتی پھرتی ہے اور یہی وہ منتر ہے جس سے مست ہاتھیوں کے سے بادل پانی کی پکھالیں اپنی پشت پر لادے جکڑے بند ہے ادھر ادھر مارے مارے پھرتے ہیں اور کبھی سرتابی نہیں کرتے۔ ذرا سوچئے کہ اگر ایک دن سورج اطاعت سے سرکشی اختیار کرلے تو اس کائنات کا کیا حشر ہو۔ اگر زمین ایک ثانیہ کے لئے نظامِ متابعت سے سرتابی اختیار کرجائے تو جھولا جھولنے والوں کا انجام کیا ہو! اگر ہوا پھیپھڑوں میں جانے سے انکار کردے۔ اگر پانی نشیب کے بجائے فراز کی طرف بہنا شروع کردے۔ اگر زمین ان تمام دانوں کو دبا کر بیٹھ جائے جو اس میں بیج کے لئے ڈالے جاتے ہیں اگر آگ اپنی حرارت دوسرے منتقل کرنا بند کردے۔ غرضیکہ اس وسیع و عریض کائنات کا ایک ذرہ بھی اطاعت سے منہ موڑ بیٹھے تو یہ تمام نظم و نسق درہم برہم ہوجائے۔ اس لئے کہ یہ سارا نظام صرف ایک بنیاد پر قائم ہے اور وہ چٹان کی سی محکم و استوار بنیاد ہے **اطاعت** کُلٌّ لَّهٗ قَانِتُوْنَ ۝ (کائنات کی ہر شے قانونِ خداوندی کے سامنے سر جھکائے کھڑی ہے)

شجر و حجر کی دنیا کو چھوڑ کر عالم انسانیت کی طرف آئیے۔ انسان کے جسم کی حرارت تھرمامیٹر (مقیاس الحرارت) سے ناپی جاسکتی ہے۔ اس کے قلب کی حرکت کا اندازہ نبض کے تموج سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے خون کی صحت چہرے کی شگفتگی اور بشاشت سے بھی پہچانی جاسکتی ہے۔ اس کی قوت کا اندازہ اس کے دست و بازو کی گرفت اور ساخت سے کیا جاسکتا ہے۔ اس کی صحت کی عام حالت اس کی حرکات و سکنات سے قیاس کی جاسکتی ہے لیکن اس کے جوہر انسانیت کی پرکھ صرف ایک کسوٹی سے کی جاسکتی ہے اور وہ یہ کہ اس میں **اطاعت** کا کتنا مادہ ہے۔

پھر افراد سے کہیں بڑھ کر یہ کسوٹی اقوام کی زندگی ناپنے کا پیمانہ ہے۔ کسی قوم میں جس قدر اطاعت کا جذبہ بڑھتا جائے گا اس قدر اس میں **زندگی** پیدا ہوتی چلی جائے گی۔ آپ تاریخ کے اوراق کو دیکھئے۔ ہر ورق پر یہی حقیقت نمایاں نظر آئے گی۔ قوموں کے احوال و ظروف پر نگاہ ڈالئے ہر مقام پر یہی اصول کار فرما نظر آئے گا۔ زندہ وہی قوم رہتی ہے جس میں **اطاعت** کا جذبہ ہو۔ حوادثِ زمانہ اور ناسازگارئ حالات کا مقابلہ وہی کرسکتی ہے جس کے افراد حکم اور فیصلہ کے سامنے جھکنا جانتے ہوں۔ عزت اور وقار۔ جاہ و حشمت۔ قوت و صولت۔ شان و شوکت رعب اور دبدبہ۔ حکومت اور سلطنت سب اس قوم کا حصہ ہیں جو اطاعت شعار ہے۔ جب تک کسی قوم کے افراد اپنے آپ پر جبر کرنا نہیں سیکھتے وہ قوم صاحب اختیار نہیں ہوسکتی۔ جس قدر **رکوع و سجود** میں عجز و نیاز اور خلوص و خشوع ہوگا۔ اسی قدر **قیام** میں سرفرازی و سربلندی کی شان پیدا ہوگی اور قوموں کے ستارۂ اقبال کی درخشندگی ان سجدوں کے نشان سے ہے جو ان کے افراد کے ماتھوں پر جگمگ جگمگ کر رہے ہیں۔ **سیماھم فی وجوھم** من اثر السجود۔

پھر ان تمام نظائر و آثار سے نگاہ ہٹا کر اس سرچشمۂ علم و حقیقت کو دیکھیے جو دنیا کی ہر حقیقت کے لئے مصداق اور کائنات کے ہر اصول کے لئے معیار ہے۔ اللہ کی کتاب مبین کا ہر صفحہ اسی زندہ حقیقت کا شاہد ہے۔ سارے قرآن کریم کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ یہی ہے بلکہ اس تمام سلسلہ رشد و ہدایت کی غرض و غایت یہی ہے کہ قوانین خداوندی کی **اطاعت** کی جائے۔ قرآن کریم کی تعلیم کا نہج کیا ہے؟ کچھ امور ہیں جن پر عمل پیرا ہونے کا ارشاد ہے۔ کچھ ایسے ہیں کہ جن سے احتراز و اجتناب کا حکم ہے۔ باقی مقامات پر دلائل و براہین اور نظائر و بصائر سے ان اوامر و نواہی کے فطری نتائج و عواقب کو بطور حقیقت ثابتہ سامنے لایا گیا ہے۔ ان اوامر و نواہی میں کسی کو یہ اختیار نہیں کہ جس پر جی چاہے

عمل پیرا ہو اور جسے جی چاہے چھوڑ دے۔ یہ احکام اطاعت کے لئے ہیں بلا چون وچرا اطاعت بلا جبر و اکراہ اطاعت۔

فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما ۴

پس دیکھو تمہارا رب اس پر شاہد ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک ایسا نہ کریں کہ اپنے تمام جھگڑوں میں تمہیں حاکم نہ بنائیں۔ اور پھر (صرف اتنا ہی نہیں بلکہ) ان کے دلوں کی حالت بھی ایسی ہو جائے کہ جو کچھ تم فیصلہ کر دو اس کے خلاف کسی طرح کی دل گرفتگی محسوس نہ کریں اور پھر فیصلہ کے سامنے (اسر تسلیم خم کر دیں۔

قرآن کریم کو شروع سے آخر تک دیکھئے ہر مقام پر مومن کی چلتی ہوئی نشانی یہی نظر آئے گی کہ وہ حکم خداوندی کو سنتا ہے اور سننے کے بعد اس کی اطاعت کرتا ہے۔ سمع اور طاعت ہی ایمان ہے۔ یہی عمل ہے۔ سننے اور اطاعت کرنے میں کوئی وقفہ نہیں۔ کوئی تامل نہیں۔ کچھ سوچ بچار نہیں کسی قسم کی تنقید و تنقیح نہیں۔ ماتھے پر شکن نہیں۔ دل میں کبیدگی نہیں ہنسی خوشی۔ بطیب خاطر۔ ہر حکم کی تعمیل ہے۔ ہر آواز پر لبیک ہے۔ راستہ میں نہ جلب منفعت کی کوئی گھاٹی قدم میں لغزش پیدا کرتی ہے نہ دفع مضرت کی کوئی جھاڑی دامن کو الجھاتی ہے۔ بیوی کی موانست اولاد کی محبت۔ جاہ و حشمت کی ہوس۔ غرضیکہ دنیا کا بڑے سے بڑا لالچ تعمیل احکام میں عناں گیر نہیں ہو سکتا نہ کسی قسم کا خوف و ہراس راستہ میں حائل ہو سکتا ہے۔

قل ان کان اباؤکم و ابناءکم و اخوانکم و ازواجکم و عشیرتکم و اموال اقترفتموھا و تجارۃ تخشون کسادھا و مساکن ترضونھا احب الیکم من اللہ و رسولہ و جھاد فی سبیلہ فتربصوا حتی یاتی اللہ بامرہ واللہ لا یھدی القوم الفسقین ۹/۲۴

(اے رسول ان سے کہدو) کہ اگر ایسا ہے کہ تمہارے باپ۔ تمہارے بیٹے۔ تمہارے بھائی۔ تمہاری بیویاں۔ تمہاری برادری۔ تمہارا مال جو تم نے کمایا ہے۔ تمہاری تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے ڈرتے ہو۔ تمہارے رہنے کے مکانات جو تمہیں اس قدر پسند ہیں ان میں سے کوئی چیز بھی تمہیں اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو کلمۂ حق تمہارا محتاج نہیں (ا) انتظار کرو۔ یہاں تک کہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے وہ تمہارے سامنے لے آئے۔ اور (اللہ کا مقررہ قانون ہے کہ وہ) فاسقوں پر (کامیابی کی) راہ نہیں کھولتا۔

اس لئے کہ جو سنتا ہے اور سننے کے بعد کسی قسم کا کوئی خیال اطاعت سے مانع ہو جاتا ہے۔ تو اس کا سننا

درحقیقت سننا نہیں۔ سمع (سننا) اس کا ہے جو اس کو اطاعت میں تبدیل کر دے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْہُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ۝

وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَھُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ۝ ۸ / ۲۱-۲۰

مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور اس سے روگردانی نہ کرو درآنحالیکہ تم اس کا حکم سن رہے ہو۔

اور دیکھو ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے (زبان سے) کہہ دیا کہ ہم نے سن لیا ہے۔ لیکن درحقیقت انھوں نے سنا نہیں۔

جو سننا عمل میں منتقل نہیں ہوتا۔ وہ سننا بیکار ہے۔ سننے کے بعد تو طاعۃ و قول معروف (۴۷ / ۲۱) اطاعت اور جانی پہچانی ہوئی بات نہایت عمدہ بات۔ کوئی حیل و حجت نہیں۔ کوئی عذر معذرت نہیں قیل و قال نہیں۔ لیت و لعل نہیں۔ سنا۔ اور کر دکھایا۔ حکم سامنے آیا اور اس کے سامنے جھک گئے۔ اس میں اپنا (انفرادی) فائدہ نظر آئے یا نقصان مشکل کا سامنا ہو یا آسانی کا۔ بہرحال اطاعت اور بہرکیف اطاعت۔ یہ نہیں کہ جب تک اطاعت میں اپنا انفرادی فائدہ نظر آئے تعمیل ارشاد ہو جائے اور جب مشکلات و مصائب کا سامنا ہو تو ساتھ چھوڑ کر الگ جا کھڑے ہوں۔

وَاِنَّ مِنْکُمْ لَمَنْ لَّیُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْکُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیَّ اِذْ لَمْ اَکُنْ مَّعَھُمْ شَھِیْدًا۝ وَلَئِنْ اَصَابَکُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰہِ لَیَقُوْلَنَّ کَاَنْ لَّمْ تَکُنْۢ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَہٗ مَوَدَّۃٌ یّٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ مَعَھُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِیْمًا۝ ۴ / ۷۳-۷۲

اور (دیکھو) تم میں کوئی کوئی آدمی ایسا بھی ہے کہ (مشکل کا سامنا ہو تو) وہ ضرور قدم پیچھے ہٹائے۔ اور اگر تم پر کوئی مصیبت آ پڑے تو (خوش ہو اور) کہے کہ خدا نے مجھ پر بڑا احسان کیا کہ ان لوگوں کے ساتھ نہ تھا۔ اور اگر تم پر خدا کا فضل و کرم ہو تو (حسد سے جل مرے اور) پکار اٹھے۔ گویا اس میں اور تم میں دوستی اور محبت کا کوئی رشتہ تھا ہی نہیں۔ کہ اے کاش میں ان لوگوں کے ساتھ ہوتا کہ بہت کچھ کامیابی حاصل کر لیتا۔

ایسی اطاعت کرنے والوں کی اطاعت کس کام کی خواہ یہ قسمیں کھا کھا کر اور قرآن اٹھا اٹھا کر یقین کیوں نہ دلائیں۔ کہ ہم مطیع و فرمانبردار ہیں۔ اطاعت اور فرمانبرداری تو اس کی ہے جو گرم و سرد۔ مساعد و ناساعد۔ ہر حال میں اطاعت شعار ہو۔

ویحلفون باللہ انھم لمنکم و ما ھم منکم ولکنھم قوم یفرقون ۰ لو یجدون ملجأً او مغرٰت او مدخلا لولوا الیہ وھم یجمحون ۰ (۹/۵۶-۵۷)

اور یہ لوگ (قسمیں کھا کھا کر تمہیں) یقین دلاتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں۔ حالانکہ وہ (درحقیقت) تم میں سے نہیں ہیں بلکہ ایک ڈرا سہا ہوا گروہ ہے (ان کی حالت یہ ہے کہ) اگر انھیں پناہ کی کوئی جگہ مل جائے۔ یا کوئی غار یا کوئی اور چھپ بیٹھنے کا سوراخ۔ تو تم دیکھو گے کہ یہ فوراً اس کا رُخ کرلیں گے۔ اور حالت یہ ہوگی کہ گویا رسی تڑا کر بھاگے جا رہے ہیں۔

ڈرا سہا ہوا گروہ اس لئے کہ نہ ان میں اتنی جرأت ہے کہ نتھر کر الگ ہو جائیں اور اطاعت سے روگردانی کرنے کا اعلان کردیں۔ اور نہ ہی اپنے آپ پر اتنا قابو ہے کہ اپنے انفرادی مفاد کو کلی مفاد پر قربان کر کے صدق دل سے ساتھ ہی ہو جائیں۔ یہ اطاعت نہیں سرکشی ہے۔ ایمان نہیں منافقت ہے۔

ویقولون اٰمنا باللہ وبالرسول واطعنا ثم یتولٰی فریق منھم من بعد ذٰلک وما اولٰئک بالمؤمنین ۰ واذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینھم اذا فریق منھم معرضون ۰ (۲۴/۴۷-۴۸)

اور یہ لوگ (زبان سے) اقرار کرتے ہیں کہ ہم اللہ اور رسول پر ایمان لائے اور ہم اطاعت شعار ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک گروہ اس اقرار کے بعد روگردانی کرلیتا ہے۔ یہ لوگ مومن نہیں کہلا سکتے۔

اور جب انھیں خدا اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے کہ وہ ان کے معاملات کا فیصلہ کرے۔ تو ان میں سے ایک فریق اعراض برتتا ہے۔ لیکن اگر (انھیں معلوم ہو کہ) حق کا (فیصلہ) ان کی طرف ہوگا تو وہ بھاگتے ہوئے آئیں گے۔ سر جھکائے ہوئے۔

یہ مومن کا شعار نہیں ہے۔ مومنوں کی تو حالت یہ ہے کہ انما کان قول المؤمنین اذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینھم ان یقولوا سمعنا واطعنا واولٰئک ھم المفلحون ۰ (۲۴/۵۱)

جب انھیں خدا اور رسول کی طرف بلایا جاتا ہے کہ وہ ان کے معاملات کا فیصلہ کرے۔ تو ان کی صدا یہ ہوتی ہے کہ ہم نے سنا اور اس (فیصلہ) کو تسلیم کرلیا۔ یہی لوگ کامیاب ہیں۔

یہ ہے ایمان کی نشانی یہ ہے کامیابی کی دلیل۔ اطاعت کے بغیر فلاح و بہبود کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ ایمان کا مفہوم ہی یہی ہے کہ آپ اپنے تمام معاملات کو اپنے سے بلند قوت کے سپرد کردیں اور پھر اس کے

فیصلوں کو حرفِ آخریں اور قولِ ناطق تسلیم کریں۔

وما کان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضی اللہ ورسولہٗ امراً ان یکون لھم الخیرۃ

من امرھم ومن یعص اللہ ورسولہٗ فقد ضل ضلالاً مبینا ۳۳/۳۶

جب کسی معاملہ میں اللہ اور اس کا رسول فیصلہ کرے تو کسی مومن مرد یا عورت کو اس میں اختیار باقی نہیں رہتا

اور جس کسی نے اللہ اور اس کے رسول کے فیصلہ سے سرتابی اختیار کی تو وہ ایک کھلی ہوئی

گمراہی میں جا پڑا۔

یہ ہے ایک مسلمان کا مسلکِ حیات یہ ہے اس کے ایمان کی نشانی۔ زندگی کی علامت۔ **اطاعت اور مکمل اطاعت**

کتاب اللہ کے ان اصولی احکام کی روشنی میں اس آسمان کے نیچے جس حکومتِ الٰہیہ کا قیام آج سے ساڑھے

تیرہ سو سال پیشتر ہوا۔ اس کی تاریخ کے زریں اوراق کو الٹئے اور دیکھئے کہ کس طرح ایک ایک ورق پر اس رازِ حیات

کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ کہ

لا اسلام الا بجماعۃ ولا جماعۃ الا بامارۃ ولا امارۃ الا بطاعۃ (حضرت عمرؓ)

اسلامی زندگی بغیر جماعت کے ہے نہیں۔ جماعت کی تشکیل بلا امیر کے نہیں۔ اور امارت کا قیام

بغیر اطاعت کے نہیں ہو سکتا۔

قرآن کریم نے یہ کہا تھا کہ۔

من یطع الرسول فقد اطاع اللہ ۴/۸۰

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی

اور اللہ کے رسولؐ نے یہ ارشاد فرما دیا کہ

من یطع الامیر فقد اطاعنی ومن یعص الامیر فقد عصانی (او کما قال رسول اللہؐ)

جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے

میری نافرمانی کی۔

اس حقیقتِ کبریٰ پر ایک مرتبہ پھر غور فرمائیے۔ اللہ کی اطاعت۔ رسولؐ کی اطاعت میں ہے اور رسول کی اطاعت

امیر کی اطاعت میں۔ اس طرح امیر کی اطاعت، خود خدا کی اطاعت ہو جاتی ہے۔ اس اطاعت کے بغیر انفرادی

اعمال کچھ کام نہیں دے سکتے۔ جیسا کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے۔

(انا امرکم بخمس اللہ امرنی بھن الجماعۃ والسمع والطاعۃ والھجرۃ والجھاد فی سبیل اللہ فانہ من خرج من الجماعۃ قید شبر فقد خلع ربقۃ الاسلام من عنقہ۔ قالوا یا رسول اللہ صلعم ان صام وصلی۔ قال وان صلی وصام وزعم انہ مسلم (او کما قال رسول اللہ)

میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا حکم اللہ تعالےٰ نے مجھے دیا ہے۔ جماعت۔ سمع۔ طاعت ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ یقین کرو کہ جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر الگ ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا۔ عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلعم اگرچہ وہ شخص روزے رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو پھر بھی اسلام سے خارج ہو جائے گا) فرمایا۔ ہاں اگرچہ نماز پڑھتا ہو۔ اور روزے رکھتا ہو اور اپنے زعم میں اپنے آپ کو مسلمان بھی سمجھتا ہو۔

انسان جماعت سے الگ اسی وقت ہوتا ہے جب امیر کی اطاعت سے انحراف کرتا ہے۔ جب اطاعت سے منحرف ہو گیا تو پھر اس کی زندگی اسلامی زندگی نہیں رہ سکتی۔ اسی لئے مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ

من خرج من الطاعۃ وفارق الجماعۃ فمات میتۃ جاھلیۃ (او کما قال رسول اللہ)

جو شخص اطاعت سے علیحدہ ہو گیا اور جماعت کا ساتھ چھوڑ گیا تو اس کی موت (اسلام پر نہیں) جاہلیت کی موت ہوگی۔

پھر جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ اطاعت کے یہ معنی نہیں کہ جن امور میں جی چاہا اطاعت کر لی اور جن احکام کی تعمیل سے طبیعت جی چراتی ہو اور ان پر عمل پیرا ہونا شاق گذرتا ہو۔ ان میں یہ کہکر اطاعت سے سرتابی اختیار کر لی جائے کہ مجھے ان امور میں اختلاف ہے۔ ذاتی اختلاف کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر جماعت سے تمسک اور تفرق ذاتی پسندیدگی اور ناپسندیدگی پر موقوف ہو جائے تو ایسی جماعت کبھی قائم نہیں رہ سکتی۔ اسی لئے ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔

من رای من امیرہ شیئا یکرھہ فلیصبر فانہ لیس احد یفارق الجماعۃ شبرا فیموت الامات میتۃ جاھلیۃ (او کما قال)

جو شخص اپنے امیر میں کوئی ناپسندیدہ بات دیکھے تو اس کو (اطاعت سے منہ نہیں موڑ لینا چاہیئے بلکہ) ثابت قدم رہنا چاہیئے۔ اس لئے کہ جو شخص جماعت سے بالشت بھر الگ ہو گیا

اور اسی پر مر گیا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔

یہ تو خود اطاعت کو نہی کے متعلق ہے اور اگر کوئی فتنہ پرداز تمہاری جماعت میں تشتت و انتشار کی کوشش کرے تو اس کے قتل کر دینے کا حکم ہے۔ اس لئے کہ الفتنۃ اشد من القتل چنانچہ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ

من اتاکم وامرکم جمیع علی رجل واحد یرید ان یشق عصاکم او یفارق جماعتکم فاقتلوہ (او کما قال)

جو شخص تمہارے پاس ایسی حالت میں آئے کہ تمہارا امر ایک شخص پر جمع ہو چکا ہو۔ اور وہ چاہے کہ تمہاری جماعت میں تفرقہ اور انتشار پیدا کرے۔ تو اس کو قتل کر ڈالو۔

جب ایک شخص کو امیر منتخب کر لیا جائے تو جماعت میں سے کسی شخص کو انفرادی طور پر حق نہیں رہتا کہ اس کے فیصلوں پر تنقید کرے۔ جماعت کے ہر فرد پر اس کے احکام کی اطاعت لازم ہے۔ اور جب اطاعت سے انکار کا حق نہیں تو اس چیز کا حق کیسے حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ یہ کہہ کر کہ میں اس امیر سے بہتر ہوں۔ اپنی ٹولی الگ بنانے کی فکر کرنے لگ جائے یہ تو وہ جرم ہے جس کی سزا مندرجہ صدر روایت کے مطابق قتل ہے۔ امیر ہر شخص کی اپنی مرضی کے مطابق نہیں ہو سکتا۔ جماعت کی مرضی کے مطابق منتخب ہو سکتا ہے۔ افراد کو اپنی پسند جماعت کی پسند کے تابع رکھنی ہوگی۔ اور جماعت کے منتخب کردہ امیر کی اطاعت ہر فرد پر ضروری ہوگی خواہ کوئی امیر منتخب ہو جائے۔ جیسا کہ ارشاد نبویؐ ہے۔

اسمعوا واطیعوا وان استعمل علیکم عبد حبشی (او کما قال رسول اللہ)

سنو اور اطاعت کرو۔ اگرچہ حبشی غلام ہی تم پر امیر کیوں نہ مقرر کر دیا جائے۔

تمہاری ذمہ داری یہ ہے کہ تم امیر کے فیصلوں کی اطاعت کرو۔ امیر اپنی ذمہ داری کے لئے خود مسئول ہے۔

اسمعوا واطیعوا فانما علیھم ما حملوا وعلیکم ما حملتم (او کما قال رسول اللہ)

سنو اور اطاعت کرو اس لئے کہ امیروں کے ذمہ وہ چیزیں ہیں جو ان کی ذمہ داری میں دی گئی ہیں اور تمہاری ذمہ داری خود تمہارے اوپر ہے۔

یہ ہے اسلام اور اسی کے اندر جنت ہے۔ چنانچہ نبی اکرمؐ نے جماعت قدسیہ کے اس اجتماع عظیم میں جس کی نظیر آسمان کی آنکھوں نے آج تک نہیں دیکھی۔ حجۃ الوداع میں دیگر احکام کی تاکید کے بعد فرمایا کہ۔

واطیعوا اذا امرتم تدخلوا جنۃ ربکم۔ (او کما قال)

اور جب تم کسی کو امیر بناؤ تو اس کی اطاعت کرو۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ تم اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے
ان ارشادات پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ مسلمان کی حقیقی زندگی اور زندگی کی فلاح و بہبود کا راز کیا ہے؟

کتاب و سنت کی ان تصریحات کے بعد اس چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ صدر اول کے مسلمانوں کے نظائر و آثار پیش کر کے بتایا جائے کہ ان کے نزدیک **اطاعت** کی اہمیت کتنی تھی۔ وہ تو اطاعت کے پیکر تھے۔ ہمہ تن متابعت تھے۔ اطاعت ان کا ایمان تھا۔ اطاعت ان کا عمل تھا۔ اور یہی ایمان و عمل تھا جس سے چند سال کے عرصہ میں ایک اونٹ چرانے والی کھجوروں کی گٹھلیوں پر گزارہ کرنے والی۔ بادیہ نشین قوم قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کی مالک اور شرق و غرب کی حکمراں بن گئی تھی۔ یہ دنیا بھی ان کی تھی اور اگلی دنیا بھی ان کی اطاعت سے سرکشی تو ایک طرف اس کا خیال تک بھی ان کے گوشۂ تصور میں نہ آ سکتا تھا۔ مجالس مشاورت میں بحث و تمحیص بھی ہوتی تھی۔ آزادیٔ رائے اور حریتِ فکر موجود تھی۔ آرار میں اختلاف بھی ہوتا تھا۔ لیکن جب امیر کی طرف سے فیصلہ صادر ہو جاتا تھا تو پھر نہ کوئی اختلاف باقی رہتا تھا نہ اختیار۔ اسوقت حکم کی تعمیل ان کا مسلک تھا اور فیصلہ کی اطاعت ان کا مشرب۔ بحث و تمحیص میں کسی نے کیا کہا تھا اور کیا سنا۔ اس کی یاد تک باقی نہیں رہتی تھی۔ جب عمل کا وقت آتا تھا تو یہ تمام چیزیں ختم ہو جاتی تھیں۔ اس وقت کیفیت یہ ہوتی تھی کہ

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں!
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

اس وقت ہر شخص حکم کی اطاعت میں سابقت کے لئے یوں پیش پیش ہوتا تھا گویا ؎

سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا۔

ادھر سے یہ ہوتا تھا اور ادھر سے خدا کی رحمتیں ابر بہار کی طرح یوں گہرباری کرتی تھیں کہ ہر شخص اللہ کے فضل و کرم سے جھولیاں بھر بھر کر لوٹتا تھا۔ رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ۔ وذالک الفوز المبین۔ جب حضرت صدیق اکبرؓ نے ادائیگی زکوٰۃ میں حجت نکالنے والے قبیلہ کے خلاف تادیبی کارروائی کا سوال اٹھایا تو اور تو اور حضرت عمرؓ تک کو بھی آپ سے اختلاف تھا لیکن جب معاملہ پر غور و خوض اور بحث و نظر کے بعد حضرت صدیقؓ نے ان لوگوں کے خلاف تلوار اٹھانے کا فیصلہ صادر فرما دیا تو یہ تمام صحابہؓ صفوں میں باندھ

تھے۔ نہ کسی نے اپنے اختلاف رائے کی بنا پر اطاعت سے انحراف کیا نہ اپنے تفقہ کی برتری اور اسلام کی خدمات کے زعم میں جماعت سے علیحدگی اختیار کرلی۔ یہ چیزیں تو ان حضرات کے حیطۂ خیال میں بھی نہیں آسکتی تھیں۔ بڑے بڑے ارباب قوت و اقتدار کو بھی جب باب امارت سے حکم پہنچتا تھا تو وہ لرز اٹھتے تھے۔ یہ لرزنا اور کانپنا معاذ اللہ استبداد کا نتیجہ نہ تھا کہ خدا کی حکومت میں ایک انسان کا دوسرے انسان پر استبداد و تغلب کیا؟ ان احکام کی اطاعت کو وہ لوگ خدا اور رسولؐ کی اطاعت سمجھتے تھے اور کانپ اٹھتے تھے اس احساس سے کہ ان کی اطاعت میں کہیں چوک نہ ہو گئی ہو یا کسی قسم کی کوتاہی نہ ہو جائے۔ وہی تضرع و تخشع جو نماز کے سجدوں میں ان کے قلوب میں ارتعاش اور آنکھوں میں آنسو پیدا کر دیتا تھا۔ مرکز کے حکم کے سامنے اسی احساس سے بدن میں لرزش پیدا ہو جاتی تھی اور سمعنا (ہم نے سنا) و اطعنا (اور اس کی اطاعت کر دی) کے سوا ان احکام کا کوئی اور جواب نہیں ہوتا تھا۔ یہ وہ تھے جنہوں نے اسلام کی حقیقت کو سمجھا تھا۔ راز حیات کو پالیا تھا۔

کتاب و سنت کی ان تصریحات و شواہد اور دور اسلامی کے ان نظائر و بصائر کو سامنے رکھئے اور اس کے بعد اپنے موجودہ دور کی طرف آئیے۔ اس میں کسے کلام ہے کہ یہ دور دور اسلامی نہیں بلکہ قریب قریب دور جاہلیت ہے۔ اس دور جاہلیت کو دور اسلامی بنانے کے لئے دلوں میں کچھ تڑپ پیدا ہونی شروع ہوئی ہے خاک کے ان منتشر ذروں میں پھر سے زندگی کے آثار نظر آرہے ہیں۔ لٹے ہوئے قافلہ کے بکھرے ہوئے افراد کے دلوں میں احساس زیاں نے تپش و خلش کا خفیف سا سوز پیدا کیا ہے اب غور کیجئے کہ ان مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے آپ ایک جماعت بناتے ہیں۔ آپ سب کچھ دیکھ بھال کر بلا جبر و اکراہ اپنے آپ کو اس جماعت سے منسلک کرتے ہیں۔ اس کے آئین و ضوابط کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی رکنیت قبول کرتے ہیں۔ اپنے میں سے ایک امیر متعین کرتے ہیں اس امیر کی اطاعت کا اقرار کرتے ہیں۔ دنیا بھر میں اس تمسک و اقرار کا اعلان کرتے ہیں۔ لیکن اگر اس کے بعد آپ کی حالت یہ ہو کہ آپ اس جماعت سے وابستگی کا دعوےٰ بھی کرتے جائیں لیکن اس کے آئین و ضوابط کی پرواہ تک نہ کریں۔ اس سے منسلک و متمسک ہونے کا اعتراف تو ہر وقت ہو لیکن اس کے فیصلوں کی اطاعت صرف اس وقت تک کریں جب تک اس اطاعت میں آپ کو اپنا ذاتی مفاد نظر آئے اور جونہی آپ کی خواہش یا مصلحت کا تقاضا کچھ اور ہو۔ آپ بلا تامل اس کی اطاعت کا قلادہ اتار پھینکیں۔ پھر بایں ہمہ اس جماعت کی رکنیت کا دعوےٰ بدستور قائم رکھیں۔ تو فرمائیے کہ اسلامی میزان و معیار کے مطابق

آپ کی اس روش کو کیا کہا جائے مشکل یہ ہے کہ اس امر کا احساس ہی نہیں کہ ہم جماعت کی تشکیل۔ امیر کا انتخاب اس کی اطاعت کا اقرار۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے کر رہے ہیں اور اس بنا پر جماعت سے تمسک اور امیر کی اطاعت ایک مذہبی فریضہ کے طور پر ہم پر لازم آجاتی ہے۔ ہم نے سمجھ یہ رکھا ہے کہ جس طرح مغرب میں پارٹیاں بنتی ہیں اور ٹوٹتی ہیں لوگ مشغلہ کے طور پر۔ یا زیادہ سے زیادہ بعض سیاسی مفاد و مصالح کی خاطر مختلف احزاب (پارٹیوں) سے متمسک ہو جاتے ہیں۔ جب تک جی چاہا اس جماعت کے ساتھ رہے جب جی اکتا گیا۔ الگ ہو گئے۔ پھر حسب منشا کوئی اور پارٹی تلاش کر لی۔ اس کے ساتھ ہو لئے۔ یہی کچھ ہندوستان میں ہو رہا ہے۔ لیکن مسلمان یہ نہیں سمجھتے کہ ایک اسلامی جماعت کے ساتھ تمسک اور اس کے امیر کی اطاعت ایک مشغلہ یا سیاسی مصلحت نہیں۔ تمہارے لئے جزو مذہب۔ بلکہ عین مذہب ہے یہ ایک دلچسپی کا سامان نہیں موت اور زندگی کا سوال ہے۔ ایک مسلمان کا اسلامی جماعت سے الگ ہو جانا دائرہ اسلام سے الگ ہو جانے کے مرادف ہے۔ اس کا اپنے امیر کی اطاعت سے الگ ہو جانا سرتابی اختیار کر لینا سیدھا جہنم میں چلے جانا ہے مسلمانوں نے محض ایک کھیل سمجھ رکھا ہے لیکن نہیں جانتے کہ یہ کھیل نہیں دنیا اور آخرت کی سرفرازی یا روسیاہی کا سوال ہے! جماعت سے بالشت بھر الگ ہو جانے والا ارشادات نبوی کے مطابق اسلام سے الگ ہو جاتا ہے خواہ وہ لاکھ نمازیں پڑھے اور ہزار روزے رکھے۔ اسلام میں انفرادی زندگی۔ اسلامی زندگی نہیں ہے۔ جاہلیت کی زندگی ہے۔ جماعت سے الگ رہنے والا۔ دعوائے اسلام کے باوجود اسلام سے باہر ہوتا ہے۔ اطاعت امیر سے انحراف کرنے والا صرف اپنے آپ کو فریب دے سکتا ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کو فریب نہیں دے سکتا۔ اس کے لئے اللہ کا فیصلہ واضح اور اس کے رسولؐ کے ارشادات کھلے کھلے موجود [illegible] اس میں شبہ نہیں کہ مدتوں سے بھولی بسری قوم کو ان صداقتوں کی یاد کے لئے بھی ایک وقت درکار ہے ہمارا تخاطب عوام سے نہیں۔ ہم تو ان ارباب حل و عقد کو مخاطب کرنا چاہتے ہیں جو مسلمانوں کو راستہ [illegible]نے کے مدعی اور اس باطل کدہ میں پھر سے اسلامی زندگی پیدا کرنے کے دعویدار ہیں۔ ہم ان سے پوچھتے [illegible]کیا آپ کے سامنے خدا اور رسولؐ کی یہ تصریحات موجود ہیں یا نہیں! یا کیا آپ بھی محض مغرب کی نقالی [illegible]یں سوانگ رچائے بیٹھے ہیں! ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ خود حضرات بھی ان حقائق سے مشغلہ کے طور پر کھیل [illegible]رہے ہیں جب تک ان کا جی چاہا۔ ساتھ رہے جب مصلحت کچھ اور نظر آئی۔ الگ ہو گئے۔ جماعت [illegible]لکھ ہے۔ یہ اپنی طرف سے کچھ اور ہی کہے چلے جا رہے ہیں۔ زبان سے لمبے چوڑے دعوے

ہیں کہ ہم اطاعت شعار ہیں لیکن اندر ہی اندر جماعت اور اس کے امیر کے خلاف سازشیں بھی ہو رہی ہیں۔

ویقولون طاعۃ فاذا برزوا من عندک بیت طائفۃ منھم غیر الذی تقول واللہ یکتب

ما یبیتون فاعرض عنھم وتوکل علی اللہ وکفی باللہ وکیلا ۔ ۴/۸۱-۸۲

اور (دیکھو یہ لوگ سامنے تو کہہ دیتے ہیں) کہ آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ لیکن جب تمہارے پاس سے

اٹھ کر باہر جاتے ہیں تو ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو راتوں کو (چپکے چپکے) مجلس جماتے ہیں اور جو

کچھ تم کہتے ہو اس کے خلاف مشورے کرتے ہیں اور راتوں (کی ان مجلسوں) میں جو کچھ کرتے ہیں وہ

(اللہ سے مخفی نہیں۔ وہ سب کچھ ان کے نامۂ اعمال میں) لکھ رہا ہے!

پس (جب ان لوگوں کا حال یہ ہے) تو چاہیئے کہ ان کی طرف سے توجہ ہٹالو اور اللہ پر بھروسہ

کرو۔ کارسازی کے لئے اللہ کی کارسازی بس کرتی ہے۔

اندر اندر یہ حالت ہے اور جب پلیٹ فارم پر لوگوں کے سامنے آتے ہیں تو آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے

اپنی اطاعت اور وفا کیشی کی قسمیں کھاتے ہیں اور قرآن اٹھا اٹھا کر یقین دلاتے ہیں کہ ہم تو اپنے امیر کے کمر بستہ

غلام ہیں۔ حالانکہ جو فی الواقعہ اطاعت شعار ہے اسے کسی قسم اور سوگند کی ضرورت ہی نہیں۔ اس کا عمل

سب سے بڑی شہادت اور اس کی روش سب سے محکم سوگند ہے۔

واقسموا باللہ جھد ایمانھم لئن امرتھم لیخرجن قل لا تقسموا

طاعۃ معروفۃ ان اللہ خبیر بما تعملون ۔ ۲۴/۵۳

یہ لوگ پورے زور و شور سے قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر تم انہیں حکم دو گے تو یہ (اس کی تعمیل کے

لئے) یقیناً نکل کھڑے ہوں گے۔ ان سے کہو کہ قسموں کی ضرورت نہیں (ضرورت ہے) ایک

جانی پہچانی ہوئی طاعت کی۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خوب واقف ہے۔

اور یہ اطاعت ہر مسئلہ اور ہر معاملہ میں یکساں ہوگی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ بعض معاملات میں امیر کی اطاعت کر لی اور

بعض میں ان لوگوں کے ساتھ جا ملے جو تمہارے نظام ملی کے ازلی دشمن ہیں۔ اس روش زندگی سے اللہ کا

رسوا کن عذاب محیط ہو جاتا ہے اور تمام اعمال غارت ہو کے رہ جاتے ہیں۔ سب سے پہلے تو یہی سوال کیا کم ہے کہ

تمہیں اللہ نے جنہیں غالب رہنے کے لئے پیدا کیا تھا۔ ان کے سامنے جبہ سائیاں پھیلاتے ہو اور ان کی مدد سے اپنی جماعت

اور قوت کے قیام کی کوشش کرتے ہو! قرآن کریم اس روش زندگی کو ایک مسلم کی زندگی نہیں بلکہ منافق کی زندگی

قرار دیتا ہے۔

انّ الّذین ارتدّوا علیٰ ادبارھم من بعد ما تبیّن لھم الھدیٰ الشیطٰن سوّل لھمؕ واملیٰ لھم۔ ذالک بانّھم قالوا للّذین کرھوا ما نزّل اللہ سنطیعکم فی بعض الامرج واللہ یعلم اسرارھم ۲۵-۲۶

یقیناً وہ لوگ جو بعد اس کے کہ ان پر ہدایت واضح ہو چکی تھی۔ اپنی پیٹھ موڑ کر مرتد ہو گئے اور شیطان نے انھیں اس بات کو معمولی سی بات بنا کر دکھا دیا۔ اللہ انھیں مہلت دیتا ہے۔

یہ اس لئے کہ یہ لوگ ان سے کہتے ہیں جو اس چیز کو ناپسند کرتے ہیں جو اللہ نے نازل کی ہے کہ ہم بعض امور میں تمہاری اطاعت کریں گے۔ اللہ ان کے بھیدوں سے واقف ہے۔

اس سے آگے ہے کہ موت کے وقت اللہ کے فرشتے انھیں سخت عذاب دیں گے اور ان کے تمام اعمال غارت ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ انھوں نے اس چیز کی اطاعت کی جو اللہ کو سخت ناپسند ہے۔ اپنی جماعت کو چھوڑ کر دوسروں کے ساتھ چلنا تو در کنار۔ بعض معاملات میں بھی ان کی اطاعت قبول کر لینا۔ اللہ کے نزدیک اس قدر ناپسندیدہ ہے کہ ایسے لوگوں پر اس کی لعنت برستی ہے اور ان کا سب کچھ کیا کرایا بے نتیجہ ہو کے رہ جاتا ہے اس قسم کی حرکات صرف ان لوگوں سے سرزد ہوتی ہیں جو خدا کے احکام کے مقابلہ میں اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک کھلا ہوا شرک ہے۔

افرأیت من اتّخذ الٰھہٗ ھواہ واضلّہ اللہ علیٰ علم وختم علیٰ سمعہٖ و قلبہٖ وجعل علیٰ بصرہٖ غشاوۃؕ فمن یھدیہ من بعد اللہؕ افلا تذکّرون ۲۳

کیا تو نے اس کی حالت پر بھی غور کیا جس نے خود اپنی خواہشات کو ہی اپنا خدا بنا لیا۔ اور اللہ کے قانون نے اسے باوجود علم رکھنے کے گمراہ کر دیا اور اس کے کانوں پر اور دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ سو اللہ کے قانون کے بعد کون ہدایت دے سکتا ہے۔ کیا تم اس سے نصیحت حاصل کرو گے۔

ذرا اس حقیقت کبریٰ پر غور کیجئے۔ ایک شخص اسے خوب جانتا ہے کہ غیر کبھی اپنے نہیں ہو سکتے۔ ان کے دل کبھی صاف نہیں ہو سکتے۔ وہ محض سودا کرتے ہیں۔ وہ فنکاری ہیں ان کے ارادے کبھی نیک نہیں ہو سکتے وہ کبھی اسے گوارا ہی نہیں کر سکتے کہ ان کی حالت بہتر ہو جائے۔ وہ ہمیشہ ان کی تخریب میں کوشاں اور تذلیل میں ساعی رہتے ہیں لیکن اس علم کے باوجود یہ اندھا اور بہرا ہو جاتا ہے۔ آنکھیں رکھتا ہے لیکن بصیرت سے محروم۔

سکان موجود ہیں لیکن نا آشنائے سماعت۔ سینے میں دل بھی دھڑکتا ہے لیکن اس قابل نہیں کہ معاملہ کو سوچ سمجھ سکے۔ یہ سب اس لئے کہ اس کی اپنی خواہشات اور ذاتی مفاد کے تصور نے اس کے جذبات کو گرفتار کر رکھا ہے ان میں ایسی تحجر پیدا کر دی ہے جو آنکھوں کے سامنے دھند کا پردا بن کر چھا گئی ہے جس نے اسکے قلب پر غلاف چڑھا دیا ہے جس نے اس کے کانوں کے پردوں کو ماؤف کر دیا ہے۔ پوری کی پوری جماعت اس کی اس روش غارتگری کے خلاف پکارتی ہے لیکن اسے کچھ سنائی نہیں دیتا۔ تمام اپنے' اس کے مسلک کے نتائج و عواقب کو اس کے سامنے لاتے ہیں لیکن اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ہر بہی خواہ اسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن کوئی ٹھیک بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی یہ اس لئے کہ اس کے ذاتی مفاد نے اس کے قلب و نگاہ میں ایسی جاذبیت پیدا کر رکھی ہے کہ اسے کچھ اور سجھائی نہیں دیتا۔ یہ ہے وہ مقام جہاں انسان علانیہ سرکشی پر اتر آتا ہے اور کھلی ہوئی سرتابی اختیار کر لیتا ہے۔ جہاں ذاتی مفاد' ملی مفاد پر غالب آئے۔ سرکشی پیدا ہو گئی' جہاں حق لوگوں کی خواہشات کے تابع ہوا۔ فساد ہی فساد برپا ہو گیا۔

ولو اتبع الحق اھواءھم لفسدت السمٰوٰت والارض ومن
فیھن ۔ بل اتینٰھم بذکرھم فھم عن ذکرھم معرضون ۲۳/۷۱

اگر حق لوگوں کی خواہشات کے تابع ہو جائے تو زمین اور آسمان اور جو کچھ ان کے اندر ہے ان سب میں فساد برپا ہو جائے۔

یہ لوگ چاہتے یہ ہیں کہ جماعت ان کی خواہشات کی تابع ہو جائے۔ یہ جماعت کے فیصلوں کے تابع نہ رہیں۔ جب تک امیر ملت ان کے ساتھ ہمنوا رہے یہ اس کی اطاعت کا دعوے کرتے رہیں اور جونہی کسی معاملہ میں اس سے اختلاف ہو۔ پہلے اسے ڈرانا دھمکانا شروع کریں۔ پھر اس پر طرح طرح کے الزام لگائیں۔ اور بالآخر ساتھ چھوڑ کر الگ ہو جائیں یہ سب اس لئے کہ ان کے سامنے محض اپنا ذاتی مفاد ہے۔ ملت کا مفاد کوئی شے نہیں حالانکہ اگر یہ لوگ غور کریں تو اس حقیقت کا سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں کہ جس چیز کو ملت کا مفاد (یعنی اپنا نہیں کسی غیر کا مفاد) سمجھا جاتا ہے وہ کسی غیر کا نہیں بلکہ خود اپنا ہی مفاد ہوتا ہے۔ کیا سارے جسم کی قوت خود معدہ کی قوت نہیں ہے اگر کبھی معدہ اس بات پر اکڑ جائے کہ جو کچھ مجھ میں آتا ہے سارے کا سارا خود ہی رکھ لوں اور باقی اعضاء کو اس میں سے کچھ نہ دوں تو آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ خود معدہ کتنے دن زندہ رہ سکیگا؟ سارے جسم کی تنومندی اور قوت خود معدہ کی تنومندی اور قوت ہے۔ اگر جسم کمزور ہو گیا تو معدہ بھی ختم ہو جائے گا۔ یہ تو ایک ایسا چکر ہے' جس میں ایک دوسرے سے الگ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس نظام میں ایک ایک ذرہ دوسرے کے ساتھ بندھا ہوا ہے

ان کا باہمی تعلق لاینفک اور نہایت گہرا ہے۔ ان کی انفرادی حیثیت کچھ بھی نہیں۔ کائنات کا یہ ربط وضبط، یہ نظم ونسق حق ہے اگر یہ حق کسی ایک ذرّہ کی ذاتی خواہش کے تابع ہو جائے اور وہ سمجھ بیٹھے کہ میرے مفاد نظامِ کلی سے الگ اور جداگانہ ہیں۔ تو سارا نظام بگڑ جائے گا اور جب نظام ہی نہ رہیگا تو وہ ذرہ کہاں باقی رہے گا جس نے اپنی جداگانہ تعاد بہبود کے زعمِ باطل میں نظام کی اطاعت کو چھوڑا تھا۔ وہ بھی ساتھ ہی مٹ جائے گا۔

جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا!
کریدتے ہو جواب راکھ جستجو کیا ہے!

فرد کی ہستی جماعت کے ساتھ ہے۔ سمندر اگر اوپر کو ابھرتا ہے تو اس کے ساتھ ہی ایک قطرۂ ناتواں بھی ابھرتا ہے۔ وہ اگر نیچے جاتا ہے تو بڑی بڑی موجیں بھی ساتھ ہی نیچے جاتی ہیں۔ ان میں سے نہ کوئی سمندر (یعنی اپنے کل) سے الگ ابھر سکتا ہے نہ نیچے جا سکتا ہے)۔ اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو یہ اس کی سمجھ کی بھول ہے۔ حقائق سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ قوم ذلیل ہو اور قوم کے افراد معزز و مکرم! جو افراد قوم سے الگ اپنی ذاتی عزت اور وجاہت کے خیال میں مگن ہیں۔ وہ فریب خوردہ ہیں۔ حقیقت ناآشنا ہیں۔ وہ جانتے نہیں کہ دنیا انھیں کیا سمجھتی ہے۔ ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں اگر یہ پردے اٹھ جائیں تو انھیں اپنا صحیح مقام نظر آجائے اس وقت انھیں معلوم ہو جائے کہ ہاں! سچی عزت فی الواقع قوم کے ساتھ رہنے میں ہے۔ اصل حکومت، درحقیقت اطاعت کے اندر ہی ہے۔ سرکشی لعنت ہے اور لعنت کا فطری نتیجہ ذلت و رسوائی ہے خواہ وہ ذلت و رسوائی نگاہوں کی بھول سے کتنے ہی خوشنما پردوں میں کیوں نہ چھپی ہو۔

اسلام کی میزان میں اطاعت سے سرتابی کی سزا اس قدر سنگین اس لئے ہے کہ اس کے نتائج بڑے تباہ کن اور دور رس ہیں۔ بعض جرائم ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا اثر افراد سے آگے بڑھ کر جماعت کی تخریب کا باعث ہو جاتا ہے۔ اطاعت سے انحراف بھی اسی قسم کا جرم ہے اور ایسا جرم کہ اس کے اثرات بڑی ہولناک تباہیوں کا موجب بنتے ہیں۔ اسی لئے ارشاد ہے کہ

واطیعوا اللّٰہ ورسولہ ولا تنازعوا فتفشلوا وتذہب ریحکم واصبروا ان اللّٰہ مع الصّٰبرین ہ ﴿۸/۴۶﴾

اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اور آپس میں جھگڑا نہ کرو۔ ایسا کرو گے تو تمہاری طاقت سست پڑ جائے گی اور ہوا اکھڑ جائے گی ہر معاملہ میں ثابت قدمی سے رہو اللہ ثابت قدمی سے رہنے والوں کے ساتھ ہے۔

جب جماعت میں سے ایک فرد بھی اطاعت سے سرکشی اختیار کرتا ہے تو جماعت کے ربط وضبط پر اس کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے اس عمل کی مدافعت میں کچھ نہ کچھ تو کہے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے کوئی نہ کوئی ہمنوا بھی مل جائے۔ اگر دو چار بھی اس کے ساتھ ہو گئے تو باہمی تنازعہ کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ موافق مخالف دلائل بازی ہو گی۔ ایک دوسرے پر تنقید کی جائے گی۔ جماعت دو گروہوں میں بٹ جائے گی اور بالآخر جس گروہ کے خلاف فیصلہ ہو گا وہ اپنی ٹولی الگ بنالے گا اور یوں ایک فرد کی استبداری سے جماعت کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ لہٰذا جماعت کو ایسے تباہ کن اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس جرم کی سزا سخت ترین رکھی جائے۔ جماعت کے فیصلے تنقید کی حدود سے بالاتر ہونے چاہئیں۔ جب کوئی معاملہ پیش ہو تو ہر شخص کو اس پر آزادانہ گفتگو کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے لیکن جب فیصلہ ہو جائے تو اس کے خلاف آواز اٹھانے کا اختیار کسی کو نہیں ہے۔ اس وقت جو شخص اس پر تنقید کرے گا وہ ملت کا غدار ہے اس فتنہ کو فوری دبا دینا چاہیئے اور ایسے آہنی ہاتھوں سے دبانا چاہیئے کہ دوسروں کے لئے موجب عبرت ہو۔ اس لئے کہ وہ جراثیم جو پوری کی پوری جماعت کے لئے ہلاکت کا سامان اپنے اندر رکھتے ہوں۔ انھیں جس قدر جلد فنا کر دیا جائے۔ بہتر ہے اس میں کسی کی رعایت نہیں ہونی چاہیئے خواہ وہ کتنے ہی بڑے اثر واقتدار کا مالک کیوں نہ سمجھا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اثر واقتدار افراد کی ملکیت ہونے ہی نہیں چاہئیں۔ جماعت ہی کا اثر ہونا چاہیئے اور جماعت ہی کا اقتدار۔ جب تک کوئی شخص جماعت کے ساتھ ہے اس کی خدمات اور قابلیت کے مطابق اس کی عزت وتکریم اور اثر واقتدار ہے۔ لیکن جونہی اسنے جماعت کے فیصلوں سے منہ موڑا۔ اس کا تمام اثر واقتدار چھین جانا چاہیئے۔ تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ افراد جماعت کے محتاج ہیں نہ کہ جماعت افراد کی۔ جب حق لوگوں کی خواہشات کا تابع ہو جائے تو اس کا فطری نتیجہ فساد ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب جماعت افراد کی محتاج ہو جائے۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے دورِ جاہلیت سے اسلامی دور کی طرف آنے کا احساس تو کیا ہے لیکن صدیوں سے عجمی تصوّرات سے متاثر قلوب میں اسلامی تصوّرات آتے آتے ہی آئیں گے یوں تو جس سے پوچھئے وہ بلا تکلف کہہ دے گا کہ اسلام میں دین اور سیاست دو الگ الگ چیزیں نہیں۔ ان کا دین سیاست اور سیاست دین ہے۔ لیکن چونکہ دین اور سیاست صدیوں تک الگ الگ رہ چکے ہیں

اس لئے عملی طور پر اب بھی اکثر مواقع پر غیر شعوری طور پر دین اور سیاست کو الگ الگ رکھا جاتا ہے۔ اسی مسئلہ اطاعت اور تمسک بالجماعت کو لیجئے۔ کتاب و سنت کی بین تصریحات کے بموجب اسلامی جماعت سے تمسک اور امیر کی اطاعت مسلمان ہونے کے لئے شرط ہے۔ لیکن عملاً اسے ایسا سمجھا نہیں جاتا۔ عملاً ہمارے ذہن میں ابھی تک یہی تصور ہے کہ قوم کے مقاصد پیش نظر کے حصول کے لئے باہمی اتفاق و اتحاد ایک عمدہ ذریعہ ہے۔ یعنی جس طرح ہندوؤں نے باہمی اتحاد سے ایک جماعت پیدا کرلی ہے اور اپنے لیڈر کی اطاعت سے اس جماعت میں قوت پیدا ہورہی ہے اسی طرح مسلمانوں کو بھی چاہیئے کہ وہ جماعت کے ساتھ رہیں اور لیڈر کی اطاعت کریں حالانکہ ان دونوں میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ ہندوؤں نے باہمی اتحاد اور متابعت کی صورت اختیار کی ہے تو ایک سیاسی مصلحت کوشی کی خاطر ایسا کیا ہے یعنی (AS A MATTER OF POLICY) لیکن مسلمانوں کے ہاں یہ چیز عین مذہب ہے۔ اسلام کی منظر جماعت ہے اور کوئی مسلمان۔ مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ جماعت کے ساتھ نہ ہو اور امیر کی اطاعت نہ کرے لہذا جن کے ہاں دوسروں کی اطاعت محض ایک مصلحت بینی ہے مسلمان کے لئے اطاعت فریضۂ خداوندی ہے۔ یہ حقیقت ابھی تک ہماری نگاہوں سے مستور ہے۔ ہمارے ہاں جو لوگ اسلامی جماعت کے ساتھ شامل ہیں اور اپنے منتخب امیر کی اطاعت کرتے ہیں۔ وہ بھی بالعموم یہ چیز اس گہرے احساس کے ساتھ نہیں کرتے کہ یہ چیزیں اسی طرح سے فرض ہیں جس طرح نماز پڑھنا فرض ہے صرف فرض ہی نہیں بلکہ تمام فرائض سے مقدم۔ اس لئے کہ جب اسلام کی عملی شکل یعنی جماعت ہی موجود نہ ہوگی تو باقی فرائض ادا کس طرح ہونگے؛ ہماری نگاہوں میں جماعت اور اطاعت کی یہ حیثیت نہیں ہے اور جب تک یہ حیثیت ہمارے دلوں میں جاگزیں نہیں ہوتی اس وقت تک ہمارے اعمال نتیجہ خیز نہیں ہوسکتے۔

لیکن ہمارے ہاں تو معاملہ ہی بالکل برعکس ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم ضابطۂ اطاعت کو اصل دین اور مرکز حیات سمجھ کر اس پر عمل پیرا ہوں۔ ہم نے تو اسے اتنی بھی اہمیت نہیں دی جتنی ان قوموں کے ہاں موجود ہے جو ان باتوں کو بہ تقاضائے مصلحتِ قومی اختیار کرتی ہیں۔ کبھی وہ وقت تھا کہ ساری دنیا اپنے معاملات کی اصلاح کے لئے مسلمانوں کی مثالیں پیش کیا کرتی تھی لیکن .... آج ہماری یہ حالت ہے کہ ہمیں عبرت و موعظت کے لئے دوسروں کی روش و مسلک کو بطور نظیر سامنے لانا پڑتا ہے۔ ذرا انگریزوں کو دیکھئے جن کی معاشرت کا ہر برائی کو آپ نے بڑے فخر سے نقل اتاری ہے لیکن ان کی کسی خوبی کو اپنے پاس نہیں آنے دیا۔ جرمنی نے

اعلان جنگ کر رکھا ہے مسٹر چیمبرلین قوم کا منتخب شدہ لیڈر (وزیر اعظم) ہے مسٹر چرچل اور ان کے دوسرے ہم نوا مبصرین و مدبرین اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ چیمبرلین کی پالیسی قوم کو ہلاکت و بربادی کے عمیق گڑھوں کی طرف لئے جا رہی ہے۔ اس پر تنقیدیں کی جاتی ہیں اختلاف آراء کے بڑی گرمجوشی سے مظاہرے ہوتے ہیں۔ اس کی پالیسی کے خلاف مضامین لکھے جاتے ہیں۔ تقریریں ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جب وہ ایک فیصلہ صادر کر دیتا ہے تو سب مخالفت ختم ہو جاتی ہے۔ ہر شخص بلا چون و چرا اس کی اطاعت کرتا ہے۔ چرچل وہیں موجود تھا وہ اور اس کی پارٹی اچھی طرح سے دیکھ رہی تھی کہ وہ چیمبرلین سے کہیں بہتر ہے۔ اور قوم کی سلامتی اس میں ہے کہ پالیسی اس کے ہاتھ میں ہو۔ لیکن باایں ہمہ وہ جماعت سے الگ ہو کر اپنی لیڈری جداگانہ قائم نہیں کرتا۔ چیمبرلین کے ہر فیصلہ کی اطاعت کرتا ہے اور اس وقت تک اطاعت کرتا رہتا ہے جب تک قوم اسے وزیر اعظم تسلیم کئے رکھتی ہے۔ اس کے بعد جب مسٹر چرچل وزیر اعظم ہو جاتے ہیں تو جو لوگ مسٹر چیمبرلین کے زمانہ میں ارباب بست و کشاد تھے وہ مسٹر چرچل کے دست و بازو بن جاتے ہیں اور ان کی پالیسی کی بھی اسی جذب و انہماک سے تعمیل کرتے ہیں۔

اتنی دور نہ جانا ہو تو یہیں ہندوستان میں دیکھئے۔ ہندو قوم نے اپنے میں سے ایک شخص کو اپنا لیڈر منتخب کر رکھا ہے اس کے گرد و پیش متعدد ایسے لوگ ہیں جو ہندو جاتی میں کچھ کم اثر و اقتدار نہیں رکھتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ہزار بار مسٹر گاندھی سے اختلاف ہوا ہے۔ فرعی اختلاف نہیں اصولی اختلاف مسٹر گاندھی کی پالیسی کے خلاف تقریریں ہوتی ہیں۔ مضامین لکھے جاتے ہیں لیکن کیا مجال جو ان میں سے کسی ایک نے کبھی اطاعت سے سرتابی کی ہو۔ جب تک وہ لیڈر ہے اس کی اطاعت میں کوئی فرق نہیں آنے پاتا حالانکہ بعض اوقات وہ لیڈر اس قسم کے فیصلے بھی دیدیتا ہے جس پر دنیا ہنستی ہے یہ لوگ خود بھی محسوس کرتے ہیں لیکن باایں ہمہ اطاعت سے کوئی بھی انحراف نہیں کرتا جب کبھی ایسا ہو کہ مسٹر گاندھی کی پالیسی کے خلاف طریق کار مناسب سمجھا جائے تو اس وقت سب مل بیٹھ کر تجویز کرتے ہیں۔ مسٹر گاندھی ان سے الگ ہو جاتے ہیں۔ اور یہ لوگ ایک دوسری روش اختیار کر لیتے ہیں لیکن اس وقت بھی یہ نہیں ہوتا کہ کچھ لوگ مسٹر گاندھی کے ساتھ ہو جائیں اور کچھ ان کے ساتھ۔ سب کا فیصلہ متفقہ اور سب کی آواز ایک ہوتی ہے۔ اس سارے عرصہ میں دو ایک واقعات ایسے ہوئے کہ (مسٹر نریمان۔ کھارے یا بوس وغیرہ نے) مسٹر گاندھی کی اطاعت سے انحراف کیا۔ اس پر قوم نے انھیں جو سزا دی وہ سب کے سامنے ہے ان پر دنیا تنگ کر دی۔ جینا مشکل ہو گیا نتیجہ اس کا یہ کہ دوسروں کو عبرت ہو گئی۔ اب کیا مجال جو کوئی سرکشی کا تصور بھی ذہن میں لائے۔

"اس قوم کی کیفیت ہے جن کا نہ خدا ایک۔ نہ رسول ایک۔ نہ کتاب ایک۔ نہ مذہب ایک۔ نہ کیش و مشرب ایک۔ نہ تصور حیات۔ لیکن بایں ہمہ ایک قومی مقصد کے حصول کی خاطر انھوں نے اپنے اندر اس قدر انضباط و اطاعت کا جذبہ پیدا کر رکھا ہے۔ نتیجہ یہ کہ انگریز سے معاملہ ہو یا مسلمان سے۔ کوئی بھانت بھانت کی بولیاں نہیں بولتا سب اسی ایک لیڈر کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں اور ان کی اس یک جہتی اور ہم آہنگی۔ اطاعت و انقیاد کے چکتے ہوئے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ وہ تو یوں کہئے کہ اس قوم کی فطری تنگ دلی اور تنگ ظرفی ہے جس نے اسے اس قدر اطاعت اور اتحاد کے باوجود زیادہ آگے نہیں بڑھنے دیا۔ ورنہ اگر ان میں حریت آشنا قوموں کی کچھ بھی خوبیاں ہوتیں تو آپ دیکھتے کہ ان کا جوہر اطاعت و اتحاد کیا رنگ لاتا۔

اور ان کے برعکس مسلمان! الاماں والحفیظ!! گیدڑوں سے کسی نے پوچھا کہ تمہارا نمبردار کون ہے بولے کہ جس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ دو وہی نمبردار! مسلمانوں میں بھی ہر شخص اپنے آپ کو "واحد لیڈر" سمجھتا ہے اس جماعت میں سب امام ہی امام ہیں۔ مقتدی کوئی نہیں۔ یہ ایک جماعت سے وابستہ ہیں۔ جماعت کے اجلاس میں شریک ہوتے ہیں معاملات زیر نظر پر غور و خوض ہوتا ہے۔ بحث و تمحیص کے بعد ایک فیصلہ ہوتا ہے جب وہی فیصلہ ان کے منتخب کردہ امیر کی وساطت سے باہر آتا ہے تو مشرق سے کچھ آواز اٹھتی ہے اور مغرب سے کچھ اور۔ ایک کچھ کہتا ہے دوسرا کچھ۔ کوئی ہندوؤں کی طرف بھاگا بھاگا جاتا ہے کہ مصالحت کی گفتگو کرنی ہو تو مجھ سے کیجئے۔ میں ہی سب کچھ ہوں۔ کوئی انگریز کو یقین دلا رہا ہے کہ یہ جماعت اور اس کے فیصلے۔ یہ امیر اور اس کے احکام کچھ نہیں۔ مجھے ساتھ رکھو تو پھر گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اگر کہیں کوئی مرحلہ ایسا آجائے جس میں ذرا سے ایثار کی ضرورت ہو۔ نہیں ایثار کی بھی نہیں! صرف اتنی سی بات کہ جس سے دوسروں پر یہ واضح ہو جائے کہ یہ لوگ فی الواقعہ جماعت کے ساتھ اور امیر کے تابع ہیں۔ تو ان پر آسمان ٹوٹ پڑتا ہے۔ گھبرائے گھبرائے پھرتے ہیں۔ پھر کوئی تو خفیہ سازشیں شروع کر دیتا ہے اور کوئی رسہ تڑا کر بھاگ اٹھتا ہے۔ کسی کو کچھ اطمینان اور یقین نہیں کہ کس وقت کون کیا کر بیٹھے اور کیا کر گذرے! ہر شخص اپنے اپنے ذاتی مفاد کو سامنے رکھے ہے۔ جب تک وہ مفاد جماعت کے ساتھ رہنے میں محفوظ ہے جماعت کے ساتھ ہیں۔ جب الگ ہو جانے میں فائدہ ہے۔ الگ ہیں۔ جسے امیر منتخب کرتے ہیں ہر وقت اس فکر میں ہیں کہ اسے نیچے گرا کر خود اس کی جگہ لے لیں۔ امام کے پیچھے نماز میں کھڑے ہیں اور آستین میں خنجر چھپائے ہیں کہ جونہی موقع ملے پیٹھ میں گھونپ دیا جائے۔ یہ تو یوں کہیے کہ کچھ نصب العین کی صداقت اور ان کے امیر کا کیرکٹر ہے جو یہ شکل قائم ہے ورنہ اگر اس کی خودی فولاد اور تائید ایزدی ساتھ نہ ہوتی تو یہ شیرازہ کبھی کا بکھر چکا ہوتا۔

یوں تو وہ کونسا وقت ہے جب کسی قوم کو تنظیم۔ اتحاد۔ ضبط و انضباط اور اطاعت کی ضرورت نہیں۔ لیکن بعض مواقع ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جہاں قوموں کی موت اور زندگی کا سوال پیش ہو جاتا ہے اس وقت ان چیزوں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ذرا غور فرمائیے۔ صدر اول کے مسلمانوں میں وہ کون تھا جو ہمہ تن اطاعت اور امتثال نہ تھا۔ اطاعت ان کا دین اور اطاعت ان کا ایمان تھا۔ لیکن ایک ایسا وقت بھی آیا جب اطاعت کی اہمیت خاص طور پر ان کے سامنے نمایاں کر کے رکھی گئی۔ بدر کا میدان ہے۔ کفر اپنی پوری قوتوں کے ساتھ ہجوم کر کے مقابلہ پر آ گیا ہے۔ آج جماعت کی موت اور حیات کا دن ہے۔ وہ دن ہے جب حضور سرور کائنات نے جھولی پھیلا کر دعا مانگی ہے کہ اے مولا! اگر آج یہ مٹھی بھر جماعت فاتح و منصور نہ لوٹی تو دنیا میں تیرا نام لینے والا کوئی باقی نہ رہے گا۔ مجاہدین کے شوق شہادت کا یہ عالم کہ اگر تلوار نہیں ملی تو کھجوروں کی ٹہنیاں اور اونٹوں کی پسلیاں لے کر میدان میں آ گئے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے پنجوں کے بل کھڑے ہو ہو کر دکھاتے ہیں کہ ان کا قد چھوٹا نظر نہ آئے اور وہ میدان سے الگ نہ کر دئیے جائیں۔ دونوں صفیں آمنے سامنے ہیں عین اس وقت ارشاد ہوتا ہے کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ ۝ وَمَن يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝ ۸ - ۱۵ - ۱۶

اے ایمان والو۔ جب کفار کے لشکر سے تمہاری مٹھ بھیڑ ہو جائے تو انہیں پیٹھ نہ دکھاؤ۔ اور جو کوئی ایسے موقع پر پیٹھ دکھلائے گا تو سمجھ لو کہ وہ خدا کے غضب میں آ گیا۔ اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہوا۔ اور وہ کیا ہی بری جگہ رہنے کی ہے مگر (ہاں) جو کوئی لڑائی کی مصلحت سے ہٹ جائے۔ یا اپنے کسی گروہ کے پاس جگہ لینی چاہیے (تو اس کا مضائقہ نہیں)

غور فرمایا آپ نے! جب دشمنوں کا مقابلہ ہو۔ میدان کارزار گرم ہو۔ باطل کی قوتیں صف آرا سامنے موجود ہوں۔ تو جو کوئی ایسے میں پیٹھ دکھا جائے۔ اطاعت سے سرتابی اختیار کرے اور میدان سے بھاگ نکلے تو وہ سیدھا جہنم میں جاتا ہے۔ اس کے لئے کوئی معافی نہیں۔ نظرِ رعایت نہیں کہ ایسے وقت میں اطاعت سے انحراف۔ بزدلی یا کمزوری پوری کی پوری قوم کو ہلاکت کے گڑھوں میں دھکیل دیتی ہے۔

اس نظیر کو سامنے رکھیئے اور پھر اپنی آج کی حالت پر غور کیجئے۔ اگر آپ کو چشم بینا عطا ہوئی ہے تو آپ دیکھیں گے کہ کفر و اسلام کا معرکہ حق و باطل کی کشمکش۔ آج بھی بدر و حنین سے کم نہیں۔ کفر کی پوری قوتیں منظم طریق پر یورش

کر کے امنڈ آئی ہیں کہ ہندوستان میں (خاکم بدہن) مسلمان کو مسلمان کی حیثیت میں باقی نہ رہنے دیا جائے۔ بساط سیاست پر گہری سے گہری چالیں چلی جارہی ہیں کہ مسلمان غیر مسلم اکثریت کا غلام بن کر رہے۔ ہر ممکن حربہ استعمال کیا جارہا ہے۔ کہ مسلمان کے جداگانہ تشخص کا نشان تک باقی نہ رہنے پائے۔ ایسے وقت میں اللہ کا ایک بندہ ٹوٹی ہوئی کشتیوں کے بہتے ہوئے متفرق تختوں کو لاکر اکٹھا کرتا ہے اور ادھر ادھر سے جوڑ لگا کر پھر سے کشتی سی شکل پیدا کرتا ہے۔ مخالفتوں کا طوفان ہے کہ چاروں طرف سے امڈا چلا آرہا ہے۔ گرداب بلا ہے کہ کشتی کا گھیرا ڈالے ہوئے ہے۔ بڑی بڑی ہولناک موجیں، خوفناک اژدہوں کا سامنہ کھولے لپکی چلی آرہی ہیں۔ آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہیں۔ تو بر تو تاریکی کا ہجوم ہے۔ چاروں طرف مایوسی ہی مایوسی ہے۔ اس وحشت انگیز اور ہیبت ناک فضا میں اگر کوئی امید کی کرن ہے تو وہ ٹمٹاتا سا دیا۔ جسے ایک مرد قلندر نے دور ساحل کے پاس ایک جھونپڑی میں جلا رکھا ہے۔ نحیف و زار سر پھرا ملاح اپنے مٹھی ہاتھوں سے چپو چلائے جارہا ہے۔ نہ طوفان کی بلا انگیزی اسے ڈرا سکتی ہے نہ ہیبت اور بھیانک موجوں کی ہلاکت خیزی اس میں کوئی گھبراہٹ پیدا کر سکتی ہے۔ اس کا بھروسہ خدا پر۔ نگاہ دور کے ٹمٹاتے چراغ پر اور ہاتھ چپوؤں پر ہیں۔ چپو چلائے جارہا ہے اور اپنے ساتھیوں سے اثر درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہے جارہا ہے کہ اگر تم نے اس وقت چار ہاتھ بھی متحد ہو کر ارد ئے تو بیڑا پار ہے۔ اطاعت ہر وقت ضروری ہے لیکن کہئے کہ اطاعت کی جو اہمیت اس وقت ہے کبھی پھر بھی ہو سکتی ہے۔ یہی وہ وقت ہے جس کے لئے کہا گیا ہے کہ اگر اس وقت تم نے اطاعت سے منہ موڑلیا۔ اگر اس وقت پیٹھ دکھا کر بھاگ گئے۔ تو سیدھے جہنم میں چلے جاؤ گے۔ کہو! اگر ایسے نازک وقت میں ایک اندر ہی اندر کشتی میں سوراخ کئے جارہا ہو اور دوسرا اٹھکر بادبان کا رسہ کاٹ ڈالے تو اس کشتی کا کیا انجام ہوگا! اور جب کشتی ہی نہ رہے گی تو اس سوراخ کرنے والے اور بادبان کو بیکار کرنے والے کا کیا حشر ہوگا!

اس وقت ہندی مسلمانوں پر بڑا نازک وقت آرہا ہے۔ معلوم نہیں اس انقلاب میں زمین کیا پلٹا لینے والی ہے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آگ اور خون کی اس بے محابا بارش کے بعد جب مطلع صاف ہوگا تو انسانوں کے مقدرات کے ستاروں کے مقامات کس طرح بدلے ہوئے ہونگے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کتنی قومیں تباہ ہوں گی اور کتنے تختے نیچے سے اوپر ہو جائیں گے۔ ایسے نازک وقت میں اگر سلامتی کی کوئی راہ ہو سکتی ہے تو وہ اجتماعیت اور اطاعت ہے۔ اس کے سوا کوئی راہ نہیں۔ جو ایک مرکز پر جمع ہو کر ایک کی اطاعت کریں گے بچ جائیں گے۔ جو اس افراتفری میں انفرادی زندگی بسر کریں گے۔ مٹ جائیں گے۔ زمانہ کا ہاتھ کسی کی رعایت نہیں

کرے گا۔ آسمان کا چکر کسی کو مہلت نہیں دے گا۔ اس گرداب بلا میں کشتی وہی پار لگے گی جس کے مسافر ناخدا کا ساتھ دیں گے۔ جو آپس میں لڑتے جھگڑتے رہیں گے اور ناخدا کی اطاعت سے انحراف کریں گے۔ ان کی کشتی کبھی ساحل تک نہ پہنچے گی اور یہ ہو نہیں سکتا کہ کشتی ڈوب جائے اور کشتی والے ساحل تک جا پہنچیں۔ یاد رکھو! ناخدا اپنے لئے کچھ بھی نہیں کہتا۔ وہ اپنی اطاعت اپنی ذات کے مفاد کے لئے نہیں کراتا۔ وہ تمہاری ہی کشتی کی حفاظت کی فکر کر رہا ہے وہ خود تمہاری ہی سلامتی کی تدابیر میں ہلکان ہو رہا ہے۔ اس کی مدد خود تمہاری اپنی مدد ہے۔ اس کی اطاعت میں تمہاری زندگی کا راز پوشیدہ ہے کیا کوئی ہے جو اس سے نصیحت حاصل کرے؟

فھل من مدکر !

عید قرباں

جناب اسدؔ کی وہ نظم جو عید کے دن دہلی ریڈیو سے نشر ہوئی اور جسے باخذ اجازت شائع کیا جاتا ہے :۔

عید کے دن جو مسرّت کی فراوانی ہے — خود فریبی ہے کہ غفلت ہے کہ نادانی ہے

اب مسلمان ہیں اور بے سر و سامانی ہے! — کونسی شے پہ یہ خوش ہیں مجھے حیرانی ہے

زورِ بازو ہے نہ اب قوتِ ایمانی ہے — دل میں موجود فقط ذوقِ تن آسانی ہے

اب کہاں پیشِ نظر آیۂ قرآنی ہے — رہبرِ فکر و عمل خواہشِ نفسانی ہے

کیا قیامت ہے کہ ہر کوششِ جمعیت بھی — آج منجملۂ اسبابِ پریشانی ہے

عید کو ہم نے جو تقریب سمجھ رکھا ہے — حیف ابھی اس کی حقیقت نہیں پہچانی ہے

مرکزِ ملّتِ بیضا ہے سوادِ کعبہ — دین کیا ہے؟ اسی مرکز کی نگہبانی ہے

حرمِ پاک کی تقدیس کو قائم رکھنا — ایک مقصد ہے جو شائستۂ قربانی ہے

مال سے جان سے بڑھ کر ہے ایمان عزیز — اے مسلمان! یہی معنئ قربانی ہے

زندگی بھر کی اطاعت ہی نہایت مشکل — ایک دم جی سے گذرنے میں تو آسانی ہے

رسم ہوتی ہے ادا آج بھی قربانی کی — کونسے دل میں مگر جذبۂ قربانی ہے

اے اسدؔ میں نے تو دنیا میں یہی دیکھا ہے
حاصلِ زیست بہ اندازۂ قربانی ہے

(اسدؔ ملتانی)

ایک معلم کی زندگی

شائع ہو گئی

اس کتاب کو ماسٹر عبدالغفار صاحب مدہولی استاد مدرسہ ابتدائی جامعہ نے بڑی محنت سے مرتب فرمایا ہے۔ یہ محض انکی آپ بیتی ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی ہر لعزیز درسگاہ جامعہ کی دلچسپ اور مکمل تاریخ اور اکیس سال کے تعلیمی تجربوں کا نچوڑ ہے۔ یہ کتاب $\frac{20 \times 30}{16}$ سائز پر دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ ہر ایک جلد پانچسو صفحات کی اور مجلّد ہے۔ جامعہ کی نئی اور پرانی دو درجن تصویریں ہیں خوبصورت گرد پوش نے ظاہری حسن میں نمایاں اضافہ کر دیا ہے۔ مکمل سٹ کی قیمت، جس کی مجموعی ضخامت ایک ہزار صفحات ہے۔ کاغذ کی غیر معمولی گرانی کے باوجود محض پانچ روپئے ہے۔ گو ترتیب کے وقت بچوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے لیکن یقین ہے کہ بڑے بھی پسند کریں گے خصوصاً تعلیمی کام اور تجربہ کرنے والوں کے لئے بڑی دلچسپی کا باعث ہوگی جو جامعہ کے تعلیمی تجربوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی

شاخیں اور ایجنسیاں :-

۱۔ مکتبہ جامعہ، جامع مسجد دہلی ۲۔ مکتبہ جامعہ امین آباد لکھنؤ ۳۔ مکتبہ جامعہ پرنسس بلڈنگ بمبئی
۴۔ کتب خانہ عابد شاپ حیدر آباد دکن ۵۔ سرحد بک ایجنسی بازار قصہ خوانی پشاور؛

رسولی تبلیغ

جناب شمس العلماء حافظ سید محب الحق صاحب مدظلہ العالی

{ شمس العلماء حافظ سید محب الحق صاحب مدظلہ العالی کی ذات گرامی طبقۂ اہل علم میں بالعموم اور حلقۂ طلوع اسلام میں بالخصوص محتاج تعارف نہیں۔ اس کبر سنی کے عالم میں جبکہ عام طور پر چھٹی تک لکھنا بھی دشوار ہو جاتا ہے جناب سید صاحب کی یہ ہمت ان کے قرآن سے عشق کی آئینہ دار ہے۔ طلوع اسلام جناب سید صاحب کی مخلص نوازشات کا بصمیم قلب شکر گذار ہے اور اسے اس سعادت پر بجا ناز ہے۔ خدا کرے کہ ہم اس "پند پیر دانا" پر ٹھنڈے دل سے غور کر سکیں تاکہ یہ ہماری اصلاح کا موجب بن جائے۔ طلوع اسلام }

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إن اريد الا الاصلاح ما استطعت

فرقہ بندی تو ملعون خداوندی ہے یہودیوں کا ابہ الامتیاز۔ لَا تكونوا مِنَ المشركين مِنَ الَّذِينَ فرقوا دِينهم وكانوا شيعًا كل حزبٍ بما لديهم فرحُون ۔ مشرکوں میں نہ ہو جانا، ان میں جنھوں نے فرقہ بندی قائم کی اور وہ گروہ در گروہ ہو گئے اور ہر گروہ اسی فرقہ پرستی پر فرحان وشادان ہے فرقہ بندی تو شرک ٹھہری، اس لئے مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس نافرمانی سے تائب ہوں اور ادخلوا فی السلم کافۃ مسلمانوں کی جماعت میں پاک باطنی سے داخل ہوں یہ فرقہ بندی ہی تھی جس نے یہودیوں کو تباہ اور ملعون کیا۔ یہ فرقہ بندی ہی ہے جو ہر ملک کی تباہی کا، ہر قوم کی تباہی کا، ہر محلہ وشہر کی تباہی کا، ہر خاندان اور انجمنوں کی تباہی کا باعث ہوا کی ہے، اور ہر سلطنت اسی کے ہاتھوں تباہ ہوا کی ہے، اور آج بھی اس کے تماشے دیدنی ہیں۔ متحدہ قوموں کی انجمن آرائی کو دیکھو اور شکست خوردہ قوموں کی گرم بازاری کو دیکھو۔ ان کے یہاں اتحاد کے انجن چل رہے ہیں اور ان کے یہاں تباہی پر تباہی اور مصائب کے زلزلے پر زلزلے آ رہے ہیں۔

جب فرقہ بندی ممنوع خداوندی ہے تو اسے رسول اللہ علیہ الصلواۃ والسلام کس طرح قائم کر سکتے تھے آپ نہ سنی تھے نہ شیعہ نہ اہل حدیث نہ اہل فقہ "أمرت ان اكون من المسلمين" ط صرف مسلمان حنیف تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح ولكن كان حنيفًا مسلمًا۔ اس لئے ان کی امت کا نام بھی خدا نے مسلمان ہی رکھا اور نبی آخر الزماں کی امت کا نام بھی مسلمان ہی "هو سمٰكم المسلمين من قبل وفي هٰذا"

اسی طرح صحابۂ رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی ایک خدا کی محبت میں سرشار، ایک رسول کی اطاعت میں جان نثار، ایک قرآن کے مرکز پر گھومنے والے سارے کے سارے ایک جان ہزاروں قالب سب شیر و شکر، سب بھائی بھائی اور ایک دوسرے کے قوت بازو تھے۔ خدا کی رضا پوری ہوئی۔ ابر رحمت جھوم جھوم کر آیا اور پھوٹ پھوٹ کر برسا۔ دنیا چمنستان خداوندی بن گئی۔

جب فرقہ بندی آئی جس طرح بھی آئی ہو دیکھتے دیکھتے سارا چمن خزاں زدہ ہو گیا۔ سارا پھل زہر اور سارے پھول کانٹے ہو گئے فطال علیھم الامد فقست قلوبھم "امتداد زمانہ سے سارے قلوب سخت ہو گئے، خدا کی عظمت و محبت دلوں سے نسیاً منسیا ہو گئی، رسول سے نسبت ٹوٹ گئی، قرآن جزدانوں میں روپوش ہو گیا، مسلمان قبروں میں جا سوئے، مسلمان بے راہ، بے ہادی، بے رہنما، قافلہ بے سالار، ایسے بے سالار جس کے سالار رہزن، ڈاکہ زن، اپنے گھر کے آپ اجاڑنے والے ہو گئے۔ پھر کیا تھا ادبار کا آتش فشاں پہاڑ پھوٹ پڑا۔ اور تباہی و بربادی کا جھلسا ہوا میدان چھوڑ گیا جو ویرانہ نظروں کے سامنے ہے۔ مسلمان اس کے ماتم کناں اور مرثیہ خواں تو بہت ہیں، مگر ماتم کے سر اور گت اور مرثیہ کی شاعری اور ٹیپ کے بند کی داد دینے میں مشغول اور مصروف ہیں۔ اس کا ہوش اب تک نہ آیا کہ ہم اوٹھے تھے کیوں، اور پڑ گر کر تحت الثریٰ میں پہونچے کیوں کسی نے کچھ سمجھا کسی نے کچھ سمجھا اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ۔

خیر یہ تو فطرت کی رفتار تھی جو ہو کر رہی کل شئ ھالک الا وجھہ ہر شے ہر وقت فنا ہو رہی ہے، ایک حی و قیوم کے سوا حادث کے لئے فنا لازم ہے۔ ہر وقت فنا کا جوار بھاٹا ہے تو ساتھ ہی ساتھ بقا کا دور و تسلسل بھی جاری ہے، یوں ہی اس عالم کا ہر لحظہ ادبار و چڑھاؤ ہوتا رہتا اور یوں ہی ارتقاء کے منازل طے ہوتے رہتے ہیں۔ تبدلات عالم تو ہوتے رہتے ہیں، زمانہ ہر آن ہی بدلتا رہتا ہے مگر زمانہ ہم کو نہیں بدلتا۔ ہم بدل کر زمانہ کو اپنے حسب حال بنا لیتے ہیں۔ جب ہماری چال بدلتی ہے تو ہمارا حال بدلتا ہے اگر ہم پھوٹ کے عذاب سے نجات حاصل کرنا چاہیں تو اس عذاب سے نجات بے توبۂ نصوح کے حاصل نہیں ہو سکتی اس میں شک نہیں کہ ہم میں پھوٹ ہے اور پھوٹ اور فرقہ بندی تو بدیہی خدا کا عذاب ہے قل ھو القادر علیٰ ان یبعث علیکم عذاباً من فوقکم او من تحت ارجلکم او یلبسکم شیعاً و یذیق بعضکم بأس بعض اے رسول کہہ دو کہ خدا قادر ہے کہ تم پر عذاب اوپر سے بھیجے یا تم کو گروہ در گروہ کر دے اور تم کو آپس کی لڑائی کا مزہ چکھائے۔ یہ فرقہ بندی تو صریح کھلا کھلا خدا کا عذاب ہے۔ طرفہ تر یہ کہ مسلمان اسی عذاب پر خوش اور اسی پرست ہیں کل حزب بما لدیھم فرحون۔

جیسے جہنمی بھی جہنم میں آخرکار اسی عذاب پر راضی اور خوش رہ کر فنا ہو جائیں گے انھوں نے بھی اگر ہوش نہ کیا اور پھوٹ اور فرقہ بندی کے ویسے ہی دلدادہ رہے' تو فنا ہونے والی قوم کی طرح یہ بھی اس دنیا سے ایک دن فنا ہو جائیں گے۔

مسلمانوں نے اتنا ہوش تو کیا ہے کہ فرقہ بندی اور پھوٹ سے سب نالاں ہیں کوئی جماعت نہیں جہاں اس کی فریاد نہ ہو۔ مگر اس جہنمی گڑھے سے نکلنے کے لئے کسی نے بھی خدائی راہ اور رسالت کی روش اختیار نہ کی۔ سب نفسانی خواہشوں کے بادلے اور ہوا و ہوس کے متوالے ہیں۔ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ہدایت ربانی چھوڑ کر جس نے خواہش نفسانی پر اپنی رفتار قائم کی اس سے گمراہ تر کون ؟

اسی کو مجھے بیان کرنا ہے۔ اصلاح نفس اور اصلاح حال کے لئے میں تمہارا مواجہہ خدا و رسول کی طرف پھیرنا چاہتا ہوں کہ تمہاری گردش و روش صحیح اترے کہ کامیابی کی راہ یہی ہے۔

خدا نے فرمایا یا ایھا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ" اے رسول قرآن مجید کی تبلیغ کرتے رہو ما انزل اللہ قرآن کے سوا اور کچھ نہیں۔ اسی کی تبلیغ فرض ہوئی اور اسی کی تبلیغ آپ نے فرمائی اور اسی کی تعمیل میں صحابہؓ لگے رہے اور خدا اور اس کے کلام ہی کو کافی سمجھا۔" الیس اللہ بکاف عبدہٗ" ۔کیا اللہ اپنے بندے کو کافی نہیں اسی کو یوں بھی فرمایا" امرتُ ان اکون من المسلمین وان اَتلوا القرآن" میں مامور ہوں کہ میں فرمانبرداروں میں ہو ؤں اور قرآن پڑھ پڑھ کر تبلیغ کرتا ہوں۔ یہ تو خدمت رسالت ادا کی گئی۔ پھر آپ بشیر و نذیر تھے فرمان پر چلنے والوں کو بشارت دینے والے' اور نافرمانوں کو خدا کے عذاب سے ڈرانے والے" تو اس کی نسبت ارشاد ہوا" فانما یسرناہ بلسانک لتبشر بہ المتقین وتنذر بہ قوماً لدّاً" ہم نے قرآن کو تمہاری زبان میں آسان بنایا ہے (کہ ہر کوئی سمجھے) تاکہ تم قرآن سے متقیوں کو بشارت دو اور قرآن ہی سے نافرمانوں کو ڈراؤ۔ آپ نے عمر بھر اس کی تعمیل فرماتے رہے' اور اسی سے ہدایت پانے والے ہدایت پاتے رہے' اور یوں مسلمانوں نے فوز و فلاح سے دونوں جہان میں کامیابی حاصل کی۔ اس دنیا کی کامیابی تو سب نے دیکھی اور اس دنیا کی کامیابی بھی اس دنیا میں سب دیکھیں گے۔

سمجھنے اور غور کرنے کی جگہ یہ ہے جدھر میں متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کی تبلیغ سے دنیا کی کیوں اور کس طرح کایا پلٹ ہوگئی اور آج کل کی درس و تدریس مواعظ و پند بکچر کیوں بے نور بے کار تصنیع اوقات شیطانی مکر اس اور لایعنی و بے نتیجہ حرکات ہیں اس کی وجہ کیا ؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب مسلمانوں نے قرآن سے روگردانی کی، اور اس کو نذر و نیاز کی شیرینی بنالیا، اور روایتوں کی طرف دل کھول کے ٹوٹ پڑے تو بادشاہوں نے اسے اپنا مشین گن بنالیا، اور اسی کے سہارے کامیابی کی راہ نکالی، اور ان کے تو پچیوں کو ہر طرح کی نوازشوں سے نوازا، تو بڑے بڑے علماء پیدا ہوگئے جنھوں نے فرقہ بندیوں کا باغ لگایا۔ اور فرقہ بندیوں کے یہ ال پھوٹ کے درختوں کو ہوس، خود غرضیوں اور نفسانی خواہشات کے جذبات کے نجس پانیوں سے سینچتے رہے۔ کچھ دن خدا نے مہلت دی، آخر عذاب نے آگھیرا کہ اب اسلامی دنیا میں ہر طرف تلاطم ہے۔ مسلمان کس حال کو پہونچے ہیں کا رونا بہتیرے رو چکے۔ اس رونے دھونے کا نتیجہ بھی کچھ نہ نکلا۔ اگلوں کے کارنامے کہانی بن گئے، وعظوں اور پس میں شیریں کلامی اور خوش بیانی کے لئے مواد اور ذخیرے مل گئے۔ لوگوں نے واقعات گذشتہ سے عبرت و نصیحت حاصل نہیں کی الٹے پست ہمتی کے جال میں پھنسکر مایوسیوں کے شکار ہوگئے۔ پست ہمتی آئی تو بے حیائی بھی آئی بے غیرتی بھی آئی، آرام طلبی بھی آئی، اور خود غرضی بھی آئی کہ اپنے کو جماعت سے مطلب نہیں۔ جماعت سے ٹوٹے تو انفرادی زندگی تو قبر کی زندگی ہے یا جنگل کی زندگی کہ حشرات الارض کی دہشت انگیزی کے سوا کچھ نہیں۔ حال دیکھو تو بدحال، دل بے چین، زبان بے باک، کمزور کون تو مسلمان، بے ایمان کون تو مسلمان، پھوٹ کا پھریرا اڑانے والا کون تو مسلمان سارے عیوب کس میں تو مسلمان میں۔ گھر اجڑا ہوا کس کا تو مسلمانوں کا، منافق کون تو مسلمان، کس بے حیائی اور بے شرمی سے گھر میں اسٹیج پر، ممبروں پر، اخباروں میں، رسالوں میں یہ رونا فخریہ رویا جاتا ہے۔

مذہب گیا تو مذہب کے ساتھ سیاست بھی رخصت ہوئی کیونکہ مسلمانوں کی مذہبی سیاست وہی مذہب یعنی قرآن جب قرآن نہیں، تو نہ مذہب نہ سیاست۔ مسلمان کیا تھے اس پر فخر بہت کچھ کیا جاچکا۔ اور پھر کیا سے کیا ہوگئے اس کا رونا بھی بہت کچھ رویا جاچکا گذشتہ پر جبر کیا، مستقبل خطرناک ہے اس لئے حال کو دیکھنا ہے کہ موجودہ حال کیا ہے اسی کا مجھے ہوش دلانا ہے کہ صراط مستقیم سے لغزشیں دور ہوں اور کامیابی کی منزل تک رسائی ہوسکے۔

واقعات سے ڈنڈے مار مار کر مسلمانوں کو بیدار تو کیا، یہ بیدار بھی ہوئے مگر کا بوسی بیداری بے خبری میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، گویا بہت کچھ کر رہے ہیں مگر نتیجہ سے بے خبر اور خدا سے بے لگاؤ خواب میں چل رہے ہیں مگر وہیں کے وہیں۔

علماء اور ان کی جمعیت یعنی جمعیت العلماء مدعی اس کی کہ قوم کی کشتی کے ناخدا ہم۔ اسلام کے چاند تارے ہم ہم مقدس گروہ علماء کے۔ ہمارے سوا لیڈری کا استحقاق کسے۔ جن کے اساتذہ کا خیال یہ ہو کہ صداقت تمام مذاہب میں ایک جیسی ہی۔ تو اول صداقت توحید کی تو توحید اور بت پرستی گئو پرستی وطن پرستی، سب ایک ہے۔ ان کو

لوگوں نے خدا کی آیتوں سے ڈرایا مگر انما تنذر الذین یخشون ربھم بالغیب " یہاں خشیت کہاں؟ نہ دین تعلیمیں ہیں نہ اعمال ہیں کیونکہ خدا نے قرآن کو نور مبین کہا تھا مگر ان کو یہ روشنی دھندلی دکھائی دی۔ یہ چلے گاندھی جی کی روشنی سے اپنی دیا جلانے۔ جو ٹمٹما رہی ہے۔ خدا رحم کرے۔ اور ان کو اپنے رحم سے بخشدے۔

دوسرے ہمارے علمی دوست مولانا مودودی صاحب ہیں باہمہ قابلیت آپ اپنی مسجد الگ بنانے میں مصروف ہیں اور اپنی سیاست الگ بنیادوں پر قائم کرنا چاہتے ہیں یہ روش بھی رسولی تبلیغ نہیں جس کو میں آخر میں بیان کروں گا جو اس تحریر کا موضوع ہی ہے۔

تیسرے اصلاحی صاحب ہیں۔ آپ تو ہمارے دوست مولانا حمید الدین علیہ الرحمۃ کے جانشین ہیں۔ مولانا حمید الدین صاحب سے اور مجھ سے حیدرآباد میں صحبتیں رہیں۔ منہاج الحق مجھ سے چھین کر زبردستی انھوں نے مطبع میں بھیجا اور شیدا ہوئے قرآن کی نسبت نے ہم دونوں کو شیر و شکر کیا تھا۔ وہ اپنے قرآن کے جلسہ میں ہم کو لے گئے۔ اور ہر ملاقات میں یہی قرآن رہتا۔ اسی تفسیر لکھنے کی وجہ سے انھوں نے ایسی عزت اور اتنے مشاہرہ کی جگہ چھوڑی۔ قرآن کی خدمت کرتے رہے۔ قرآن کے متعدد جلسے قائم کئے۔ آج فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر مقتدر میں مہمان ہوں گے۔ ان کے جانشین کو بھی قرآن ہی کی خدمت میں لگنا تھا اور اسی رسولی تبلیغ کا غلغلہ بلند کرنا تھا۔ مگر افسوس ہے میں نے چند ہی تحریریں اصلاحی صاحب کی دیکھی ہیں وہ علماء کا اوٹھتا ہوا بازار پھر جانا چاہتے ہیں۔ اور قرآن کو وید بنا کر برہمنوں کے حوالہ کرنا چاہتے ہیں۔ باوجودیکہ اسی بدعت کا نتیجہ بھگتتے ہوئے قوم کو دیکھ رہے ہیں۔ اس کا ماتم بھی کر رہے ہیں اور پھر اسی میں مبتلا ہیں۔ مولوی حمید الدین علیہ الرحمۃ کا حق ادا کر رہا ہوں کہ مولانا کو توجہ دلا رہا ہوں کہ اتباع ہوا و ہوس سے محترز ہو کر رسولی تبلیغ میں لگ جائیں کہ یہی خدا کی مرضی۔ یہی رسول کی مرضی۔ یہی خدا کا گروہ ہے اور ان جندنا لھم الغلبون ط

چوتھے سیرت نبی کو بھی مجھے خاص کر متوجہ کرنا ہے کیونکہ یہ علمی ادارہ ہے۔ علمی کارنامے اس کے ہیں مگر افسوس رسولی تبلیغ کے سایہ میں نہیں۔ کاش ان کی رسولی تبلیغ ہوتی بلا شائبہ نفس وہوا تو رنگ لاتی مگر جو کچھ کیا گیا اور کیا جا رہا ہے اس کا رنگ تو یہ ہے۔

۱۔ اتنی تحریریں اور اس قدر پمفلٹ اور اس قدر کتابیں ہزاروں ہزار مختلف زبانوں میں مختلف ملکوں میں شائع کی گئیں جن کا اعلان ہر پرچہ اور ہر رسالہ میں ہوا کرتا ہے۔ اس درجہ شدید اعلان ہی اس کا مظاہرہ ہے کہ آؤ ہمارے جھنڈے تلے آؤ۔ اگر اس میں اخلاص ہوتا تو ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ " ہوتا رسولی تبلیغ ہوتی تو

آج کچھ نہ کچھ تو کامیابی ہوتی۔ اور اسلام پھیل کر رہتا۔ مگر تمام وہی روز اول۔

۲۔ دوسری سیرت کمیٹیاں ہیں جس کے معنی ہیں رسالت کی تبلیغ۔ مگر چونکہ رسولی تبلیغ نہیں اس لئے نتیجہ کیا نکلا کہ تمام مولود خوانی ہوتی ہے۔ غلط سلط روایتیں پڑھی جاتی ہیں ایسی ایسی روایتیں جو اسلام پر داغ اور رسول پر حرف لانے والی ہیں بلا جھجک برسر ممبر بیان کی جاتی ہیں پھر تزک و احتشام سے اک نیا بتوارقائم کرتا ہے اس میں اسراف کے تماشے بھی۔ جلسہ وجلوس کی رنگینیاں بھی۔ اس لئے جس کام میں اخلاص نہیں وہ ناکام اور بے نور۔

۳۔ تیسری چیز درس قرآن جاری کیا گیا۔ خیال نہایت مقدس کام نہایت مبارک۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ نفسانیت کے چھینٹوں سے وہ بھی پاک نہیں۔ میں نے پہلا درس یعنی ہ روالا پورا دیکھا ہے ہر جگہ اس کی کمال کوشش کی گئی ہے کہ مسلمانوں اپنے کو یہود سے بدتر ملعون سمجھ کر کبھی اٹھنے والے نہیں۔ یہ ہمت کی کھا جانے والی ہوش کو بے ہوش کرنے والی روش ہے ہر جگہ اغیار کے مقابلہ میں مسلمانوں پر تیر چلانا رسولی تبلیغ کی شان نہیں اس پر مستزاد یہ کہ اور سب باطل فساد انگیز اور ناکام ہیں میری یا میرے فرقہ کی روش ہی کامیاب بنانے والی ہے۔ درس میں بھی اور اخبار میں بھی مسلم لیگ پر اعتراض کی بوچھاڑ اور حملہ کے وار بھی اور پھر خود مسلم لیگی بھی۔ یہ اگر اخلاص سے ہوتا تو مخلصانہ خطیں یا خاموش تحریریں ان کو ہوشیار کرنا چاہتا تھا کہ وہ اپنے اصول پر رہتے یا ان کے اصول کو تسلیم کرتے۔ مگر لگاتار یہ حملہ ہرگز مبنی بر اخلاص نہیں ہو سکتا پھر جہاں اخلاص نہیں وہاں اسلامی اصول سے بحث نہیں۔ اسی لئے سیرت اور درس سے نہ ایک مسلمان مسلمان ہوا نہ ایک کافر کفر سے تائب ہوا۔

۴۔ چوتھی چیز ادھر اؤنی میں ادارہ تبلیغ قائم کیا ہے اس میں تبلیغ کے لئے زکوٰۃ و صدقات کا فنڈ قائم کیا گیا ہے۔ نہایت مبارک کام نہایت مبارک خیال۔ اس میں شک نہیں مگر پوچھنا یہ ہے کہ آیا امارت شرعیہ بہار جیسے مبلغ جائینگے کہ چندے لائیں زکوٰۃ صدقات لائیں اور امرا اور مریدوں کے یہاں دعوتیں کھا کھا کے آئیں، یا کہیں سے مبلغ تالیف کئے جائینگے پھر کس فرقہ کی تبلیغ ہوگی۔ اگر حنفی بنے تب کافر، اہل حدیث بنے تب کافر، سنی بنے تب کافر، شیعہ بنے تب کافر اور سینکڑوں فرقوں کی گواہی ہر فرقہ کے کافر ہونے پر ذخیروں موجود پھر سیاسیات کی رو سے جناح کو مانا تب کافر کیونکہ جناح درسی عالم نہیں مسلم لیگی بنے تب کافر، علامہ مشرقی کی تعریف کی یا نام لیا تب کافر، خاکسار بنے تب کافر۔ ۴۰ برس کی عمر ہوئی کفر کی سی سستی چیز میں نے علماء کے بازار میں بکتے نہیں دیکھی۔ دو روپئے کا کفر پانچ روپئے کا کفر، اور مفت کا کفر بھی بلا قیمت۔

بھائیو! میں آپ لوگوں کو الگ الگ متوجہ کروں تو اس کے لئے نہ میرے پاس دفتر اور نہ اس پیری میں

اس کی صلاحیت۔ اس لئے میں نے اس تحریر میں آپ لوگوں کو للٰہ توجہ دلائی ہے بل الانسان علیٰ نفسہٖ بصیرۃ ولو القیٰ معاذیرہ ۰ انسان اپنے حال کا خوب دانا و بینا ہے گرچہ بہانے کھڑے کرے۔ آپ اپنا محاسبہ فرمائیں "ولتنظر نفس ما قدمت لغد" محاسبہ تو فرض ہے۔ اگر آپ کو میرے اس لکھنے سے کچھ گزند پہونچے تو سمجھ لیجئیگا کہ ایک جاہل نے لکھا ہے کیونکہ مجھے اپنی جہالت کا قطعی علم ہے اور علم صحیح ہے اور اگر خدا کے حضور میں محاسبہ لینے سے میرے لکھنے کو اسلامی نقطۂ نگاہ سے اخلاص و محبت پر مبنی سمجھیں تو خدا کا شکر کریں کہ خدا نے کسی کو آپ کے ہوشیار کرنے کو بھیجا وہ جاہل ہی سہی۔ اور اس ہوشیاری کے بعد ایک اتحاد میں منسلک ہو کر اسلامی یا رسولی تبلیغ میں لگ جائیں۔

رسولی تبلیغ

رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تبلیغ کیا تھی کس خدائی اصول پر تھی جس کا تخم ریت اور پہاڑ پر بویا گیا اور ایسا پھول پھل لایا جس کا پھول بھی بے مثل اور جس کا پھل بھی بے مثال۔ ریتیلے دماغ خراد پر چڑھے تو چمک دمک میں ہیرے کو مات کیا۔ اور پہاڑ و پتھر جیسے قلوب پانی ہو ہو کر معرفت کے چشمے بن گئے۔ دنیا کے دل و دماغ کی کایا پلٹ ہو گئی کہ دنیا ہی بدل گئی۔ دنیا کے خطرناک جنگل چمنستان بن گئے۔ دل خدائے وحدہٗ کی طرف ہو گئے۔ دماغ کی رفتار لاشریک لہٗ کی جانب ہو گئی۔ آنکھیں خدا اور اس کی خدائی کو دیکھنے لگیں کان اسی کی طرف لگ گئے۔ ہوش و حواس کی نسبت خدا کی طرف جٹ گئی۔ مقصود ایک ہو گیا مرکز عمل ایک ہو گیا "قل ان صلوٰتی ونسکی و محیای ومماتی للہ رب العٰلمین ۰" کہدو اے رسول! کہ میری نماز اور میری عبادتیں بلکہ حیات و موت تک اللہ رب العلمین کے لئے ہو گئی۔ زندگی پرامن ہو گئی۔ فساد و عناد، دشمنی اور انتشار حال کافور ہو گئے۔ دنیا ٹھنڈی چھاؤں میں بسر ہونے لگی لقاء رب کی منزل قریب تر ہو گئی۔ جب چال یوں بدلی تو حال بھی دیکھتے دیکھتے یوں بدلا کہ ایک پاؤں عرب میں تو ایک پاؤں چین میں۔ ایک اس دنیا میں ایک اس دنیا میں۔ یہ کیونکر ہوا؟ کس طرح ہوا؟ اس کو سوچو اور سمجھو۔ اس کا سراغ تم کو قرآن میں ملے گا اور صرف قرآن میں اگر اسی چال پر چلو گے تو تمہاری منزل اور تمہارا مقام بھی وہی ہوگا۔

آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام رسول تھے اور آخری رسول۔ خدا کا پیغام اور آخری پیغام خدا کے بندوں کو پہونچانے آئے تھے اور بہ احسن وجوہ پہونچا گئے جو آج تک ویسا ہی موجود ہے جیسا آپ نے دیا تھا خدا کا فرمان ہوا "یاایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہٗ اے رسول! خدا کی

طرف سے جو کچھ تم پر نازل کیا گیا ہے اس کی تبلیغ کرتے رہو اگر ایسا نہ کیا تو خدا کی رسالت کی تبلیغ تم نے نہیں کی۔
نازل ہوا صرف قرآن' اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ تو آپ نے ساری عمر قرآن ہی تبلیغ فرمایا' اس کے سوا کچھ نہیں
پھر کس طرح تبلیغ کرد! اس کو بھی فرما دیا گیا امرت ان اکون من المسلمین و ان اتلوا القرآن۔ میں امور
ہوں کہ میں فرمانبرداروں میں ہوں اور قرآن پڑھ پڑھ کر سنایا کروں۔ آپ نے اس فرمان کی کما حقہ تعمیل فرمائی
اور قرآن سنا سنا کر لوگوں کو قرآن و رسالت کی تبلیغ فرماتے رہے قرآن عربی میں۔ قوم کی عربی زبان میں نازل
ہوا ہے بلسان عربی مبین۔ قوم عرب تھی عربی اس کی زبان ہی تھی اور ترقی یافتہ زبان۔ لوگ سنتے تھے سمجھتے تھے
مسلمان ہوتے اور فائز المرام ہوتے تھے۔

آج خدا وہی' اس کا کلام وہی' آج ایسا کیوں نہیں ہوتا؟ وہی رسالت اور وہی صاحب رسل موجود۔ آج اس کا نور کیوں
دھندلکے میں پڑ گیا؟ اس کی وجہ صاف اور کھلی کھلی یہ ہے کہ قرآن سے قوم نے منہ پھیر لیا' آنکھیں پھیر لیں۔ قرآن
پنڈتوں کے حوالہ ہوا اور اس کی آیتیں منتر بنیں اس کے اوراق فرقوں میں بانٹ دیئے گئے اور وہ مباحث کے
بتے' تاش کے برج کا کھیل بنے۔ ارجیت کی بازی لگی۔ اس ادھیڑ بن میں قوم کی نسبت خدا سے بالکل ٹوٹ
گئی اور ما سوا سے جڑی۔ علماء کی نسبت راویوں اور روایتوں سے جڑی۔ سارے راوی پیغمبر کے برابر اور
سب کی روایتیں کالوحی اور قرآن کا نعم البدل سمجھی گئیں یہ تو احبار کا حال ہوا اور رہبان و مشائخین کی نسبت پیر فقیر
سے جڑی اور ان کے مکتوبات و ملفوظات سے۔ یہ طالبین خدا کی جماعت جن کا اصل اصول قطع ما سوا قرار پایا تھا
وہ قطع نسبت الٰہی اور حب ما سوا میں پڑ کر طالب جاہ و خانوادہ ہو گئے۔ اور خدا کے نہیں لکیر کے فقیر بن گئے
اور مریدوں کے قدس سرہٗ کے تمغے کو الٰہی تمغہ سمجھا۔ سب نے خدا و رسول اور ما ارسل کی نسبت توڑ دی اس
لئے توحید کی جگہ شرک نے لے لی۔ کہئے تو غرور سننے کی اجازت نہیں دیتا۔ سمجھائیے تو پھولا ہوا نفس برداشت
نہیں کر سکتا۔

غرض قوم کا کلمہ طیبہ برا یمان طوطوں کا رٹا یا ہوا کلمہ ہو گیا۔ خدا کی دی ہوئی شریعت کہ شرع لکم من الدین
ما وصی بہ نوحا والذی اوحینا الیک: خدا نے تمہارے لئے دین وہی شریعت بنا دی ہے جس کا
حکم نوح کو دیا تھا اور تمہاری طرف وحی کیا گیا۔ ہاں تو وہ خدا کی دی ہوئی شریعت اٹھا دی گئی اور اس کی جگہ
انسانی شریعت نے لے لی۔ اب حکم قرآن سے نہیں دیا جاتا۔ انسانی شریعت' انسانی فتاووں سے دیا جاتا
ہے۔ باوجودیکہ حکم تھا فاحکم بینھم بما انزل اللہ قرآن سے حکم دیا کرو ان الحکم الا اللہ حرف غلط کی طرح

مٹا دیا گیا اور اس کی جگہ سلاطین نے اماموں نے اور علماء نے لے لی۔

جب قرآن کلام اللہ نہ رہا جب مسلمانوں نے اس سے ناک بھوں چڑھایا۔ جب اس کو ناقص سمجھکر درس وتدریس سے نکالا۔ جب اس کی تبلیغ یعنی رسولی تبلیغ بند کی گئی تو قرآنی نور جو سینکڑوں پردوں میں چھپایا گیا ہو کیونکر چمکے۔

یہ تو ظاہری تبلیغ کا حال ہے اور حقیقی تبلیغ کا تو وجود ہی نہیں۔ کیونکہ ایمان ہے تو منہ بولا' یقین ہے تو افواہی۔ ان باپ سنا سنایا۔ ایمان ہوتا تو محبت لازمی تھی "الَّذِيْنَ آمَنُوا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ ط" مومنوں کو تو اللہ کی محبت نہایت ہی شدید ہوتی ہے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا ط مومن تو وہ ہیں کہ جب خدا کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں اور جب خدا کی آیتیں سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے لیکن ان کا حال یہ ہے اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ جب خدا کا ذکر کیا جائے ان کے دل پریشان ہو جاتے ہیں اور جب ماسوا کا ذکر چھیڑ دیجئے تو وہ خوش ہو جاتے ہیں' محبت کا تو نام نہیں اور یہی خدائی محبت سارے خزائن کی کنجی۔ مولانا روم نے سچ کہا ہے ؎

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما　　　اے طبیب جملہ علتہائے ما

یہی محبت تو سب کچھ ہے جو ٹکے مول بک گئی۔ اور اس کی جگہ ماسوا دیوتاؤں نے لے لی۔ خدا اور رسول نے ہوشیار کر دیا تھا قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ" اے رسول منادی کر دو کہ اگر تمہارے باپ' بیٹے' بھائی بیبیاں' اقربا' مال جو تم نے جمع کر رکھا ہے تجارت جس کے کساد بازاری سے ڈرتے رہتے (یعنی دنیا کی سب چیزیں) اگر تم کو اللہ سے اس کے رسول سے اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہیں تو منتظر رہو کہ خدا اپنا عذاب بھیجے جب یہ پاک محبت ہی سرے سے غائب ہو گئی تو عذاب خداوندی کے منتظر رہو۔ مسلمانوں نے انتظار کیا اور عذاب آکر رہا کہ خدائی مرکز چھوٹ گیا اور فرقہ بندی اور پھوٹ کے جہنمی گڑھے میں گر پڑے اور پڑے چلا رہے ہیں مگر سنتا کون ہے۔

رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو قرآن پڑھ پڑھ کر سنایا وہ اسی لئے کہ بندوں کے دل خدا کی محبت سے گرما جائیں جو ماسوا کی محبت سے پاک ہو۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ط کیا لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ یہ کہدیا کہ ہم ایمان لے آئے اور وہ چھوڑ دئے جائیں گے اور ان کا امتحان نہ لیا جائے گا۔ جہاد کا میدان دار الامتحان مقرر ہوا۔ قوم نے سر کٹا کر ایمان کا امتحان پاس کیا۔ بغیر سان پر چڑھائے تلوار تلوار نہیں ہوتی۔ بغیر امتحان

دے ڈگری نہیں ملتی صرف زبانی جمع خرچ تو کبر مقتاً عند اللہ ہے۔ خدا کو بنہایت ناپسندیدہ۔ صرف آرزو کرنے سے جنت کے دروازے نہیں کھلنے کے ام للانسان ما تمنیٰ کیا جو آرزو کرے وہ ان کو مل جاتا ہے نہیں ہرگز نہیں۔ بغیر جان ومال کی قربانی دئے جنت کے دروازے نہیں کھلنے کے۔

دنیا میں جو اللہ اللہ کا غلغلہ بلند ہوا وہ قرآن ہی کی تبلیغ سے۔ قوم میں جو خدا خدا کی ہوا بھری وہ قرآن ہی کی تبلیغ سے۔ کیونکہ قرآن کریم میں جس مضمون کا بھی بیان ہو۔ احکام وہدایات ہوں، تاریخ وقصص ہوں، تخلیق عالم یا تخلیق انسان کا بیان ہو، تبشیر ہو، تنذیر ہو، غرض جو کچھ بھی ہو، سب کے اول میں، یا وسط میں یا آخر میں خدا نے اپنی عظمت وجلالت اپنے صفات بے کیف کا اظہار کیا ہے تاکہ جو دل ودماغ ادھر توجہ کرے وہ اس کی عظمت وجلالت سے بھر جائے۔ سارے عالم پر اور خود انسان پر اپنے احسانات کا جو سمندر بہا دیا ہے کہ اس کی ہستی، اس کی ہستی کی حفاظت اس کی ساری ضرورت کی چیزیں خدا کی بنائی ہوئی، خدا کی عطا کی ہوئی، اسی کی حفاظت سے محفوظ ہیں۔ ہر ہر قدم پر اتنے احسانات اسی لئے بیان کئے گئے ہیں کہ انسان کا دل ودماغ اس کے تشکر، اوسکی احسان مندی، اس کی محبت سے لبریز ہو جائے۔ یہ سب کچھ اسی کے بھلے کو تھا تاکہ اس کا نصب العین اور مرکز عمل خدا ہو جائے رَبِّ اَوْزِعْنِیْ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْکَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔ اے میرے رب مجھے توفیق دے کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کروں کہ جو تو نے مجھے اور میرے ماں باپ کو عنایت کی ہیں اور ایسے عمل کی بھی توفیق دے کہ جس سے تو راضی رہے اور میری اولاد کو میرے لئے ٹھیک کردے میں تیری طرف رجوع ہوا، اور میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔

اے بھائیو! تمہارا کیا حال ہو گیا؟ اک ذرا سا کوئی احسان کرتا ہے جو خدا ہی کے حکم سے کرتا ہے۔ اس محسن کو تم حقیقی محسن سمجھ کر اس کے لئے تم جان دینے اور قربان ہونے کو کھڑے ہو جاتے ہو، اور خدا جو حقیقی محسن ہے جس کے اتنے بڑے بڑے احسانات ہیں کہ تم گن نہیں سکتے آنکھ ناک، کان، صورت، شکل، عقل سمجھ بلکہ تمہاری ہستی بھی سب اسی کی دی ہوئی اور رات اور دن سوتے جاگتے اونکی محافظ بھی، ان کی تمہارے یہاں کوئی قدر وقیمت نہیں اور ایسے محسن کی ذرہ محبت نہیں کیونکہ تمہارے دل ودماغ میں خدا کی جگہ نہیں رہی۔ دل ہزاروں بتوں کا مندر، دماغ ہزاروں دیوتاؤں کا معبد بن گیا ہے۔ اس پر کہتے ہو اپنے کو مسلمان، اور سارا قرآن ماسوا کی بت شکنی سے بھرا ہوا۔ ہر آیت اور ہر آیت کا آخر ملکڑہ خدا کی طرف بلا رہا ہے مگر تم اس سے منہ پھیرے ہوئے۔ قرآن کا ہر حکم اور ہر ہدایت تمہارے بھلے کے لئے ہے کہ تم اعمال کی دنیا میں ہو، سارے اعمال کرو،

مگر ہدایت کے مطابق حدود کے اندر کونوا ربّانیین بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون : اللہ والے ہو کتاب اللہ کے مطابق۔ اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ خدا مرکز عمل ہو اور تمہارے اعمال دائرے کی طرح اسی مرکز پر گھوا کریں اور تمہارا حال ہو جائے ان صلاتی و نسکی ومحیای ومماتی للّٰہ رب العٰلمین ۔ ہماری حیات ، موت تک سب اللہ رب العلمین کے لئے ہے ۔

ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تبلیغ قرآن کی فرمائی تو اس کا نتیجہ کیا ہوا کہ قوم کے دل میں عظمت و جلالت کبریائی گھر کر گئی ، دل محبت کی گرمی سے اور جوش و ولولے سے لبریز ہو گیا ۔ ایمان کامل ہوا ، اسلام شرک کی چھینٹ سے پاک ہوا سب مسلمان حنیف ہو گئے دین خالص ہو گیا ، اس سے ان میں اخلاص آیا ، نفسانیت گئی ، اخوت آئی عداوت گئی آپس کی ہمدردی آئی پھوٹ غائب ہو گئی ، اتحاد آیا ، انتشار گرد و غبار بن کر منتشر ہو گیا ، جب عمل صالح نے قدم جمایا تو ان الذین آمنوا وعملوا الصٰلحٰت سیجعل لھم الرحمٰن ودّا ؕ بلاشبہ جو ایمان لائے اور انھوں نے عمل صالح کئے تو ان کو خدائے رحمٰن نے مودت عنایت کی۔ مودت پرورش پاکر محبت ہوئی ۔ جب خدا کی محبت ملی تو سب کچھ مل گیا ۔ محبت گرمائی تو محبوب کے نام پر سر کٹانے کا ولولہ پیدا ہوا ۔ جب جہاد کا وقت آیا تو رگِ جان کے خون سے دستاویز محبت پر مہر کی ۔ شہادت کا خلعت ملا ، فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر ، قرب میں جگہ پائی "وجوہ یومئذ ناضرۃ الیٰ ربھا ناظرۃ" وہ خدا کے ہوئے خدا بھی ان کا ہو گیا ، خدا کی محبت غالب آئی ، اسوا کی محبت مغلوب ہوئی ، دل سے اسوا کو نکالا تو اسوا نے قدموں تلے سر رکھا جب وہ خدا کے ہو گئے تو خدائی ان کی ہو گئی ۔ جب محبت کا چاند طلوع ہوا تو صفات کے تارے چمک اٹھے دنیا خدائی نور سے جگمگا اٹھی ۔ دنیا والوں نے ان کے آگے سر جھکایا سلطنتیں محکوم اور غلام بن کر قدم چومنے آئیں ، خلافت کا تاج سر پر رکھا گیا یہ تھی رسولی تبلیغ یہ تھی قرآنی تبلیغ ۔ یعنی یہ تھی خدائی تبلیغ ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہؓ سلطنت و خلافت کے طالب نہ ہوئے نہ اس کے پیچھے دیوانہ ہوئے نہ اس کے لئے آپس میں دین نہ اس کے پیچھے پڑے ۔ خدائی نسبت کو بے جگہ نہ ہونے دیا ۔ طلب کی راہ کھولی نہ کی ۔ مگر یہ دکھا دیا کہ اسلام محکومی کا مذہب نہیں مسلمان صرف خدا کا محکوم کسی دوسرے کا محکوم نہیں ۔ خلافت تو ایسی کی ۔ مگر یہ طالب خلافت نہیں ہوتا ۔ اسلام ہی کے صفات سلطانی اور حکمرانی کے صفات ہیں ۔ خالص مسلمان ہو جاؤ اسلامی صفات میں رنگ جاؤ تو خلافت تو دست بستہ کھڑی ہے کیونکہ جہاد فی سبیل اللہ اور جہاد کی تیاری کا نصب العین تو اطاعت قرآن ہی میں داخل ہے مگر عمل صالح بے خدا کی خالص محبت کے محال اگر نہیں تو دشوار تر ضرور ہے ۔ بغیر حقیقی اسلام کے بغیر خالص ایمان کے بغیر خدا کی مقدس اور منزہ محبت کے ۔ بغیر یحبھم ویحبونہٗ کے جلوہ آرا ہوئے بغیر اسلام و ایمان کا ثبوت دئے اور بغیر مالی و جانی قربانی کے اتقا کی بے پناہ خدائی قوت

نہیں آسکتی اور جہاد کا میدان کارزار جیتا نہیں جاسکتا۔ اور جب تک یہ نہ ہو غلامی کا طوق و سلاسل نہیں دور ہوسکتا اور محکومی کی پھانس نہیں کاٹی جاسکتی۔ اے بھائیو! ہوا و ہوس، چکنی چپڑی باتوں، دلائل و براہان، اور آرزو و تمنا سے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی کیا انسان جو آرزو تمنا کرے اسے مل جائے گا۔ حاشا نہیں۔

عمل درکار ہے عمل۔ خون درکار ہے رگِ جاں کا خون، جوش درکار ہے جو خدائی ہو اور عرش سے اترا ہو ولولہ درکار ہے جو عرش تک رسا ہو۔ جب حقیقی مسلمان، خدا کے خالص مومن ہو کر قرآن کا حبل اللہ مضبوط دہرے رہو گے۔ جب فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِیْٓ اُوْحِیَ اِلَیْكَ۔ کا مظہر بنو گے، تو تم ربانیین یعنی اولٰئِک حزب اللہ کے گروہ میں داخل ہوجاؤ گے وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ہ کا خدائی جھنڈا تم کو عنایت کیا جائے گا وعد اللہ لا یخلف اللہ المیعاد۔

اے بھائیو! پھر سے قرآن پڑھو۔ تم نے قرآن نہیں پڑھا یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ ٭ تم نام کے مسلمان ہو کام کے نہیں۔ تمہارا ایمان منہ بولا افواہی ایمان ہے، شرک فے الصفات، شرک فے الشریعت، شرک فے الحکم، شرک فی العبادت سے بھرا ہوا، کوڑی کام کا نہیں، نہ نجات دنیا کے کام کا، نہ نجات آخرت کے کام کا۔

اٹھو اور کھڑو۔ اللہ اللہ کا نعرہ بلند کرو، اللہ کے نور سے منور ہو جاؤ، قرآن اللہ کا نور اللہ کا کلام ہے، اس کو سینہ میں رکھو، دل کی آنکھ سے پڑھو، اس میں عقل و تدبر سے غور و فکر کرو، سوچو، سمجھو اور میدان عمل میں نیز گام ہوجاؤ معمل ہو کر اس کی تبلیغ قول و فعل سے شہروں میں، دیہاتوں میں انفراداً بھی اور عام جلسوں میں بھی شہر بہ شہر دنیا کے ہر گوشہ میں جس طرح خود رسولؐ نے کیا تھا ان کی اتباع میں تم بھی کرو تاکہ اللہ کا نور سارے عالم میں پھیل جائے کہ "اشرقت الارض بنورها" اور کفر و نفاق کی ظلمت کافور ہو کہ زھق الباطل۔ تاکہ خدا کے جمال و جلال کی سیاست کعبۂ دل کے بتوں کو توڑتی ہوئی تخت کبریائی پر جلوہ فرما نظر آئے۔

قرآنی تبلیغ کے لئے قرآن میں خدا نے آیات دیدی ہیں۔ نشانیاں بتادی ہیں کہ ان نشانیوں سے اس تک پہونچو۔ جس کی نشانیاں آسمان میں ہیں، زمین میں ہیں، سورج اور چاند سیارے اور ثوابت میں ہیں۔ پہاڑ اور جنگل آبادی اور ویرانوں میں ہیں، بارش اور اس کی ودیعتوں میں ہیں، مٹی میں ہوا میں، آگ میں، پانی میں۔ بڑے سے بڑے پہاڑوں بڑے بڑے تناور درختوں اور چھوٹے سے چھوٹے ذروں میں ہیں۔ ہر چیز کے فنا و بقا اور موت و حیات میں بلکہ خود تم میں تمہارے جسم تمہاری روح میں تمہارے حرکات و سکنات میں ہیں، خدا کی نشانیوں سے زمین و آسمان

بھرا پڑا ہے۔ سچ کہو کہ تم نے کبھی ان نشانیوں پر غور و فکر کیا ہے کہ یہ کس کی نشانی ہے کس لئے ہے اور کہاں تک اس کی
کشش رسا ہے۔ خدا کو تو دیکھ نہیں سکتے جس طرح اپنی روح اور جان کو نہیں دیکھ سکتے مگر جس طرح کی نشانیاں
دیکھ کر کہہ اٹھتے ہو کہ ہم زندہ ہیں ہم میں روح موجود ہے اسی طرح خدا کی نشانیوں سے تم کو خدا کے وجود کا اس
کے صفات کا اس کے کارناموں کا تیہ نہیں لگتا اور تمہیں اتنا ایمان بھی حاصل نہیں ہوتا جتنا اپنی زندگی کا ایمان
یقین ہے۔ اور اس کی محبت اتنی بھی پیدا نہیں ہوتی جتنی اس کی دی ہوئی جان سے ہے۔ جان کے لئے تو جان جوکھو
مصیبتیں جھیلو اور اس سے اس درجہ غافل آہ۔ آہ

اے مسلمانو! اے علماء اے مشایخ! تشخص نفسانیت، نفاق و جاہ طلبی پر لعنت بھیجو۔ ان برائیوں سے تائب
ہو جاؤ اور خدا کی طرف رجوع کرو الیہ المرجع والمآب دیکھو دنیا دوسری ہو رہی ہے، زمانہ بدلنے کو ہے
سوف یاتی اللہ بقوم یحبھم ویحبونہ وہ قوم پیدا ہو چکی ہے، قرآن کا غلغلہ آسمان تک پہونچا ہوا ہے
اللہ کا نام بلند ہونے کو ہے۔ تم بھی اپنے نعروں سے اس غلغلہ کو عرش تک پہونچاؤ۔ اور اللہ اللہ کا نعرہ بلند
کرتے ہوئے قرآن مجید کی رسولی تبلیغ شروع کر دو جس کو میں نے ابھی بیان کیا وہ تو عرب تھے جن کی زبان عربی
تھی قرآن کو سنا سمجھا عمل کیا مراد کو پہونچے۔ ہم ہندوستانی عرب نہیں۔ دنیا وسیع ہے۔ ہر قوم کو اپنی اپنی زبان
اس لئے ضرور اور لازم ہے کہ قرآن کا ترجمہ بلا آمیزش انسانی رایوں کے ہر قوم کی اپنی زبان میں کیا جائے
اس کی تبلیغ کو اٹھو۔ رسول نے اس زبان میں تبلیغ فرمائی جس زبان کو قوم سمجھتی تھی تم اس کا ترجمہ سناؤ اور زبان کی
دوری اور دقت کو مٹادو کہ تبلیغ کا دروازہ بند نہ ہو۔ اس طرح قرآن سناؤ اور سمجھاؤ کہ لعلکم تعلمون ۔
لعلکم تفقھون، لعلکم تعقلون کا مقصد پورا ہو تا کہ وہ قرآن میں تدبر و تفکر کر سکیں اور خدا کی عظمت و جلالت
کا نور ان کے دلوں پر چھا جائے کہ وہ عمل کرنے کی ہمت کر سکیں۔ جب طلب کا کوئی قدم اٹھے گا اور عمل بقدر
وسعت شروع ہو جائے گی تو ان الذین آمنوا وعملوا الصلحت سیجعل لھم الرحمن ودا اس کو مودت و محبت کی کیمیا عطا
ہو جائے گی۔ یہ محبت استقلال عمل سے پرورش پا کر گردش پیدا کرے گی، صفات بدلنے شروع ہوں گے۔
اس گردش سے روش پیدا ہو گی اور تم صراط مستقیم پر لگ جاؤ گے۔ ان ربی علی صراط مستقیم پھر صراط مستقیم
پر چلنے سے تم خدا سے ملاقی ہو گے۔

پھر جب تم قرآنی صفات سے متصف ہو جاؤ گے تو شیطان فوج لے کر مقابلہ کو آئے گا۔ دنیا تمہاری دشمن
بدرجہ الف ہو جائے گی اور جہاد کا میدان کارزار گرم ہو جائے گا۔ تم کو جیل جانا ہوگا فاقہ کشی کی مصیبت جھیلنی پڑے گی

اس وقت تمہارے مخالف تمہارے اپنے ہو جائیں گے اور تم جماعت در جماعت جہاد کے میدان میں ذوق و شوق
اور محبت کی گرما گرمی سے عشق کے ہوائی جہاز پر اڑ کر صبر و توکل کی مشین گنوں سے ایمان کا جھنڈا بلند کئے ہوئے
میدان مار لوگے۔ کامیابی کا چتر نصب کیا جائے گا اور خلیفۃ اللّٰہی کا تاج فرشتے خدا کی بشارتیں دیتے ہوئے
تم کو پہنائیں گے۔ مگر سب کچھ پا کر بھی تمہارا کچھ نہ ہوگا صرف وہی ایک اللہ رہے گا اور وہی سب کچھ جو رنگ
خلفاء کا تھا تم نے آنکھ سے نہیں دیکھا کانوں سے سنا تو ہے۔ بس اے بھائیو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ
اللّٰہِ۔ دَ الْقرآن کلام اللّٰہِ۔

حقایق و عبر

اپنے آئینے میں

انسان کی بدبختی یہ نہیں کہ اس سے سہواً کوئی لغزش ہو جائے بلکہ بدبختی یہ ہے کہ لغزش کو لغزش اور غلطی کو غلطی تسلیم نہ کرے بلکہ مدافعت اور جواز میں وہ کچھ کہتا چلا جائے جس پر عقل ہنسے اور سنجیدگی ماتم کرے۔ بنگال کے وزیر اعظم جناب فضل الحق صاحب نے جو کچھ کیا ہے کون مسلمان ہے جو اسے ایک ثانیہ کے لئے بھی مناسب قرار دے گا لیکن جناب فضل الحق صاحب ہیں کہ پوری ڈھٹائی سے اسے بہت بڑی خدمت ملی قرار دیتے چلے جا رہے ہیں اور اس مذموم حرکت کا نام بڑی جرأت اور دانش اطواری رکھ رہے ہیں فرماتے ہیں کہ مسلمانوں نے مہاسبھا کے لیڈر۔ ڈاکٹر مکرجی کی کابینہ میں شمولیت پر خواہ مخواہ شور مچا رکھا ہے حالانکہ

"یہ تو بڑی اہم بات ہے کہ فرقہ وارانہ حقوق کے دو ایسے متشدد حامیوں کو اتنی جرأت اور دانش مندی نصیب ہو جائے کہ وہ بنگال کی سیاست میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے مشترکہ ذمہ داری کو سنبھالیں"

(ہندوستان ٹائمز ۴ ۱/۲ ۴)

لیکن جس چیز کا نام آج جرأت اور دانش اطواری رکھا جاتا ہے اور اس کی بنا پر اپنے آپ کو مسلمانوں کے حقوق کا بہت بڑا محافظ قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے متعلق اس سے پیشتر کیا کہا جاتا تھا یہ ہم سے نہیں خود جناب فضل الحق صاحب کی زبان سے سنئے۔ جب ۱۹۳۸ء میں کلکتہ میں مسلم لیگ کا اجلاس خصوصی منعقد ہوا ہے تو جناب فضل الحق صاحب نے بھرے اجلاس میں اپنے خطبۂ استقبالیہ میں فرمایا تھا۔

"کانگرس نے مجھ سے کئی بار درخواست کی ہے کہ میں مشترکہ وزارت قائم کر لوں۔ اگر میں ان کی شرائط کو مان لیتا تو یقیناً میں وزیر اعظم بھی رہتا اور وزارت بھی یقیناً برسوں تک مستحکم رہتی۔ لیکن یہ وزارت شاہ عالم کی بادشاہت یا میر جعفر کی نوابی سے زیادہ باعزت اور باوقار نہ ہوتی۔ مجھے اپنے دستخطوں سے کانگرس کے ان اسلام کش فرامین اور مہاسبھا کے احکام کو نافذ کرنا پڑتا جو اسلام کے خلاف دشمنی اور عداوت پر مبنی ہوتے ہیں۔ اگر میں ایسا کرتا تو میں آخرت میں اللہ اور اس کے آخری رسول کو کیا منہ دکھاتا؟"

اللہ اکبر! ہوس جاہ پرستی اور زر بھی انسان سے کیا کچھ کہا دیتی ہے! ہم تو سمجھتے ہیں کہ جناب فضل الحق صاحب کے اس ایک واقعہ میں ارباب بصیرت کے لئے عبرت و موعظت کے ہزار سامان پوشیدہ ہیں رو سیاہی اور ایسی سخت رو سیاہی!

دیکھو انہیں جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
ان کی سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

---

۲ روح عظیم (ابوالکلام آزاد)

ہندوستان کی فضائے سیاست میں ایک عرصہ سے یہ بات مشہور ہے کہ گاندھی جی نے ناگپور کے بھرے اجلاس میں کہا تھا کہ اردو قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔ اس لئے مسلمان چاہیں تو اسے محفوظ رکھیں۔ چونکہ گاندھی جی کے منھ سے یہ ایسی بات نکل گئی تھی جو ان کے قلبی کیفیت کو بے نقاب کئے دیتی تھی اس لئے ان کے چیلے۔ بالخصوص مسلم قومیت پرست حضرات ایک عرصہ سے کلبلا رہے تھے کہ کس طرح اس کی تردید ہو جائے چنانچہ اس غرض کے لئے حیدرآباد کے ایک صاحب ڈاکٹر جعفر حسن نے گاندھی جی سے اس کی بابت استفسار کیا۔ یہ خط وکتابت "ہماری زبان" (مورخہ ۱۶ ۱۲/۴۸) میں شائع ہوئی ہے آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

" مائی ڈیر باپو ــــ آپ کو غالباً علم ہوگا کہ اکثر آپ کی طرف یہ منسوب کیا جاتا ہے کہ آپ نے کہا "اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اگر وہ (مسلمان) چاہیں تو اسے رکھیں"۔

اگرچہ یہ مقولہ مختلف طریقے سے دہرایا جاتا ہے گر معنی ایک ہی ہوتے ہیں۔ سننے والوں پر اس کا یہی اثر ہوتا ہے کہ آپ نہ صرف اردو زبان کی حفاظت کی طرف سے بے پرواہیں بلکہ اس زبان سے آپ کو عناد ہے اس لئے کہ یہ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔

میں بہت ممنون ہوں گا کہ اگر آپ مجھے مطلع کر سکیں کہ آپ نے کبھی کوئی ایسی بات کہی ہے۔ نیز یہ کہ اب آپ کی غور کرنے کے بعد کی رائے کیا ہے۔

میں آپ کو کبھی ایسی تکلیف نہ دیتا مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ رائے ہزاروں بار آپ سے منسوب کی گئی ہو اور اب بھی بار بار دہرائی جاتی ہے جس کی وجہ سے مخالفتوں میں زیادتی ہو رہی ہے۔ مجھے اتنا اور کہنا ہے کہ آپ کی اس رائے زنی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آپ نے سنہ ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی اردو کے (سکریٹری) مولوی عبدالحق (صاحب) کے سامنے کی۔

میں ممنون ہوں گا اگر آپ مجھے جواب عنایت فرمائیں گے۔

آپ کا مخلص جعفر حسن

سیواگرام، وردھا، ہوکر (مدھیا پردیش)

۲۹ ستمبر ۱۹۴۱ء

مائی ڈیر جعفر ــــــ مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے مجھے خط لکھا۔ جو الفاظ مجھ سے منسوب کئے جاتے ہیں، میں نے کبھی نہیں استعمال کئے۔ میں وہ عبارت (دیکھنا) چاہتا ہوں۔ میں ایسی رائے زنی کر ہی نہیں سکتا تھا اس لئے کہ میں نے خود اردو کا مطالعہ کیا ہے۔ میں اکثر لوگوں کو اردو میں خط لکھتا ہوں میں نے مولانا شبلی کی "سیرت" اور دوسری تصنیفیں پڑھی ہیں۔ 'ہندی' کی جو تعریف ہندی ساہتیہ سمیلن نے منظور کی ہے وہ میں نے ہی کی تھی۔ اور وہ یہ ہے کہ "وہ زبان جسے شمال کے ہندو اور مسلمان بولتے ہیں اور ناگری یا فارسی دونوں رسم خط میں لکھی جاتی ہے"۔

آپ کا باپو

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ گاندھی جی کس طرح پہلو بچا کر اس الزام سے انکار کر گئے ہیں۔ اب اسپر جناب عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو کا تبصرہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

"ڈاکٹر جعفر حسن صاحب نے ایک پرانے قضیے کو تقریباً پانچ سال کے بعد پھر جگایا ہے۔ گاندھی جی کا یہ کہنا کہ میں نے وہ زبان یعنی الفاظ استعمال نہیں کئے جو مجھ سے منسوب کئے جاتے ہیں ایک طرح صحیح ہے۔ انھوں نے ہرگز یہ نہیں کہا تھا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ بلکہ انھوں نے یہ فرمایا تھا کہ۔

"اردو مسلمان بادشاہوں نے پھیلائی اور قرآن کے حرفوں میں لکھی جاتی ہے وہ چاہیں تو اسے رکھیں"۔

یہ الفاظ گاندھی جی نے اکھل بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے کھلے اجلاس منعقدہ ناگپور (۱۹۳۶ء) میں سینکڑوں اصحاب کے سامنے فرمائے ہیں۔ اس اجلاس میں موجود تھا اور ہندی اردو کے بارے میں دیر تک مجھ سے ان سے بحث رہی۔ ڈاکٹر جعفر حسن صاحب کو حیرت ہے کہ گاندھی جی جیسے راست باز اور با اصول لیڈر کیسے کہہ سکتے ہیں کہ "اردو قرآن کے حرفوں میں لکھی جاتی ہے"۔ لیکن جس وقت ہم نے یہ الفاظ گاندھی جی کی زبان مبارک سے اپنے کانوں سے سنے تو ہمیں اور ہمارے ساتھیوں کو اس سے کہیں زیادہ حیرت ہوئی تھی جتنی ڈاکٹر جعفر حسن کو ہوئی ہے میں نے اس کے بعد ہی پرشد کے اجلاس کی

پوری کیفیت چھاپ کر شائع کر دی تھی اور اس کی تردید نہ کبھی گاندھی جی نے کی اور نہ کسی اور صاحب نے اس کے کچھ دنوں بعد پنڈت سندر لال صاحب نے ایک طویل خط اس بارے میں لکھا اور گاندھی جی کو اس بیان پر تنبہ کیا تو اس وقت بھی انھوں نے اس سے انکار کیا اور نہ تردید کی۔ گاندھی جی کے لئے یہ کہہ دینا ایک معمولی بات ہو گئی ہے کہ یہ میری بھاشا نہیں۔ یہ الفاظ جو مجھ سے منسوب کئے گئے ہیں میرے نہیں۔ لیکن یہ کبھی نہیں کہتے کہ میں نے کیا کہا تھا یا میں نے یہ نہیں یہ الفاظ استعمال کئے تھے ڈاکٹر جعفر حسن صاحب کے خط کے جواب میں بھی انھوں نے یہی کیا ہے یہ ایک راست باز اور با اصول لیڈر کا جواب نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک وکیلانہ ہوشیاری ہے

میں نے بہار ہندو ساہتیہ پرشد کی روداد میں گاندھی جی کا جو قول لکھا ہے وہ حرف بحرف درست ہے۔ وہ خاص شخص کے لفظوں میں ہے اور ان میں مطلق تصرف نہیں کیا گیا۔ وہ لفظ اب تک میرے کان میں گونج رہے ہیں اور ان کے سننے والے اب بھی موجود ہیں۔ میں اس کے ثابت کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہوں۔

ہندی کی جو تعریف ساہتیہ پرشد نے منظور کی تھی وہ بلا شبہ گاندھی جی نے کی ہوگی لیکن ہندوستانی کی تعریف جو کانگریس نے منظور کی تھی وہ بھی تو آپ ہی نے فرمائی تھی جیسا کہ خود انھوں نے بیان کیا تھا۔ مگر جب ہم نے ساہتیہ پرشد کے اجلاس میں ان سے عرض کیا کہ جب خود آپ نے ہندوستانی کا رزولیوشن بنایا اور کانگریس میں پیش کر کے منظور کرایا تو پھر آپ کانگریس کی قرارداد اور آئین کے مطابق پرشد کی زبان ہندوستانی کیوں منظور نہیں کرتے تو آپ نے کیا خوب جواب دیا کہ اس کا یہ مطلب نہیں تھا۔ گاندھی جی توجیہ و تاویل کے کامل استاد ہیں اور ان کے اقوال و اعمال میں عجیب تضاد پایا جاتا ہے۔ یہاں ہم اس پر بحث کرنا نہیں چاہتے لیکن جو صاحب "مہاتما جی" کی سیرت کے اس پہلو کو تفصیل سے جاننا چاہتے ہیں وہ مسٹر یاجنک کی بے لاگ کتاب Gandhi. as I know him کا مطالعہ فرمائیں۔

یہ ہے وہ "روح عظیم" جس کے اتباع میں ہمارے علما حضرات کو "نجات و سعادت" کی راہ نظر آ رہی ہے۔

۳۔ یُعرَفُ المُجرِمُونَ بِسِیمَاھُم

اشاعت سابقہ میں ہم نے لکھا تھا کہ نواب بہادر ڈھاکہ نے اپنے مسلم لیگی رفقا کار (سر ناظم الدین وغیرہ) کے خلاف بے بنیاد الزام عائد کئے ہیں۔ اصل بات

(بقیہ بر صفحہ ۶۴)

باب المراسلات

آپ کا جرم

(قارئین طلوعِ اسلام میں سے ایک بالغ نظر صاحب ذوق کرم فرما اپنے ایک مکتوبِ گرامی میں تحریر فرماتے ہیں)

روایات کے متعلق طلوعِ اسلام کی روش کا میں شروع سے نہایت دلچسپی سے مطالعہ کرتا چلا آرہا ہوں اور جو کچھ اس کے مخالف کہا جاتا ہے اسے بھی بغور دیکھتا ہوں۔ میں دیکھ کر حیران ہوں کہ بعض لوگ اپنے خاص مقاصد کے پیشِ نظر دوسروں کو بدنام کرنے میں کس قدر جسارت سے کام لیتے ہیں۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں روایات کے متعلق آپ کا مسلک حرف بحرف وہی ہے جو عام اعتدال پسند مسلمانوں کا ہے۔ میرے خیال میں آپ نہ منکرِ حدیث ہیں۔ نہ چکڑالوی ہیں۔ نہ اہلِ قرآن کی اصطلاحی معنوں میں اہل ہیں لیکن بدنام کرنے والوں کا کیا علاج؟ انہیں تو عوام کو بھڑکانے کے لئے چند الفاظ کی ضرورت ہے اور بس! اور مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ عوام تو ایک طرف اچھے خاصے پڑھے لکھوں سے جب پوچھئے کہ کیوں بھئی! تم نے خود تحقیق کر لیا ہے کہ جو اتہامات یہ لوگ لگا رہے ہیں ان کی کچھ اصلیت بھی ہے یا نہیں۔ تو ایک کھسیانے پن کی ہنسی کے ساتھ کہہ دیں گے کہ میں نے خود تو تحقیق نہیں کیا لیکن سچ ہی ہوگا! ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ صاحب یہ کہئے کہ جب طلوعِ اسلام والے احادیث کے منکر ہیں تو پھر انھوں نے اپنی نمازوں کی صورت بھی کچھ اور ہی مقرر کر لی ہوگی۔ میں نے کہا کہ بھائی! وہ تو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ان احکامِ قرآنی کی جو شکل رسول اللہؐ نے متعین فرما دی ہے اس میں قیامت تک بھی رد و بدل نہیں ہو سکتا۔ سو وہ نماز کی کوئی صورت کیوں پیدا کرنے لگے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ لوگ بالکل اسی طرح سے نمازیں پڑھتے ہیں۔ روزے رکھتے ہیں جس طرح عام مسلمان۔ اس پر اس نے پوچھا کہ پھر وہ کہتے کیا ہیں؟ میں نے کہا کہ کہتے صرف اتنا ہیں کہ ہماری روایات کے موجودہ مجموعے خود رسول اللہؐ نے مرتب فرما کر نہیں دئے۔ انسانوں کی کوششوں سے مرتب ہوئے تھے۔ اور انسانی کوشش میں غلطی بھی ہو سکتی ہے اس لئے ان میں سے صحیح اور غلط کے پرکھنے کا معیار یہ ہے کہ جو بات قرآن کے مطابق ہو وہ صحیح۔ جو اس کے خلاف وہ غلط۔ یہ ہے وہ تمام جرم جس پر اس قدر طوفان برپا کیا جا رہا ہے!

مجھے ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے جو ایک عرصہ سے طلوعِ اسلام سے کسی نہ کسی رنگ میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ان میں جو لوگ آجکل آپ کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان میں ایک طبقہ تو ان کا ہے

جنھیں آپ سے شروع سے ہی حسد چلا آتا ہے نہ معلوم کیوں! لیکن طلوعِ اسلام کے فروغ نے انھیں ہمیشہ آتش در پیراہن رکھا ہے۔ آپ یہ سنکر حیران ہونگے کہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اس سے پیشتر خود روایات کے سخت مخالف تھے اور نہایت دریدہ دہنی سے (معاذ اللہ) اس کی ہنسی اڑایا کرتے تھے۔ لیکن جونہی طلوعِ اسلام نے مسلکِ اعتدال کو پیش کیا تو میری حیرت کی حد نہ رہی کہ یہی لوگ احادیث کے سب سے بڑے محافظ بن کر طلوعِ اسلام کی مخالفت پر اتر آئے۔ اس غرض کے لئے جہلا کی جماعت کا ساتھ ملا لینا کچھ بھی مشکل نہیں۔ کون مسلمان ہے جسے یہ کہدیا جائے کہ فلاں شخص رسول اللہ کی احادیث کا منکر ہے اور وہ اس کی مخالفت پر نہ اتر آئے۔ اس سے آگے بڑھئیے تو علمائے کی جماعت آتی ہے۔ یہ لوگ بالعموم جمعیت العلماء کے ہمنوا ہیں اور جمعیت العلماء کی گمراہ کن روش کے متعلق طلوعِ اسلام نے جس صداقت اور حق گوئی سے کام لیا ہے۔ وہ کس سے پوشیدہ ہے؟ یہ لوگ دانت پیس پیس کر سب کچھ سنتے رہے اس لئے کہ جو کچھ طلوعِ اسلام میں لکھا جاتا تھا اس کا جواب ان سے بن ہی نہیں پڑتا تھا۔ اب جو انھیں موقعہ ہاتھ آیا تو پرانے انتقام نے یہ شکل اختیار کرلی۔ اب ہر جگہ طلوعِ اسلام کو بدنام کرتے پھر رہے ہیں اور اپنے جذبہ انتقام کو "حفاظتِ احادیث رسول اللہ" کا مقدس نقاب اڑھا کر آتش سد کو ٹھنڈا کر رہے ہیں۔ حالانکہ اگر یہ کبھی ایمانداری سے سوچیں تو ان میں سے اکثر ایسے ہونگے جو روایات کے بارے میں وہی عقیدہ رکھتے ہیں جو آپ کا ہے۔ ذرا غور کیجئے! آپ نے یہ کہا ہے کہ روایات کی جمع و ترتیب انسانی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ جو غلطی سے پاک نہیں ہوسکتی۔ یہی الفاظ شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ نے ارشاد فرمائے ہیں۔ لیکن انھیں کوئی منکرِ حدیث نہیں کہتا۔ آپ نے یہی کہا ہے کہ صحاح ستہ کی کتابوں میں غلط اور صحیح روایات مخلوط ہیں۔ یہی الفاظ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے ارشاد فرمائے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ محدث قرار پاتے ہیں اور آپ لوگ منکر۔ آپ نے یہی کہا ہے کہ روایات کے مجموعے عہدِ رسالتمآبؐ کی تاریخ ہیں۔ بالکل یہی کچھ مولانا عبیداللہ صاحب سندھی نے کہا ہے جب انھوں نے لکھا ہے کہ ہماری صحاح اربعہ کا درجہ اناجیل اربعہ کے درجہ پر ہیں لیکن ان علما حضرات میں سے کوئی نہیں جو مولانا سندھی صاحب کو منکرِ حدیث کہکر بدنام کرے۔ پھر آپ نے یہی کہا ہے کہ احادیث ظن سے خالی نہیں اور یہ عقیدہ غلط ہے کہ جو کچھ ان مجموعوں میں آچکا ہے وہ شک و شبہ سے بالا ہے۔ یہی الفاظ مولانا حمید الدین صاحب فراہیؒ نے فرمائے ہیں۔ لیکن انھیں کوئی منکرِ حدیث نہیں کہتا۔ لہذا آپ پر بڑھ چڑھ کر یہ لیبل لگایا جاتا ہے۔ اگر آپ منکرِ حدیث ہیں تو متقدمین و متاخرین میں سے یہ تمام حضرات بھی منکرین حدیث ہیں۔ لہذا آپ نے یہ بھی سوچا کہ یہ حضرات منکرین حدیث نہیں لیکن انہی کے

اقوال جب آپ نقل کریں تو آپ منکرین احادیث قرار پاجائیں۔ کیا آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ جن حضرات کا اوپر ذکر کیا جاچکا ہے۔ مولوی حضرات ان میں سے کسی کے خلاف لب کشائی کی جرأت کرسکتے ہیں؟ ایسی نہیں کہ ان کے خلاف لب کشائی نہیں کرسکتے بلکہ اگر یہ لوگ دیانتداری سے ان بزرگوں کو اپنا امام مانتے ہیں تو ان کا مذہب بھی ویسا ہونا چاہیئے جو ان بزرگوں کا تھا اور ہے اس لئے طلوع اسلام کے خلاف ان لوگوں کا شور وشین اس لئے نہیں کہ فی الواقعہ ان لوگوں کو ایمانداری سے اس کے مسلک در بارۂ روایات سے اختلاف ہے بلکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے محض حسد اور انتقام کا جذبہ تھا جسے فرو کرنے کے لئے انھیں یہ حربہ ہاتھ آگیا ہے میرے ملنے والوں میں سے ایک صاحب رسالہ ترجمان القرآن کے بہت مداح ہیں۔ یہ خوشی کی بات ہے۔ میں خود ترجمان القرآن پڑھتا ہوں۔ لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ترجمان القرآن سے ان کی دلبستگی حُبِ علی نہیں بلکہ بغض معاویؓ کی بنا پر ہے۔ وہ بھی طلوع اسلام کے مخالفین میں سے ہیں اور ہر جگہ یہی کہتے پھرتے ہیں کہ میری مخالفت ان کے مسلکِ حدیث کی بنا پر ہے۔ میں نے ان سے ایک دن پوچھا کہ آپ کو معلوم ہے کہ سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی کے خود حدیث کے بارے میں کیا خیالات ہیں؟ میں نے جب انھیں مودودی صاحب کی تحریریں نکال کر دکھائیں تو ان پر بھی وہی اعتراض عائد ہوتے ہیں جو وہ طلوع اسلام کے خلاف عائد کرتے تھے۔ اس پر وہ بالکل خاموش ہوگئے۔ لیکن آپ حیران ہونگے کہ اس کے باوجود ان کی طلوع اسلام سے مخالفت اور ترجمان القرآن سے شیفتگی کا وہی عالم رہا۔ اس سے آپ اندازہ فرمالیجئے کہ ان لوگوں کی مخالفت کس بنا پر ہے۔ محترمی پرویز صاحب کا مضمون شخصیت پرستی پہلے ترجمان القرآن میں شائع ہوا تھا۔ اس پر جناب مودودی صاحب نے ایک استدراک تحریر فرمایا تھا۔ اس استدراک میں پہلے ان لوگوں کی مخالفت کی گئی تھی جو احادیث کو بالکلیہ رد کردیتے ہیں اور ان کے نزدیک رسول کی حیثیت ایک آلۂ ابلاغ سے کچھ زیادہ نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ یہ مسلک (جیسا کہ آپ نے خود واضح طور پر لکھدیا ہے) طلوع اسلام اور اس کے مضامین نگار حضرات (مخدومی پرویز صاحب اور علامہ اسلم صاحب مدظلہ) کا نہیں اس کے بعد جناب مودودی صاحب نے احادیث کا وہ پہلو لیا ہے جس کے خلاف طلوع اسلام میں لکھا جاتا ہے۔ ہر چند یہ خط ایک مضمون کی صورت اختیار کرلے گا لیکن میں اسے ضروری سمجھتا ہوں کہ اس باب میں جناب مودودی صاحب کا نقطۂ نظر انہی کے الفاظ میں پیش کردوں تاکہ معلوم ہو جائے میں نے اپنے اس دوست کو جن کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے۔ کیا دکھایا تھا۔ مودودی صاحبؒ نے تحریر فرمایا تھا۔

یہ تو اس گروہ کا حال تھا جو احادیث کی اصولی ظنّیت کی بنا پر انھیں بالکلیہ رد کر دینا چاہتا ہے۔ اب دوسرے گروہ کو لیجیے جو دوسری انتہا کی طرف گیا ہے یہ لوگ محدثین کے اتباع میں جائز حد سے بہت زیادہ تشدد اختیار کرتے ہیں۔ ان کا قول یہ ہے کہ محدثین کرام نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے رکھ دیا ہے۔ ایک ایک حدیث کو چھانٹ کر وہ بتا چکے ہیں کہ کون کس حد تک قابل اعتبار ہے اور کون کس حد تک ناقابل اعتبار۔ اب ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ان بزرگوں نے احادیث کے جو درجے مقرر کر دیئے ہیں انہی کے مطابق ہم ان کو اعتبار اور صحت کا مرتبہ دیں مثلاً جو قوی الاسناد ہے اس کے مقابلہ میں ضعیف الاسناد کو چھوڑ دیں، جسے وہ صحیح قرار دے گئے ہیں اسے صحیح تسلیم کریں اور جس کی صحت میں وہ قدح کر گئے ہیں اس سے بالکل استناد نہ کریں، ان کے معروف کو معروف اور ان کے منکر کو منکر مانیں، رواۃ کے عدل و ضبط اور ثقاہت کے متعلق جن جن آراء کا وہ اظہار کر گئے ہیں ان پر گویا ایمان لے آئیں، ان کی نگاہ میں احادیث کے معتبر یا غیر معتبر ہونے کا جو معیار ہے ٹھیک ٹھیک اسی معیار کی ہم بھی پابندی کریں، مثلاً مشہور کو شاذ پر، مرفوع کو مرسل پر اور مسلسل کو منقطع پر لازماً ترجیح دیں، اور ان کی کھینچی ہوئی حد سے یک سر مو تجاوز نہ کریں۔ یہی وہ مسلک ہے جس کی مخالفت جناب پرویز کرنا چاہتے ہیں اور حق یہ ہے کہ ان کی مخالفت بالکل جائز ہے۔

محدثین رحمہم اللہ کی خدمات مسلّم۔ یہ بھی مسلّم کہ نقد حدیث کے لئے جو مواد انھوں نے فراہم کیا ہے وہ صدر اول کے اخبار و آثار کی تحقیق میں بہت کار آمد ہے۔ کلام اس میں نہیں بلکہ صرف اس امر میں ہے کہ کلیۃً ان پر اعتماد کرنا کہاں تک درست ہے۔ وہ بہرحال تھے تو انسان ہی۔ انسانی علم کے لئے جو حدیں فطرۃ اللہ نے مقرر کر رکھی ہیں ان سے آگے تو وہ نہیں جا سکتے تھے۔ انسانی کاموں میں جو نقص فطری طور پر رہ جاتا ہے اس سے تو ان کے کام محفوظ نہ تھے۔ پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جس کو وہ صحیح قرار دیتے ہیں وہ حقیقت میں بھی صحیح ہے؟ صحت کا کامل یقین تو خود ان کو بھی نہ تھا۔ وہ بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہتے تھے کہ اس حدیث کی صحت کا ظنِ غالب ہے مزید برآں یہ ظنِ غالب جس بنا پر ان کو حاصل ہوتا تھا وہ بلحاظ روایت تھا نہ کہ بلحاظ درایت ان کا نقطۂ نظر زیادہ تر اخباری ہوتا تھا۔ فقہ ان کا اصل موضوع ہی نہ تھا، اس لئے فقیہانہ نقطۂ نظر سے احادیث کے متعلق رائے قائم کرنے میں وہ فقہائے مجتہدین کی بہ نسبت کمزور تھے۔ پس ان کے کمال کا جائز اعتراف کرتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ احادیث کے متعلق جو کچھ بھی تحقیقات انھوں نے کی ہے اس میں دو طرح کی کمزوریاں موجود ہیں۔ ایک بلحاظ اسناد، دوسرے بلحاظ تفقّہ۔

اس مطلب کی توضیح کے لئے ہم ان دونوں حیثیتوں کے نقائص پر تھوڑا سا کلام کریں گے۔

کسی روایت کو جانچنے میں سب سے پہلے جس چیز کی تحقیق کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ روایت جن لوگوں کے واسطے سے آئی ہے وہ کیسے لوگ ہیں۔ اس سلسلہ میں متعدد حیثیات سے ایک ایک راوی کی جانچ کی جاتی ہے۔ وہ جھوٹا تو نہیں ہے؟ روایتیں بیان کرنے میں غیر محتاط تو نہیں؟ فاسق اور بدعقیدہ تو نہیں؟ وہمی یا ضعیف الحفظ تو نہیں؟ مجہول الحال ہے یا معروف الحال؟ ان تمام حیثیات سے رواۃ کے احوال کی جانچ پڑتال کرکے محدثین کرام نے اسماء الرجال کا عظیم الشان ذخیرہ فراہم کیا ہے جو بلاشبہ نہایت بیش قیمت ہے۔ مگر اس میں کونسی چیز ہے جس میں غلطی کا احتمال ہو۔ اول تو رواۃ کی سیرت اور ان کے حافظہ اور ان کی دوسری باطنی خصوصیات کے متعلق بالکل صحیح علم حاصل ہونا مشکل۔ دوسرے خود وہ لوگ جو ان کے متعلق رائے قائم کرنے والے تھے، انسانی کمزوریوں سے مبرا نہ تھے۔ نفس ہر ایک کے ساتھ لگا ہوا تھا اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ اشخاص کے متعلق اچھی یا بری رائے قائم کرنے میں ان کے جذبات کا بھی کسی حد تک دخل ہو جائے یہ امکان محض امکانِ عقلی نہیں ہے بلکہ اس امر کا ثبوت موجود کہ بارہا یہ امکان فعل میں آ گیا ہے۔ حماد جیسے بزرگ تمام علمائے حجاز کے متعلق رائے ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے پاس علم نہیں، تمہارے بچے بھی ان سے زیادہ علم رکھتے ہیں۔ عطا اور طاؤس اور مجاہد جیسے فضلاء کے حق میں بھی ان کی یہ رائے ہے۔ یہ حماد کون ہیں؟ امام ابوحنیفہ کے استاد اور ابراہیم النخعی کے جانشین۔ امام زہری کو دیکھئے اپنے زمانہ کے اہل مکہ پر ریمارک کرتے ہیں ما رأیت قوما انقض لعری الاسلام من اہل مکۃ[1] حالانکہ کہ اس وقت جلیل القدر علماء و صلحاء سے خالی نہ تھا۔ شعبی اور ابراہیم النخعی دونوں بڑے درجہ کے لوگ ہیں مگر ایک دوسرے پر کس طرح چوٹ کرتے ہیں۔ شعبی کہتے ہیں کہ ابراہیم النخعی رات کو ہم سے مسائل پوچھتا ہے اور صبح لوگوں کے سامنے اپنی طرف سے بیان کرتا ہے۔ ابراہیم النخعی کہتے ہیں کہ "وہ کذاب، مسروق سے روایت کرتا ہے حالانکہ مسروق سے وہ ملا تک نہیں"۔ ضحاک کو دیکھئے ایک مرتبہ اپنی بات کی پچ میں آ کر صحابۂ کرام کے متعلق کہہ گئے "ہم ان سے زیادہ جانتے ہیں"۔ سعید بن جبیر جیسے محتاط بزرگ ایک ایسے مسئلہ میں شعبی پر جھوٹ کا الزام رکھتے ہیں اور عکرمہ کے حق میں اپنے غلام سے کہتے ہیں کہ لا تکذب علی کما کذب عکرمۃ علی ابن عباس[2] امام مالک کی جلالت شان دیکھئے اور محمد بن اسحاق جیسے شخص کے حق میں ان کا یہ فرمانا دیکھئے۔ کہ

---

[1] میں نے اسلام کی رسی (الحلقہ) کو توڑنے والے۔ مکہ والوں سے زیادہ کسی اور کو نہیں دیکھا۔

[2] میری طرف جھوٹ منسوب نہ کرنا جیسے عکرمہ نے ابن عباسؓ کی طرف جھوٹ منسوب کی۔

[illegible]

[illegible] جلیل القدر اور حافظ حدیث ہیں۔ اعمش کے حق میں فرماتے ہیں کہ اس نے کبھی [illegible] کو [illegible]

[illegible] کیا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ اعمش المکادمن الآء کے قائل تھے اور حذیفہ کی حدیث کے مطابق سحری کیا

کرتے تھے۔ عبداللہ بن المبارک کس پایہ کے ثقہ بزرگ ہیں۔ ایک مرتبہ ان پر بھی ضد کے غلبہ کیا اور امام مالک

کے بارے میں ان کے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے کہ میں اس کو عالم نہیں سمجھتا۔ یحییٰ بن معین نے تو بڑے بڑے ثقات

پر جرح کی ہیں۔ زہری اوزاعی ابوعثمان النہدی، طاؤس غرض اس عہد کے متعدد بڑے بڑے لوگوں پر وہ طعن کر گئے

ہیں حتیٰ کہ امام شافعیؒ تک کے حق میں انھوں نے کہا کہ لیس بثقة۔ ان سب سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ

بسا اوقات صحابہ رضی اللہ عنہم پر بھی بشری کمزوریوں کا غلبہ ہوجاتا تھا اور وہ ایک دوسرے پر چوٹیں کر جاتے تھے

[illegible] نے سنا کہ ابوہریرہ وتر کو ضروری نہیں سمجھتے۔ فرمانے لگے کہ ابوہریرہ جھوٹے ہیں۔ حضرت عائشہ نے ایک موقع

[illegible] انس اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما کے متعلق فرمایا کہ وہ حدیث رسول اللہ کو کیا جانیں۔ وہ تو اس زمانہ میں بچے

تھے حضرت حسن بن علی سے ایک مرتبہ وشاهد و مشهود کے معنی پوچھے گئے انھوں نے اس کی

تفسیر بیان کی۔ عرض کیا گیا کہ ابن عمر اور ابن الزبیر تو ایسا اور ایسا کہتے ہیں۔ فرمایا دونوں جھوٹے ہیں۔ حضرت علی

رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر مغیرہ بن شعبہ کو جھوٹا قرار دیدیا۔ عبادہ بن الصامت نے ایک مسئلہ بیان کرتے ہوئے

[illegible] اوس انصاری پر جھوٹ کا الزام لگا دیا، حالانکہ وہ بدری صحابہ میں سے ہیں۔

اس قسم کی مثالیں پیش کرنے سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ اسماء الرجال کا سارا علم غلط ہے۔ بلکہ ہمارا مقصد صرف

یہ ظاہر کرنا ہے کہ جن حضرات نے رجال کی جرح و تعدیل کی ہے وہ بھی تو آخر انسان تھے، بشری کمزوریاں ان

کے ساتھ بھی لگی ہوئی تھیں۔ کیا ضرور ہے کہ جس کو انھوں نے ثقہ قرار دیا ہو وہ بالیقین ثقہ اور تمام

حیثیتوں سے ثقہ ہو، اور جس کو انھوں نے غیر ثقہ ٹھہرایا ہو وہ بالیقین غیر ثقہ ہو اور اس کی

[illegible] اعتبار سے ساقط ہوں۔ پھر ایک ایک راوی کے حافظہ [illegible]

[illegible]

اور صحت ضبط وغیرہ کا حال بالکل صحیح معلوم کرنا تو اور بھی مشکل ہے۔ اور ان سب سے زیادہ جس چیز کی تحقیق کرنا ہے کہ ہر راوی نے ہر روایت کے بیان میں ان تمام جزئیات کو ملحوظ بھی رکھا ہے جو فقیہانہ نقطۂ نظر سے استنباط مسائل میں اہمیت رکھتی ہیں۔

یہ فن رجال کا حال ہے۔ اس کے بعد دوسری اہم چیز سلسلۂ اسناد ہے۔ محدثین نے ایک ایک حدیث کے متعلق یہ تحقیق کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر راوی جس شخص سے روایت لیتا ہے۔ آیا وہ اس کا ہم عصر تھا یا نہیں، ہم عصر تھا تو اس سے ملا بھی تھا یا نہیں، اور ملا تھا تو آیا اس نے یہ خاص حدیث خود اسی سے سنی یا کسی اور سے سن لی۔ اور اس کا حوالہ نہیں دیا، ان سب چیزوں کی تحقیق انھوں نے اسی حد تک کی ہے جس حد تک انسان کر سکتے تھے، مگر لازم نہیں کہ ہر ہر روایت کی تحقیق میں یہ سب امور ان کو ٹھیک ہی معلوم ہو گئے ہوں بہت ممکن ہے کہ جس روایت کو وہ متصل السند قرار دے رہے ہیں وہ درحقیقت منقطع ہو اور انھیں یہ معلوم نہ ہو سکا ہو۔ کہ بیچ میں کوئی ایسا مجہول الحال راوی چھوٹ گیا ہے جو ثقہ نہ تھا۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ جو روایتیں مرسل یا معضل یا منقطع ہیں، اور اس بنا پر پایۂ اعتبار سے گری ہوئی سمجھی جاتی ہیں ان میں سے بعض ثقہ راویوں سے آئی ہوں اور بالکل صحیح ہوں۔

یہ اور ایسے ہی بہت سے امور ایسے ہیں جن کی بنا پر اسناد اور جرح و تعدیل کے علم کو کلیۃً صحیح نہیں سمجھا جا سکتا یہ مواد اس حد تک قابلِ اعتماد ضرور ہے کہ سنّت نبویؐ اور آثار صحابہؓ کی تحقیق میں اس سے مدد لی جائے اور اس کا مناسب لحاظ کیا جائے مگر اس قابل نہیں ہے کہ بالکل اسی پر اعتماد کر لیا جائے۔

جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، محدثین رحمہم اللہ کا خاص موضوع اخبار و آثار کی تحقیق بلحاظ روایت کرنا تھا، اس لئے ان پر اخباری نقطۂ نظر غالب ہو گیا تھا، اور وہ روایات کو معتبر یا غیر معتبر قرار دینے میں زیادہ تر صرف اسی چیز کا لحاظ فرماتے تھے کہ اسناد اور رجال کے لحاظ سے وہ کیسی ہیں۔ رہا فقیہانہ نقطۂ نظر تو ان کے موضوع خاص سے ایک حد تک غیر متعلق تھا، اس لئے اکثر وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا تھا اور وہ روایات پر اس حیثیت سے کم ہی نگاہ ڈالتے تھے۔ اسی وجہ سے اکثر ایسا ہوا ہے کہ ایک روایت کو انھوں نے صحیح قرار دیا ہے حالانکہ معنی کے لحاظ سے وہ زیادہ اعتبار کے قابل نہیں اور ایک دوسری روایت کو وہ قلیل الاعتبار قرار دے گئے ہیں حالانکہ معنی وہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ یہاں اس کا موقع نہیں کہ مثالیں دے کر تفصیل کے ساتھ اس پہلو

کی توضیح کی جائے۔ مگر جو لوگ علوم شریعت میں نظر رکھتے ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ محدثانہ نقطۂ نظر بکثرت مواقع پر فقیہانہ نقطۂ نظر سے ٹکرا گیا ہے اور محدثین کرام صحیح احادیث سے بھی احکام و مسائل کے استنباط میں وہ توازن اور اعتدال ملحوظ نہیں رکھ سکے ہیں جو فقہاء مجتہدین نے ملحوظ رکھا ہے۔

اس بحث سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ جس طرح حدیث کو بالکلیہ رد کر دینے والے غلطی پر ہیں اسی طرح وہ لوگ بھی غلطی سے محفوظ نہیں ہیں جنھوں نے حدیث سے استفادہ کرنے میں صرف روایات ہی پر اعتماد کر لیا ہے۔ مسلک حق ان دونوں کے درمیان ہے، اور وہی مسلک ہے جو ائمہ مجتہدین نے اختیار کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ کی فقہ میں آپ بکثرت ایسے مسائل دیکھتے ہیں جو مرسل اور معضل اور منقطع احادیث پر مبنی ہیں یا جن میں ایک قوی الاسناد حدیث کو چھوڑ کر ایک ضعیف الاسناد حدیث کو قبول کیا گیا ہے، یا جن میں احادیث کچھ کہتی ہیں اور امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کچھ کہتے ہیں۔ یہی حال امام مالک کا ہے۔ باوجودیکہ اخباری نقطۂ نظر ان پر زیادہ غالب ہے مگر پھر بھی ان کے تفقہ نے بہت سے مسائل میں ان کو ایسی احادیث کے خلاف فتوے دینے پر مجبور کیا جنھیں محدثین صحیح قرار دیتے ہیں چنانچہ لیث بن سعد نے ان کی فقہ سے تقریباً ستر مسئلے اس نوعیت کے نکالے ہیں۔ امام شافعی کا حال بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ معاذ اللہ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ یہ لوگ کسی حدیث کو حدیث صحیح جان کر اس سے انحراف کرتے تھے بلکہ اصل معاملہ یہ تھا کہ ان کے نزدیک صحتِ حدیث کا مدار صرف اسناد پر نہ تھا۔ اسناد کے علاوہ ایک اور کسوٹی بھی تھی جس پر وہ احادیث کو پرکھتے تھے، اور جس حدیث کے متعلق ان کو اطمینان ہو جاتا تھا کہ یہ حقیقت سے اقرب ہے اسی کو قبول کر لیتے تھے خواہ وہ خالص محدثانہ نقطۂ نظر سے مرجوح ہی کیوں نہ ہو۔

یہ دوسری کسوٹی کونسی ہے؟ ہم اس سے پہلے بھی اشارۃً اس کا ذکر کئی مرتبہ کر چکے ہیں جس شخص کو اللہ تعالےٰ تفقہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے اس کے اندر قرآن اور سیرت رسولؐ کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے جس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے۔ اس ذوق کا مالک اسلام کا مزاج شناس ہو جاتا ہے اور وہ اس کی روح کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ اس کی نظر بہ حیثیت مجموعی شریعت حقہ کے پورے سسٹم پر ہوتی ہے، اور وہ اس سسٹم کی طبیعت کو پہچان جاتا ہے۔ اس کے بعد جب جزئیات ان کے سامنے آتے ہیں تو اس کا ذوق اسے بتا دیتا ہے کہ کونسی چیز اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے اور کونسی نہیں رکھتی۔ روایات پر جب وہ نظر

ڈالتا ہے تو ان میں بھی یہی کسوٹی ردو قبول کا معیار بن جاتی ہے۔ اسلام کا مزاج عین ذات نبوی کا مزاج ہے جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے وہ نبی اکرم کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت اسے بتا دیتی ہے کہ ان میں سے کونسا قول یا کونسا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے اور کونسی چیز سنت نبوی سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن وسنت سے کوئی چیز نہیں ملتی ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ اس لئے کہ اس کی روح، روح محمدی میں گم اور اس کی نظر بصیرت نبوی کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔ اس کا دماغ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے اور وہ اسی طرح دیکھتا اور سوچتا ہے جس طرح اسلام چاہتا ہے کہ دیکھا اور سوچا جائے اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد انسان اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے اس لئے کہ اس کی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے۔ اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند، مقبول حدیث سے بھی اعتراض کر جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس جام زریں میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے وہ اسے طبیعت اسلام اور مزاج نبوی کے مناسب نظر نہیں آتی۔

یہ چیز چونکہ سراسر ذوقی ہے اور کسی ضابطہ کے تحت نہیں آتی، نہ آسکتی ہے اس لئے اس میں اختلاف کی گنجائش پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ چنانچہ اسی وجہ سے ائمہ مجتہدین کے درمیان جزئیات میں بکثرت اختلافات ہوئے ہیں۔ پھر یہ کوئی چیز نہیں کہ ایک شخص کا ذوق لامحالہ دوسرے شخص کے ذوق سے کلیۃً مطابق ہی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی مسلک کے ائمہ نے بہت سے مسائل میں ایک دوسرے سے اختلاف کیا ہے امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کے اقوال میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ وہ اس کی ایک روشن مثال ہے۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر مجتہد کا ذوق ہر مسئلہ میں صواب ہی کو پہنچ جائے۔ انسان بہرحال کمزوریوں کا مجموعہ ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کا مجتہد بھی غلطی کر سکتا ہے اور کر جاتا ہے۔ اسی بناء پر ائمہ مجتہدین ہمیشہ ڈرتے رہے ہیں اور انھوں نے ہمیشہ اپنے متبعین کو ہدایت کی ہے کہ ہم پر بالکل اعتماد نہ کر لو۔ خود بھی تحقیق کرتے رہو اور جب کوئی سنت ہمارے قول کے خلاف ثابت ہو جائے تو ہمارے قول کو رد کر کے سنت کی پیروی کرو۔

اقتباس بہت لمبا ہو گیا لیکن بہرحال میں اسے ضروری خیال کرتا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ روایات کے مخفی

ہونے کے متعلق طلوع اسلام نے اس سے بڑھ کر کچھ لکھا ہو۔ بلکہ جناب مودودی صاحب تو طلوع اسلام سے بھی ایک قدم آگے بڑھ گئے ہیں۔ طلوع اسلام کا مسلک یہ ہے کہ جو حدیث قرآن کے مطابق ہو وہ صحیح ہے۔ جو اس کے خلاف ہو وہ غلط ہے یعنی صحت اور سقم کے پرکھنے کی جو کسوٹی اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے اور جس میں کسی قسم کی غلطی یا التباس کا گمان تک بھی نہیں ہو سکتا۔ اسی کسوٹی پر روایات کو پرکھنا چاہیئے۔ لیکن جناب مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ احادیث کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار انسان کا اپنا ذوق ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جس چیز کی صحت کا مدار کسی شخص کے ذوق پر ہو۔ خواہ وہ ذوق کتنے ہی غائر مطالعہ کے بعد کیوں نہ پیدا ہوا ہو۔ وہ چیز یقینیات میں کس طرح داخل ہو سکتی ہے۔ اگر اس کے اپنے نزدیک یقینیات میں داخل بھی ہو جائے تو کسی دوسرے کے لئے وہ حجت کیسے قرار دی جا سکتی ہے۔ اسی لئے جناب مودودی صاحب نے خود فرمایا ہے کہ یہ چیز سراسر ذوقی ہے اس لئے اس میں ہمیشہ اختلاف کی گنجائش ہے حالانکہ اس کے برعکس طلوع اسلام ایک ایسی کسوٹی پیش کرتا ہے جس میں شبہ یا اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں یہ ہے جناب مودودی صاحب کے نزدیک احادیث کی حیثیت۔ لیکن اس کے باوجود ان کا شمار حدیث کے ماننے والوں میں ہے اور طلوع اسلام والے "منکرین حدیث"۔ ابھی اگلے دنوں (اخبار مسلم لیگ۔ لاہور بابت ۱۹۵۶ء) میں جناب مودودی صاحب کا ایک مقالہ بعنوان "ملت اسلامیہ کی تعمیر نو کا صحیح طریقہ" شائع ہوا ہے جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ

{فقہا، متکلمین مفسرین اور محدثین رحمہم اللہ اجمعین کے علم و فضل اور ان کی جلالت شان سے کون انکار کر سکتا ہے۔ مگر وہ انسان تھے اکتساب علم کے وہی ذرائع رکھتے تھے جو عام انسانوں کو حاصل ہیں۔ ان کے پاس وحی نہیں آتی تھی بلکہ وہ اپنی عقل و بصیرت کے ساتھ کلام اللہ و سنت رسول اللہ میں غور و فکر کرتے تھے اور جو اصول ان کے نزدیک محقق ہو جاتے تھے انہی سے وہ قوانین اور عقائد کے فروع مستنبط کر لیا کرتے تھے۔ ان کے اجتہادات ہمارے لئے مددگار اور رہنما بن سکتے ہیں۔ مگر بجائے خود اصل اور منبع نہیں بن سکتے انسان خواہ سراسر اپنی رائے سے اجتہاد کرے یا کسی اسلامی کتاب سے اکتساب علم کر کے اجتہاد کرے دونوں صورتوں میں اس کا اجتہاد ملت کے لئے دائمی قانون اور اٹل قاعدہ نہیں بن سکتا۔ کیونکہ انسانی تعقل اور علم ہمیشہ زمانہ کی قیود سے مقید ہوتا ہے۔

تمام زمانی و مکانی قیود سے آزاد اگر کوئی ہے تو وہ صرف خداوند عالم ہے جس کے پاس حقیقی علم ہے اور جس کے علم میں زمانہ کے تغیرات سے ذرہ برابر کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ اسی علم کا فیضان قرآن کی آیات اور اس کے لانے والے کے سینے میں ہوا تھا۔ وہی در حقیقت ایسا خدا اور سرچشمہ بن سکتا ہے جس سے چشمہ ہرنا

کے لوگ اپنے مخصوص حالات اور اپنی ضروریات کے لحاظ سے علوم، افکار اور قوانین اخذ کرتے رہیں۔ جب تک علماء اسلام اس اصل منبع و ماخذ سے اکتساب علم کرتے رہے۔ اس وقت تک اسلام زمانہ کے ساتھ حرکت کرتا رہا مگر جب قرآن مجید میں غور و فکر کرنا چھوڑ دیا گیا جب احادیث کی تحقیق اور چھان بین بند ہو گئی جب آنکھیں بند کر کے پچھلے مفسرین اور محدثین کی تقلید کی جانے لگی جب پچھلے فقہاء و متکلمین کے اجتہادات کو اٹل اور دائمی قانون بنا لیا گیا۔ جب کتاب و سنت سے براہ راست اکتساب علم کو ترک کر دیا گیا اور جب کتاب و سنت کے اصول کو چھوڑ کر بزرگوں کے نکالے ہوئے فروع ہی اصل بنائے گئے تو اسلام کی ترقی دفعۃً رک گئی۔ اس کا قدم آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹنے لگا۔}

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ۔

{صحیح علاج بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ جس ترتیب کو الٹ دیا گیا ہے اسے پھر سیدھا کر دیا جائے۔ قرآن کو وہی پیشوائی کا مقام دیجئے جو دراصل اس کا مقام تھا حدیث کو وہی مرتبہ دیجئے جو عہد رسالت میں خود رسول اکرمؐ اور انکے اصحابؓ و اہل بیتؑ آپ کے اقوال و اعمال کو دیتے تھے۔ فقہاء متکلمین، مفسرین اور محدثین کے کارناموں کو وہی مرتبہ دیجئے جو خود ان بزرگوں نے دیا تھا۔ ان سے فائدہ اٹھائیے۔ جن چیزوں کے بدلنے کی ضرورت نہیں ہے انھیں بدستور رہنے دیجئے مگر کبھی یہ نہ سمجھئے کہ جو کچھ وہ لکھ گئے ہیں وہ اٹل قانون ہے یا ان کی کتابوں نے ہم کو قرآن مجید میں غور و فکر اور احادیث نبویؐ کی تحقیق سے بے نیاز کر دیا ہے۔ یا ان کے بعد کتاب و سنت سے براہ راست اکتساب علم کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔}

جناب مودودی صاحب کو خود تسلیم ہے کہ احادیث کی چھان بین کا دروازہ بند نہیں ہو سکتا اور یہ کہ احادیث کو جو حیثیت مسلمانوں نے دے رکھی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ حدیث کا درجہ قرآن کے نیچے ہے۔ یعنی جو قرآن کے مطابق ہے وہ صحیح ہے جو خلاف ہے وہ غلط ہے۔ کہئے کہ بھلا طلوع اسلام اس سے زیادہ اور کیا کہتا ہے۔ وہ اتنا ہی تو کہتا ہے کہ چونکہ روایات کے متعلق یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ فی الواقعہ رسول اللہ نے ایسا ارشاد فرمایا ہے اس لئے انھیں دین میں بطور حجت پیش نہیں کیا جا سکتا۔ دین میں حجت قرآن ہے۔ ارشادات نبوی کبھی قرآن کے خلاف نہیں جا سکتے۔ یہ تھیں وہ تحریرات میں نے اپنے دوست کو دکھائی تھیں اور ساتھ ہی کہہ دیا کہ صاحب مولانا ابو الکلام صاحب آزاد کے بھی بڑے مداح ہیں اور انھوں نے روایات کے متعلق جو کچھ ترجمان القرآن میں لکھا ہے اس کے باوجود انھیں پکا اہل حدیث

جنھیں اور طلوع اسلام کو منکر حدیث ۔ کہئیے کہ اس ضد کا کیا علاج!

جہاں تک میں نے غور کیا ہے آپ کا جرم وہ نہیں جو آپ نے لکھا ہے۔ وہ جرم "(خدا نکرے کہ اسے جرم کہا جائے) تو ایسا ہے کہ جس کے مجرم متقدمین اور متاخرین میں سے بڑے بڑے اکابر نظر آتے ہیں۔ آپ کا اصلی جرم یہ ہے کہ آپ نے روایات کی صحیح حیثیت کو بالکل نکھرے ہوئے انداز میں واضح طور پر سامنے لاکر رکھدیا ہے میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ دوسروں نے (خدانکردہ) جان بوجھ کر ایسا مجمل سا انداز اختیار کیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ (جیسا کہ مولانا سندھی صاحب نے شاہ ولی اللہؒ کے مسلک دربارۂ نسخ فی القرآن کے متعلق تحریر فرمایا ہے) ان حضرات نے اپنے وقت کے اقتضاآت کے لحاظ سے اسی انداز کو مناسب سمجھا ہو۔ آپ کا جرم اتنا ہی ہے کہ اوروں نے جو باتیں اپنے مضامین کے اندر ملی جلی کہی تھیں۔ آپ نے انھیں مستقل موضوع بنا کر الگ الگ کرکے لکھدیا ہے مثلاً جناب مولانا سندھی صاحب کا مضمون (متعلقہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ) برس دن سے اوپر ہونے کو آئے جب الفرقان میں چھپا تھا۔ اسے میں نے بھی دیکھا اور میری طرح اور حضرات نے بھی اس میں انھوں نے حدیث کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے جو طلوع اسلام میں شائع ہوتا رہا ہے لیکن چونکہ انھوں نے اس چیز کو ایک دوسرے مضمون کے اندر ضمنی طور پر لکھا اس لئے وہ کسی کی نگاہ میں نہ کھٹکا۔ اور اب جو آپ نے انہی کے الفاظ کو اپنے ہاں ایک جداگانہ مضمون کی شکل دے کر شائع کیا تب معلوم ہوا کہ وہ کیا لکھ گئے ہیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ مولانا آزاد صاحب نے ایک شخص کو اپنے خط میں لکھا تھا کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے آسمان سے نزول کو نہیں مانتے۔ اس پر مولانا ثناء اللہ صاحب نے اپنے اخبار اہل حدیث میں گرفت کی کہ یہ عقیدہ احادیث کے خلاف ہے تو مولانا آزاد صاحب نے اصل مسئلہ کا تو جواب نہ دیا لیکن اپنے حامی احادیث ہونے کا دعوےٰ اتنے زور شور سے کیا کہ مولانا ثناء اللہ صاحب کو کچھ اور پوچھنے کی (شاید) جرأت رہی ہوئی۔ اسی طرح مولانا آزاد نے اپنے ترجمان القرآن میں لکھدیا ہے کہ وہ بخاری شریف کی احادیث کو سہو اور خطا سے منزہ نہیں مانتے۔ لیکن چونکہ یہ بات ضمنی طور پر کہی ہے اور اپنے معتقد احادیث ہونے کا دعوےٰ بڑی بلند آہنگی سے کرتے ہیں اس لئے انھیں کوئی منکر حدیث نہیں کہتا۔ جناب مودودی صاحب کی تحریروں کے جو اقتباسات میں نے اوپر دئے ہیں۔ ان سے یہ بات واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ احادیث کے بارے میں ان کا عقیدہ کیا ہے لیکن چونکہ وہ اپنے ہاں احادیث کی حمایت میں مضامین شائع کرتے رہتے ہیں اس لئے انھیں

کوئی منکر حدیث نہیں کہتا۔ آپ نے مولانا حمید الدین صاحب فراہی کی تصنیف مقدمہ نظام القرآن سے اقتباسات پیش کئے جن سے معلوم ہوا کہ روایات کے متعلق ان کا عقیدہ کیا تھا۔ وہ وہی عقیدہ ہے جسے آپ پیش کر رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مولانا علیہ الرحمۃ کو امام ماننے والے پکے حامیٔ حدیث سمجھے جاتے ہیں۔ اس باب میں ایک دلچسپ بات یاد آگئی مولانا علیہ الرحمۃ کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے مولانا علیہ الرحمۃ کے مقدمۂ تفسیر نظام القرآن کا اردو ترجمہ۔ رسالہ ترجمان القرآن میں شائع کیا ہے۔ آپ حیران ہونگے کہ اس میں سے وہ باب غائب ہے جس میں مولانا علیہ الرحمۃ نے احادیث کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے (اس ترجمہ کے شروع میں جناب مترجم نے یہ ضرور لکھدیا ہے کہ "جو بحثیں رسالہ کے عام قارئین کے لئے کچھ زیادہ مفید نہیں ہو سکتیں وہ ہم نے حذف کر دی ہیں"۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جہاں تفسیر کے لسانی ماخذ "جیسے علمی اور نظری مباحث تمام قارئین" کے لئے شائع کر دئے گئے وہاں احادیث سے متعلقہ باب بھی ساتھ شائع کر دیا جاتا تو اس سے کیا نقصان ہوتا!) بہرحال! میں کہہ یہ رہا تھا کہ آپ کا جرم فقط اتنا ہے کہ جس بات کو دوسرے ذرا پہلو بچا کر کہتے ہیں آپ اسے صاف صاف نکھرے ہوئے انداز میں کہہ رہے ہیں۔ اور یہ وہ جرم ہے جس پر میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ آپ نے عوام کی مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جس جرأت سے کام لیا ہے اس سے بڑا مفید نتیجہ ہمارے سامنے آ رہا ہے۔ اکثر مسلمان ایسے تھے کہ جن کی فطرت صالحہ ان چیزوں سے انکار کرتی تھی جنھیں رسول اللہ کی طرف منسوب کر کے بطور دین پیش کیا جاتا تھا وہ بچارے دونوں طرف سے مجبور تھے۔ انھیں دین مانتے تھے تو فطرت پر جبر کرتے ہیں اور نہیں مانتے تو ڈرتے ہیں کہ دین سے انکار ہو جائیگا۔ آپ نے ہمت سے کام لیا اور یہ اصول پیش کر کے کہ دین میں صحیح اور غلط کی کسوٹی قرآن کریم ہے اور رسول اللہ کی سیرت مقدسہ قرآن کی کسوٹی پر پوری اترنے کی چیز ہے۔ ایک بہت بڑی مشکل کو رفع کر دیا۔ اللہ آپ کو اس کی جزائے خیر دے"۔

{ہم اپنے اس بھائی کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انھوں نے اس محنت سے یہ مکتوب بلکہ مضمون لکھا۔ اور اللہ کی بارگاہ میں سربسجود ہیں کہ اس نے ہماری سعی و کاوش کو نوازا اور ایسے ایسے مخلص قلوب اس سے متاثر ہوئے ہم اپنے دوسرے بھائیوں میں سے کسی کی نیت پر شبہ نہیں کرنا چاہتے ہو سکتا ہے کہ وہ ابھی تک اس بات کو سمجھ نہ سکے ہوں کہ جو چیز شک و شبہ سے خالی نہ ہو اور اس کے صحیح اور غلط ہونے میں ہر وقت چھان بین کی گنجائش ہو۔ وہ دین میں حجت کے طور پر پیش نہیں کی جا سکتی۔ بہرحال ہم ایسا ہی سمجھتے ہیں اور اللہ کے اس احسان کے

شکر گذار ہیں کہ اس نے یہ توفیق عطا فرمادی کہ جس بات کو حق سمجھتے ہیں اس کے اعلان میں کوئی رکاوٹ مانع نہیں ہوسکتی
فالحمد علیٰ ذالک ۔ طلوع اسلام}

(بقیہ صفحہ ۵۰)

نظر آتی ہے کہ انھیں تو قع تھی کہ وہ مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر منتخب کرلئے جائیں گے ۔ جب ان کی بجائے سر ناظم الدین لیڈر منتخب ہوگئے تو نواب بہادر فضل الحق صاحب سے جاملے ۔ اس وقت یہ چیز قرائن سے ہی ہویدا تھی ۔ لیکن جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمٰھُمْ (مجرم تو اپنی پیشانی سے پہچانے جاتے ہیں) نواب بہادر ڈھاکہ کے انداز بتا رہے تھے کہ بات دراصل یہی ہوئی ہے ۔ چنانچہ انھوں نے ۱۴ جنوری ۱۹۴۲ء کو ایک طول طویل بیان میں اس حقیقت کا کھلے الفاظ میں اقرار کرلیا ۔ وہ کہتے ہیں ۔

"سر ناظم الدین کو اس بات کا کہ گورنر انھیں وزارت قائم کرنے کے لئے بلائیں گے اس قدر یقین تھا کہ انھوں نے مجھے کابینہ میں ایک نشست بھی پیش کردی ۔ میں نے گورنر کو لکھ دیا کہ میں سر ناظم الدین کے ماتحت کام کرنے پر کابینہ سے باہر رہنے کو ترجیح دوں گا بالخصوص اس سازش کے پیش نظر جو انھوں نے مجھے مسلم لیگ پارٹی کی لیڈر شپ سے باہر نکالنے کے سلسلے میں کی تھی حالانکہ میں مسلم لیگ کے ساتھ وفاداری اور خدمات کے بنا پر اس منصب کا جائز حقدار تھا ۔"

(اسٹیٹسمین ، ۱/۱۴)

غور فرمایا آپ نے کہ نواب بہادر صاحب نے مسلم لیگ پارٹی سے کس بنا پر تعلقات منقطع کئے! یہ ہیں ان حضرات کے ملی جوہر ۔ یہ تو واقعی اچھا ہوا کہ یہ لوگ لیگ سے باہر ہوگئے "جنس کم جہاں پاک" ایسے ہی مواقع کے لئے کہا گیا ہے ۔

بقیہ لمعات

قارئین کو یاد ہوگا کہ ہم نے طلوعِ اسلام کے سابقہ اشاعت (حصہ لمعات) میں مسلم لیگ کے (انگریزی) اخبار ڈان کے ایک مقالہ افتتاحیہ کے ایک ٹکڑے کے متعلق گذارش کیا تھا کہ اس سے قرآن کریم کے متعلق ایک غلط فہمی پیدا ہورہی ہے اور جناب مدیر ڈان سے التماس کیا تھا کہ وہ اپنے مفہوم کی وضاحت فرمادیں تاکہ رفعِ التباس ہو جائے۔ ۵ ۲ جنوری کے ڈان میں ہماری اس درخواست کے متعلق ایک شذرہ شائع ہوا ہے جسے دیکھ کر ہمیں بے حد رنج ہوا کہ ہم نے ان حضرات سے غلط توقعات کیوں وابستہ کر دیں۔

زلف آوارہ۔ گریباں چاک۔ اومستِ شباب
تیری صورت سے تجھے درد آشنا سمجھا تھا میں

لیکن نگاہوں کی یہ کتنی بھول تھی! ہمیں افسوس ہوا!

میری اس سادگی پر رحم کھانا کہ تم سے آرزوئے دل بیاں کی

ہم قارئین طلوعِ اسلام سے درخواست کریں گے کہ وہ موقر جریدۂ ڈان کے اس شذرہ کو ملاحظہ فرمائیں اور پھر خود ہی فیصلہ کریں کہ ہم نے جو کچھ لکھا تھا اس میں کونسی بات ایسی تھی جس پر یوں لال پیلے ہو جانے کی ضرورت پڑ گئی ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اس قدر چھوئی موئی بن جانے سے حقائق کی دنیا میں کام کیسے چلے گا! لیکن انسان کی بھی عجیب حالت ہے۔ ہر شخص زبان سے اقرار کرتا ہے کہ وہ غلطی کر سکتا ہے لیکن جونہی کسی کو اس کی غلطی پر متنبہ کیجئے۔ فوراً بگڑ جاتا ہے۔

ہمیں اپنے احباب کی اس روش پر افسوس ضرور ہوا لیکن غصہ نہیں آیا۔ اور غصہ آ بھی کیسے سکتا ہے وہ جس نام کا سہارا لیکر اٹھے ہیں وہ ہماری زندگی کی عزیز ترین متاع ہے۔ اس لئے جسے اس نام سے نسبت ہو اس پر خفگی کیسی؟

متاعِ قافلہ تا جا زیاں بردند ولے زباں نکشائی کہ یار یاعربی است

(۶)

کاغذ کی گرانی اور کمیابی یہاں تک (۱) اب اس حد تک جا پہنچی ہے جہاں ہم مجبور ہیں تا چار رکنا پڑا ہے۔ اب اخباروں کی گراں باری رسالہ کے لئے ناقابل برداشت ہورہی ہے اور ہم حیران ہیں کہ اس باب میں کیا کیا جائے اس

مسئلہ کا تفصیل کرنا بے سود ہے کہ اس میں نقل کرنے کے قابل کچھ ہے نہیں۔

میں ایک گوشہ ایسا ہے جس میں آپ بھی ہماری معاونت کر سکتے ہیں طلوع اسلام نے جس قدر لٹریچر آج تک
شائع کیا ہے اس کی تفصیل کا آپ کو علم ہے۔ جب کاغذ کی گرانی کا یہ عالم نہ تھا تو ہزاروں کی تعداد میں پمفلٹ
اور سینکڑوں کی تعداد میں رسالہ ہر ماہ مفت تقسیم کیا جاتا تھا اور یہ سلسلہ کوئی ایک دو دن نہیں برسوں تک جاری
رہا۔ اس لٹریچر میں سے کچھ حصہ ابھی تک دفتر میں موجود ہے۔ نیز طلوع اسلام کے پرانے پرچے بھی موجود ہیں۔
آپ انہیں مفید سمجھتے ہوں تو یہ وقت ہے کہ آپ ان کی اشاعت میں ہمارا ہاتھ بٹائیں ہم نے اس لٹریچر
قیمت میں کوئی اضافہ نہیں کیا پمفلٹس اور پرانے پرچوں کی تفصیل درج ذیل ہے یہ قیمتیں علاوہ محصول ڈاک ہیں
پمفلٹس۔ وارد ھاکی تعلیمی اسکیم اور مسلمان ۲ر اسلامی معاشرت ۴ر متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد صاحب
سوراجی اسلام ۲ر اسلام اور مذہبی رواداری ۲ر مسلمان کی زندگی ۲ر جہان نو ۴ر شخصیت پرستی
علم حدیث ۲ر جہانِ نو یعنی پاکستانی اسکیم قرآن کی روشنی میں ۴ر خدا کی بادشاہت ۴ر زبان کا مسئلہ ۲
طلوع اسلام کا پہلا پرچہ نومبر ۱۹۳۸ء سے شائع ہوا تھا۔ اس وقت سے آج تک کے تمام پرچے (باستثنا
حسب ذیل) موجود ہیں اور فی پرچہ ۴ر کی قیمت کے حساب سے دئے جا سکتے ہیں۔ ر بیہ فی پرچہ محصول ڈاک۔
یہ پرچے نہیں ہیں۔ جون۔ جولائی۔ اگست۔ ستمبر ۱۹۳۸ء۔ جنوری ۲۹ء۔ مارچ ۱۹۴۲ء
یہ پرچے منگا لیں کہ شاید اس کے بعد یہ مجلدات کسی قیمت پر بھی نہ مل سکیں۔

---

(۷)

معارف القرآن کو جو مقبولیت اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے اس پر ہم جناب مؤلف کی خدمت میں مبارکباد
پیش کرتے ہیں۔ فی الحقیقت یہ اللہ کا فضل ہے جسے وہ عنایت فرما دے۔ شمس العلماء علامہ سید محب الحق مد ظلہ
قبلہ کے دو مکتوبات گرامی آپ کی نظروں سے گذر چکے ہیں۔ وہ اپنے تیسرے گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں
"کسی کتاب کو ایک دفعہ پڑھ جانے سے اس کی حقیقت نہیں کھلتی نہ مصنف کی دماغ سوزی
کی حد تک رسائی ہوتی ہے۔ پہلا پڑھنا تو ایسا سرسری ہوتا ہے کہ اس میں ہے کیا۔ یہ تجربہ
ہے کہ کتاب کو دوبارہ پڑھنا چاہیئے اس لئے میں نے معارف القرآن کو دوبارہ دیکھنا شروع
کیا ہے اور بہ توجہ پڑھ رہا ہوں۔ خدا آپ کی محنت۔ دماغ سوزی اور اخلاص اور قرآن کی
اس خدمت کو قبول کرے۔"

معارف القرآن کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں ایک عجیب چیز ہمارے سامنے آئی۔ سرحد کے متعلق عام طور پر ذہنوں میں تصور کچھ ایسا ہے کہ وہ بڑا اجڈ سا علاقہ ہے۔ وہاں کی زندگی سپاہیانہ ہے علمی کارناموں سے وہاں زیادہ دلچسپی نہیں ہو سکتی لیکن آپ یہ سنکر حیران ہونگے کہ اس وقت تک معارف القرآن کی قریب اسّی فیصدی نکاس سرحد میں ہوئی ہے۔ لوگوں کی حالت یہ ہے کہ بیچاروں کے پاس کتاب کے دام موجود نہیں ......

...... پیسہ پیسہ کر کے جمع کرتے ہیں اور خط پر خط لکھے جاتے ہیں کہ خدا کے لئے ہمارے واسطے کتاب کا نسخہ محفوظ کر کے رکھ لیجئے ایسا نہ ہو کہ جب تک ہم قیمت جمع کریں۔ کتاب ختم ہو جائے۔ اس کتاب کے متعلق یہ اس قدر اشتیاق کیوں ہے؟ اس کی وجہ ان خطوط سے معلوم ہو رہی ہے جو وہاں سے موصول ہو رہے ہیں۔ ان میں لکھا ہوتا ہے کہ یہ کتاب ہمارے اندر عمل کی نئی روح پھونک رہی ہے اور جن قرآنی مسائل کو ہم آج تک نظری چیزیں سمجھتے تھے۔ ان کے متعلق اب معلوم ہوا کہ وہ تو یکسر عملی چیزیں ہیں۔ اس کتاب نے ہمارے سامنے قرآن کریم کے متعلق زندگی کا ایک نیا دروازہ کھول دیا ہے!

یہ غالباً اس لئے کہ ابھی ان لوگوں میں زندگی کی کچھ حرارت موجود ہے اور قرآن کریم کے پیام حیات پرور سے "زندگی" کے مطابق ہی فائدہ کیا جا سکتا ہے ان هو الا ذكر و قرآن مبين ○ لينذر من كان حيا ‎(٣٦ : ٦٩-٧٠)‎ (یہ پیغام خداوندی) تو ایک یاد دہانی ہے اور واضح قرآن۔ تاکہ یہ اسے جو زندہ ہے (اعمال حیات کے نتائج سے) آگاہ کر دے۔ قرآن کریم سے فی الواقعہ وہی قوم فائدہ حاصل کر سکتی ہے۔ جو زندہ ہے مردوں کی بستی میں اس سے زیادہ سے زیادہ آنہاہی کا کام لیا جا سکتا ہے۔

کر از لیسین او آسان بمیری

(۸)

شروع شروع میں جب پاکستان کا چرچہ ہوا ہے تو حسب معمول قومیت پرست حضرات کی طرف سے اس کے خلاف بہت کچھ زہر اگلا گیا۔ اس اسکیم کے خلاف جو اعتراضات عام طور پر وارد کئے جاتے تھے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے اسے پاکستان کی چار دیواری میں بند کر دینا کہاں کی دانش اطواری ہے۔ یہ اعتراض جہالت اور طفلانہ پن کا ایسا مضحکہ انگیز مظاہرہ تھا کہ جس سنجیدہ محفل میں پہونچا خفیف سی ہنسی سے اس کا استقبال ہوا اور رفتہ رفتہ یہ اپنی موت آپ مرگیا لیکن آپ یہ سنکر حیران ہونگے کہ اس گڑے مردے کو پھر سے اکھاڑا گیا۔ اور اس مرتبہ اس اعتراض کو پیش کرنے والے ایک کیگ

صاحب ہیں جن کی متانت اور سنجیدگی کا علمی حلقہ میں عام طور پر احترام کیا جاتا ہے۔ جامعہ ملیہ دہلی کے پرنسپل۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب جب پچھلے دنوں کراچی تشریف لے گئے تھے تو ان سے کچھ سوالات کئے گئے جن میں سے ایک سوال اور اس کا جواب درج ذیل ہے۔

سوال۔ پاکستان کے متعلق ایک قوم پرست کی حیثیت سے آپ کے نظریے کیا ہیں؟

جواب۔ اس سوال کا جواب میں ایک قوم پرست کی حیثیت سے نہیں دینا چاہتا۔ میں ایک مسلمان ہوں اور اسلام میرے لئے شمع ہدایت ہے۔ اس وقت ایسے صوبے موجود ہیں جن میں مسلمانوں کی آبادی ۵۰ فیصدی ہے اور جن میں کم یا زیادہ مکمل سیاسی اقتدار حاصل ہے لیکن وہاں بھی وہ کیفیت نہیں پائی جاتی جو ایک تمثیلی مسلم اسٹیٹ میں ہونی چاہیئے۔ اگر مطلوبہ پاکستان کو مسلم وطن بنا بھی لیا جائے تب بھی اس سے کیا بہتر فرق ہو سکتا ہے جبکہ وہاں مسلم آبادی محض ۲۰ فیصدی ہی رہے گی؟ اسلام ایک عالمگیر مشن ہے اور اسے پاکستان جیسے تنگ رقبے میں مقید و محبوس کرنا مناسب نہیں ہے۔ سوسائٹی ایک تنظیم ہے جس کے تمام افراد کو ایک دوسرے پر اثر اور باز اثر ڈالنا چاہیئے۔ (انصاری $\frac{1}{42}$ ۲)

ہمیں نہ اس کی کوئی شکایت ہے نہ اس پر تعجب کہ ڈاکٹر صاحب پاکستان کی اسکیم کے مخالف کیوں ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر ہمیں فی الواقعہ افسوس ہوا کہ وہ اب ایسی عام سطح پر آ چکے ہیں۔ سر دست اس مسئلہ کو تو چھوڑیئے کہ پاکستان کے نظامِ حکومت اور مسلم اکثریت کے صوبوں میں موجودہ سیاسی اقتدار میں کیا بنیادی فرق ہے۔ اس اعتراض کو لیجئے جس کی [illegible] سطحیت کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے یعنی ان حضرات کے نزدیک پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو گھیر کر پاکستان [illegible] کے اندر بند کر دیا جائے گا۔ پھر اس کے بعد پاکستان کے گرداگرد ہمالیہ پہاڑ جتنی اونچی دیواریں کھڑی کر دی جائیں گی اور اس قلعہ بندی کے باہر بڑی بڑی گہری خندقیں کھود کر ان میں شعلہ فشاں آگ روشن کر دی جائے گی۔ چاروں طرف پہرہ بٹھلا دیا جائے گا کہ اس "محبس پاکستان" سے نہ کوئی مسلمان باہر آ سکے نہ باہر کا آدمی اندر جا سکے۔ اور اس طرح ایک دوسرے پر اثر انداز نہ ہو سکے! یہ ہے کھلے الفاظ میں اس اعتراض کا مفہوم۔ غور فرمائیے اس اعتراض کا کیا جواب دیا جائے! اس سے تو کہیں اچھا تھا کہ ڈاکٹر صاحب صاف صاف کہہ دیتے کہ بحیثیت قوم پرست اس اسکیم کی تائید نہیں کر سکتا۔ اس سے آپ کے علمی وقار کی ہنسی تو نہ اڑتی لیکن ہمارے مسلم قوم پرست حضرات کی سب سے بڑی مشکل تو یہی ہے کہ انہیں کہنا وہی کچھ پڑتا ہے جو گاندھی جی کہتے ہیں لیکن یہ بتانا پڑتا ہے کہ یہ عین اسلام کی تعلیم ہے اس روش کو نبھانے کے لئے پھر جو کچھ انہیں کرنا پڑتا ہے اس کے مظاہرے آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔

صد بچے اور غلاموں کی موت مرے۔ یہ ہے ان حضرات کے نزدیک اسلام! ناطقہ سربگریباں کہ اسے کیا کہیئے!

دورِ حاضرہ کی عظیم الشّان کتاب

"معارف القرآن"

(از جناب چودھری غلام احمدؐ صاحب پرویز مدظلہٗ)

یعنی حقائق قرآنی کا دائرۃ المعارف۔ جو اس اصول پر مرتب کیا گیا ہے کہ قرآن اپنی تفسیر آپ کرتا ہے اور تکمیل شرف انسانیت کے لئے مکمّل اور واحد ضابطہ حیات ہے۔

اس کی ترتیب

کے متعلق یوں سمجھئے کہ قرآن کریم سے متعلق کوئی مسئلہ آپ کے ذہن میں آئے۔ پوری کی پوری قرآنی تعلیم۔ ایک دلکش۔ مربوط مضمون کی صورت میں آپ کے سامنے ہو۔

جلد اوّل

شائع ہو چکی ہے۔ بڑی تقطیع ۲۹×۲۲ کے ۵۷۶ صفحات پر مشتمل۔ کاغذ۔ کتابت۔ طباعت جلد اعلیٰ درجہ کی قیمت

بلا جلد ———— پانچ روپیہ ۵/ ———— محصول ڈاک ۱۳/

مجلد ———— ساڑھے چھ روپیہ ———— محصول ڈاک عہ/

کتاب کا مقدمہ علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہٗ کے تبحرِ علمی کا آئینہ دار ہے جس میں علم تفسیر پر بالخصوص محققانہ بحث کی گئی ہے۔

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام دہلی

معاملہ کی ضروری باتیں

(۱) طلوع اسلام ہر انگریزی مہینے کی ۷ کو التزاماً شائع ہوجاتا ہے اور نہایت احتیاط سے حوالہ ڈاک کیا جاتا

(۲) رسالہ موصول نہ ہونے کی اطلاع زیادہ سے زیادہ دس تاریخ تک دیجئے۔ ورنہ بعد میں شاید پرچہ موجود نہ ہو اور اگر ہو بھی ہوگا تو بلا قیمت نہ مل سکے گا۔

(۳) تبدیلی پتہ کی اطلاع ۲۵ تاریخ سے پہلے پہلے آنی چاہیئے۔

(۴) جس ماہ کی خریداری کا چندہ ختم ہوجاتا ہے اس مہینہ کے پرچہ کے اندر ایک اطلاع جوابی کارڈ رکھ دیا جاتا ہے جواب ایک ہفتہ کے اندر اندر آجانا چاہیئے۔

(۵) چندہ سالانہ پانچ روپیہ معہ محصول ڈاک ہے۔ قیمت فی پرچہ ۸؍ چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجنے میں خریدار کو کفایت منتظمین کو سہولت رہتی ہے۔

(۶) ہر رقم موصولہ (خواہ کسی ذریعہ سے موصول ہو) کی ایک رسید بھیجی جاتی ہے۔

(۷) وی۔ پی طلب کرنے کے بعد اسے وصول نہ کرنا ادارہ کو بلا جرم سزا دینے کے مرادف ہے۔

(۸) منی آرڈر کرتے وقت اپنا پتہ پورا اور صاف لکھیے نیز رقم کی تفصیل بھی درج فرمائیے۔

(۹) آپ اپنا تعارف نمبر خریداری کے ذریعہ سے ہی کرا سکتے ہیں اس لئے اس نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولئے ورنہ بے حد دقت اور آپ کو ناواجب شکایت ہوگی۔

(۱۰) نمبر خریداری یاد نہیں رہا کرتا کہیں نوٹ کر چھوڑیئے۔

(۱۱) "طلوع اسلام" کوئی تجارتی ادارہ نہیں۔ بلکہ ملت اسلامیہ کے اجتماعی مقاصد کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے اس لئے اس سے اشتراک عمل اور معاونت ایک ملی خدمت ہے۔

(۱۲) خوش معاملگی کی استواری کی بنیاد یہ ہے کہ فریقین ہر وقت خدا کو اپنے درمیان رکھیں۔ واللّٰہ المستعان

(۱۳) نمونہ کے پرچہ کے لئے ۸ کے ٹکٹ آنے ضروری ہیں۔

تازہ پرچے کی قیمت ۸؍

ناظم:-

ادارہ طلوع اسلام دہلی

Printed at the Jayyed Press, Delhi.
Published by Z. A. K. from Tulue Islam Office Delhi.